بھیگی ہوئی رُت میں
صالحہ محمود

فہرست

ہردے کا اقرار	۹
وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا	۴۵
گوری کرت سنگھار	۹۱
بلیوں اچھی	۱۰۸
خوابوں کے انبار تلے	۱۳۱
رمز شناسائی کی رات	۱۶۹
بھیگی ہوئی رت میں	۱۸۳
پھول اور خوشبو رنگ حنا کے	۲۱۸
رتوں سے محروم	۲۶۶
مہندی کے سب رنگ تیرے سجنا	۲۸۶

مٹی کے ذرے نے میری تکمیل کی اور یوں میں مٹی سے ہم آہنگ ہوئی۔ بلاشبہ اس کائنات میں میرے لئے مٹی کے وہ جلوے اجاگر ہوئے جن سے میں پور پور مہک اٹھی۔

''سارا تن کھل اٹھا۔ جسم کو ڈھانپنے کے لئے خوبصورت کپاس زیب تن بنی۔ اس مٹی سے میں نے مانگ بھری۔ گجرے ہاتھوں میں پہنے۔ مٹی کے تن سے ہیرے جواہرات نے مجھے کھنکتی ہوئی رنگین چوڑیاں دیں۔ میں سارا سارا دن گھر کے آنگن میں درختوں کے سائے میں بیٹھی لکھتی رہتی۔

مٹی کے تن پر سجے ہوئے پھول چنتی اور پھل دار درختوں کی ٹہنیاں گنتی۔ پیاس لگتی تو دریا اور آبشاروں نے پیاس بجھا دی۔ اب بھلا جس آنگن میں مٹی نے سایہ دار درخت اگائے ہوں۔ بھلا کب دل چاہے گا کہ میں دہلیز سے باہر پاؤں دھروں؟ من چاہے کہ آنکھ بند کر کے میں خوبصورت مٹی کا کوئی رنگ، کوئی روپ دھار لوں۔ اور پھر تن من دونوں شانت پر روح کے اندر مٹی کے سو رنگ جن کا اوحار۔ من کی بات کیا کروں؟ موسم رنگ اور رت سب ہی جیون کے ہار لگیں۔

بارش مٹی میں گرے تو اکھوے اگاوے۔ بس رت موسم کی تھی کہ ہم نے بھری بہاروں میں اپنا سفر باندھ لیا۔ پاؤں میں بھنور پڑ گئے۔

کبھی میں نے خودنمائی کی پکار پر کان نہ دھرے۔ بس جو رب نے دیا اتنا دیا کہ محبت کی سرشاری سے مالا مال ہوں۔ اپنے نفس کی نفی پر میں نے مڑ کر بھی پیچھے نہیں دیکھا۔ جو ہوا سو ہو گیا۔ پر دل کی اس نرم مٹی کو میں ریت نہ بنا سکی جس پر لفظوں کے نقش بہت نازک تھے۔ لکھنے کا سلسلہ تھا۔ جو مجھے، دیار غیر میں بھی اپنے وطن کی مٹی سے رمز شناسائی کے وہ لمحے میسر کرتا رہا کہ بس مجھے لکھتے رہنا ہے اور کچھ نہیں۔

شاید اسی جنون عشق نے مجھے اتنا معتبر کر دیا کہ نفس کی نفی جس پر میں نے کبھی دکھ اور ملال کا شائبہ تک محسوس نہیں کیا۔

شاید قدرت کو صبر و قناعت کی ادا بھا گئی۔ تب ہی اس نے میری اوقات سے زیادہ مجھے لوٹا دیا، وہی محبتیں، ہنگامے، چاہت بھرے خطوط، روا، کے قارئین کی طرف سے جو مجھے ملتے ہیں، سو میں اپنے افسانے جو مجھے مل سکے یکجا کر کے انہیں دے رہی ہوں۔ ہر کردار میں ہماری مشرقی لڑکی کسی نہ کسی روپ میں بڑے عزم و حوصلے سے زندہ ہے۔ اس دعا کے ساتھ کہ یہ عزم و ہمت، ایمان و محبت ہمیں معتبر بنانے والوں کو بھی نصیب ٹھہرے۔

صالحہ محمود

بلال جعفری کے نام

پھر کیسا قرار؟

جون کا آخری ہفتہ چل رہا تھا اور شدید گرمی تھی۔ باہر صحن میں کبوتروں کی غٹرغوں غٹرغوں کی آواز سن کر وہ کمرے سے آ گئی۔ نظر پڑی تو کونڈی خالی پڑی تھی۔ صحن میں رکھے ہوئے ڈرم سے اس نے جگ بھر کر پانی کونڈی میں ڈال دیا۔ پیاسے کبوتر چونچ ڈال کر پانی پینے لگے۔

”ہائے اللہ یہ چند ماہ کا پودا بے سوکھ جائے گا۔“ جلدی سے وہ دوسرا جگ بھر لائی

”آخر ایسا کیا ہو گیا ہے بڑے ابا کمرے سے باہر نہیں آ رہے؟“ اس نے بھوکے پیاسے کبوتروں کو دیکھا اور صحن سے وہ برآمدے میں آ گئی۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے وہ بڑے ابا کے کمرے میں جانے کے ارادے سے اندر آئی لیکن بڑے ابا کمرے میں نہیں تھے۔

”کیا ہوا بڑی اماں بڑے ابا کہاں گئے ہیں؟“ وہ چاروں طرف دیکھ کر پوچھنے لگی۔ بڑی اماں خاموش تھیں، اسے فکر ہوئی۔

”بولئے ناں بڑے ابا کہاں گئے ہیں؟“ وہ فکرمندی کے انداز میں پلنگ پر بیٹھ گئی۔ سحاب اور رانی بھی اسی کمرے میں موجود تھیں۔

”ابا ناراض ہو کر کہیں چلے گئے ہیں“ سحاب نے اپنے چہرے کو آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”لیکن کیوں؟“ وہ ابھی تک بڑے ابا کے گھر چھوڑ کر چلے جانے سے لاعلم تھی۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں بڑی اماں کے پاس اس کا جواب نہیں تھا۔

”بھئی صر جہانی کی پسند سے ہم نے کوئی اور لڑکی دیکھ لی ہے ابا تمہارے سوا کسی اور کا نام سننا نہیں چاہتے بس جب سے اماں نے ہاں کی ہے ابا چپ چپ رہنے لگے ہیں اور کل سے گھر نہیں آئے“ رانی نے ساری وجہ بیان کر دی۔

بات اتنی مشکل بھی نہ تھی اشاروں میں تو کئی مرتبہ بڑی اماں اسے بتا چکی تھیں وہی نظرانداز کر دیتی تھی۔ آج بات کھل کر ہوئی تو اسے جواب بنانا ہی پڑ گیا۔

''اگر ناصر کو کوئی لڑکی پسند آ گئی ہے تو بڑے ابا کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔''

''ساری مشکل تو یہی ہے کہ تمہارے بڑے ابا یہ بات سمجھتے نہیں ہیں'' اس کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔

''تو بڑے ابا ہماری وجہ سے گھر چھوڑ کر گئے ہیں'' اس کا سر چکرانے لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس گھر میں بڑے ابا کے جانے سے کسی کو کوئی دکھ نہیں۔ سادہ سے چہروں کو پڑھتی رہی لیکن ہر چہرہ کھلی کتاب تھا۔

''لیکن بڑے ابا ہیں کہاں؟'' وہ گھبرا کر پوچھ بیٹھی۔

''سوائے مسجد کے وہ کہاں جائیں گے؟'' بڑی اماں کی آواز میں ایسا طنز تھا کہ وہ ٹوٹ گئی اور خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر چلی آئی۔ صحن میں رک کر وہ کبوتروں کو چاول کی کنکی ڈالنے لگی۔

''شاید میں بھی تمہاری طرح ایک اڑتا ہوا پرندہ ہوں کبھی اس کابک سے اس کابک میں اور کبھی آسمانوں پہ اڑتی رہتی ہوں جس نے جو دیا کھا لیا لیکن تم آزاد ہو میں آزاد نہیں ہوں، انسان ہوں لیکن پر کترے ہوئے ہیں ایسی بے بسی کہ تم کیا جانو کیسی من دھرتی پیاسی ہے کیسا تن جھلسا ہے نہ آنکھ رودے نہ من ہنسے جب سب ہنستے تھے تو مجھے ہنسنا پڑتا تھا جب سب روتے تھے تو مجھے بھی رونا پڑتا تھا۔ پھر آنکھ کے رنگ اور تن کے زخم تم کیا جانو۔ چھ ماہ میں بڑے ابا کے پاس رہتی ہوں تو چچی جان کی یاد آ رہی ہے کہہ کر میں خود ہی اس گھر سے چلی جاتی ہوں پھر، وہاں رہتی ہوں تو چچی جان سے کہتی ہوں کہ کتنے دن ہو گئے مجھے پھوپھی جان یاد آ رہی ہیں، کہہ کر آ جاتی ہوں بس زندگی کا یہ سفر نہ جانے کب سے ہے اور کب تک رہے گا ابا نہ رہے تو اماں نے ان کی یاد میں رو رو کر جان دے دی۔ بس رشتے ناتوں کی چوکھٹ پر مجھے چھوڑ گئے۔'' کوئی کبوتر پھڑ پھڑایا تو وہ چونک گئی یوں لگا گویا کسی نے پر کتر کر زمین پر پھینک دیا ہو اور وہ بغیر پروں کی چڑیا ہو۔

''آؤ دیکھو تم بھی یہ تصویریں۔'' سحاب نے افشاں کی تصویریں بیڈ پر بکھیر دیں۔ وہ ایک ایک تصویر کو بہت ستائشی نظر سے دیکھ رہی تھی لیکن اس نے محسوس کیا کہ وہ تصویریں دیکھ رہی ہے لیکن بڑی اماں اور سب ہی اسے دیکھ رہے ہیں۔

''ارے ہاں یہ میں بتانا بھول گئی کہ تمہاری دادی جان بیمار ہیں۔''

''کیا ہوا دادی جان کو؟'' وہ بڑی اماں سے مخاطب ہوئی۔

''کچھ نہیں تمہیں یاد کر رہی تھیں'' ان کا لہجہ محبت میں ڈوب گیا۔

''میں کل اسکول سے وہیں چلی جاؤں گی۔'' وہ سارے بھید جان گئی تھی کہ اب یہاں زیادہ دن رکنا بہت

مشکل ہے۔

''اب ایسی بھی کیا جلدی ہے کل تو ناصر کے سسرال والے آ رہے ہیں تم رک جاؤ۔'' بڑی اماں دکھ دے کر مرہم رکھ رہی تھیں۔

''لیکن بڑی اماں وہ......'' کہتے کہتے وہ رک گئی تھی۔

''وہ کیا؟'' بڑی اماں بے قرار ہو گئیں۔

''بڑی اماں! آپ کبوتروں کا دھیان رکھئے گا بڑے ابا نہیں ہیں آج بھی ساری دوپہر وہ پیاسے رہے''۔ اس کے اپنے ہونٹ خشک ہو گئے رات دیر تک وہ اپنے کپڑے بیگ میں رکھتی رہی کچھ کتابیں تھیں، جو اس نے اٹیچی میں بند کر دیں۔

''تو کیا تم یہ سارا سامان اسکول لے کر جاؤ گی؟ اور پھر دادی جان دیکھیں گی تو کیا سوچیں گی؟ تم اسکول سے گھر آ جانا نگریز کو بلوا لوں گی یوں اکیلے جانا اچھا نہیں لگتا۔'' بڑی اماں کو عزت کا خیال آ گیا۔

''یہ میں بعد میں منگوا لوں گی'' اس نے اٹیچی ایک طرف رکھ دی۔

''تمہاری مرضی لیکن دیکھو دادی جان سے تم کوئی ایسی ویسی بات مت کرنا۔''

''کیسی باتیں کرتی ہیں بڑی اماں آپ؟ اتنے دن رہ تو لی اب دادی اور چچی یاد آ رہی ہیں'' اس نے بیگ بند کر دیا۔

''چلو تمہاری مرضی ورنہ دل تو نہیں چاہ رہا کہ تم جاؤ۔'' سحاب اپنے ڈرامے کا ڈائیلاگ رٹتے رٹتے مخاطب ہوئی تھی۔ واقعی بڑی اماں بھی اداس لگ رہی تھیں اس نے محسوس کیا کہ اس کے جانے سے سب ہی مطمئن ہوئے ہیں پھر بھلا کیا دیر کرنی تھی۔

رات دیر تک جاگتی رہی نیند کوسوں دور تھی۔ واپسی کا سفر مشکل لگ رہا تھا۔

''یہاں بڑے ابا کے کاموں میں لگی رہتی تھی تو وقت کا اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا سارے کام ان کے بل ہی ذکرتی تھی۔ دیکھو کیسی خاموشی ہے ان کے بغیر ہر طرف اداسی ہے یہ جگہ کتنی اجنبی لگ رہی ہے پتہ نہیں کل جب میں نہیں لوٹوں گی تو کبوتروں کو دانا کون ڈالے گا؟ اگر کونڈی پھر سوکھ گئی تو درخت بھی سوکھ جائے گا اور اگر کل شام تک بڑے ابا گھر نہ آئے تو رات بلی کبوتروں کا شکار کر لے گی۔ ساری کابکوں کو کون بند کرے گا؟'' آنسو تواتر سے بہنے لگے۔

صبح جب وہ اٹھی تو بہت تھکی تھکی سی تھی۔ چائے کا پانی رکھ کر وہ غسل خانے میں چلی گئی، بڑے ابا آج رات بھی مسجد میں سو گئے تھے گھر نہیں آئے تھے یوں تو اکثر بڑی اماں سے جھگڑنے کے بعد وہ مسجد ہی میں دن گزارتے تھے لیکن شام ہوتے ہی وہ پرندوں کی وجہ سے لوٹ آتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ اگر وہ رات گھر نہیں آئے تو کبوتروں کی کابکوں کو کوئی بند نہیں کرے گا۔ بڑے ابا کی کمزوری ان کے کبوتر تھے اس کی موجودگی کی وجہ سے وہ دو رات مسجد میں ہی گزار گئے۔

"بڑی اماں!" وہ اپنا بیگ اٹھائے کھڑی تھی، کل سے زیادہ وہ آج اس گھر میں اجنبی سی لگ رہی تھی پل دو پل کی مہمان کہاں ہر لمحہ اس گھر میں وہ اس خیال سے سانس لیتی تھی کہ اسے اس گھر کی چھت تلے رہنا ہے لیکن اتنے پرانے بندھن کو کس خوبصورتی سے بڑی اماں نے توڑ ڈالا کہ سب کچھ اجنبی سا ہو گیا بڑی اماں اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"ادھر آ میری بچی دم کر دوں۔" وہ اس کی طرف جھکیں۔ آیت الکرسی پڑھ کر بڑی اماں نے اس پر پھونک دیا۔

"اچھا بڑی اماں خدا حافظ" اس لمحے آنکھیں سرخ ہو گئیں لیکن وہ اپنا چہرہ دوسری طرف کر کے صحن میں نکل آئی۔ چھوٹے بڑے اس کے ہاتھ کے لگائے پودوں پر چڑیاں پھدک رہی تھیں کابکیں بند پڑی تھیں گھر کی ڈیوڑھی پار کر کے جب اس نے باہر قدم رکھا تو مڑ کر ایک بار اس نے پھر دیکھا آنکھیں سرخ ہو گئیں۔

"خدا حافظ" اپنے آپ سے کہہ کر وہ گلی میں مڑ گئی۔

"شبو بڑے ابا کو مسجد میں جا کر کہہ دینا کہ باجی دادی کے گھر چلی گئی ہیں آپ گھر آ جائیں۔" راستے میں وہ محلے کی خالہ کے گھر خبر دیتی چلی گئی۔

"باجی دادی جان کے گھر چلی گئی ہیں۔" شبو نے یہ خبر ظہر کی نماز کے بعد دی تھی۔ بڑے ابا گھر دوڑے چلے آئے۔ کونڈی کا سارا پانی دھوپ میں خشک ہو گیا تھا۔

"دیکھا کسی کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ تھوڑا پانی ہی بھر دے" بڑے ابا نے جلدی سے جگ بھر کر پانی ڈالا

"اچھا ہوا وہ غریب ہماری غیر موجودگی میں گئی ورنہ اس کا جانا ممکن نہ تھا" بڑے ابا کا دل دکھی ہو رہا تھا۔

"ملا کی دوڑ مسجد تک، آ گئے آخر مل گئی اطلاع۔" بڑی اماں طنز کرنے لگیں۔ کبوتروں کی غٹرغوں میں

بڑے ابا سب کچھ بھول گئے تھے لیکن دل اندر سے سسک رہا تھا۔ انہیں یوں لگ رہا تھا کہ وہ ریٹائر ہونے کے بعد صرف ایک کبوتر ہیں جسے جب چاہیں گی رئیسہ بیگم کابک میں بند کر دیں گی۔ ماں اور باپ کی نوک جھونک میں بچیوں کو بھی خوب بولنا آ گیا تھا کبھی اماں کی طرف داری کرتیں تو کبھی ابا کی لاڈلی بن جاتیں لیکن آج سب ماں کی طرف دار تھیں۔

"امی آپ فکر ہی نہ کریں ہم پورے گھر کو نئی طرح سے ڈیکوریٹ کریں گے" عاصمہ لہک کر بولی تھی۔

"کیا خاک کرو گی؟ پورے گھر میں تو کبوتر اڑتے پھر رہے ہیں" اماں نے ناگواری سے ناک سکیڑی

"آپ دیکھیں تو سہی میں شام سے پہلے ڈربے میں بند کر کے فرش کی دھلائی کروں گی بس ذرا سحاب ہاتھ بٹا لے" عاصمہ نے بہن کی طرف دیکھا۔

"جی نہیں مجھے یہ ڈائیلاگ یاد کرنے ہیں کل ریہرسل ہے ڈرامے کی، آخری ریہرسل، رانی کو لگا لینا۔"

"جی نہیں مجھے تو دو بجے پارلر جانا ہے ہاں جلدی آ جاؤں گی" رانی نے صاف انکار کر دیا۔

"تو کیا میں سارا کام اکیلے کروں گی؟" وہ روہانسی ہو گئی۔

اماں شام کے لئے ابھی سے فکر مند تھیں ان کے لئے ویسے ہی لوازمات تیار کرنے تھے گھر میں بارہ بجے سے ہی اکھاڑ پچھاڑ شروع ہو گئی تھی تکیہ کے غلاف سے لے کر پودوں تک صفائی جاری تھی۔ بڑے ابا چپ چاپ سے بغیر کچھ کھائے پیئے کمرے میں لیٹ گئے۔

"بجیا آ گئیں" خرم زور زور سے چلا رہا تھا۔ دادی جان نے گھبرا کر آنکھ کھول دی۔ وہ بس کھانا کھا کر اونگھ گئی تھیں۔

"بجیا آ گئیں" فرح دوڑی۔ وہ چھوٹے چھوٹے کئی شاپنگ بیگ اٹھائے دادی کے کمرے میں چلی آئی۔

"سائرہ بیٹی!" دادی جان اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"اتنی دوپہر میں اور اکیلے؟" وہ حیران سی ہو رہی تھیں۔

"دادی جان جب یاد آ جائے تو دوپہر کیا، انگاروں پر چل کر آ سکتی ہوں۔" اس نے سر جھکایا تو دادی جان نے اس کے نصیب کھلنے کی ڈھیروں دعائیں دیں۔ وہ ہنسنے لگی تو چچی آ گئیں وہ اٹھ کر سلام کر کے دوبارہ بیٹھ گئی۔

''پتا ہے کیا دادی جان! ہماری ساتھی ایک نیچر شاپنگ کرنے جا رہی تھیں میں بھی چلی گئی اس نے اپنی امی اور بہنوں کے لئے کچھ چیزیں خریدیں تو میں نے بھی یہ چیزیں خرید لیں۔'' اس نے شاپنگ بیگ سے ساری چیزیں الٹ دیں۔

''یہ رہا تمہارے لئے'' اس نے سیل والا جہاز خرم کو تھما دیا

''فرح اور چچی یہ سوٹ پیس۔''

''ارے اس کی کیا ضرورت تھی؟''

''بس یونہی۔'' اس نے چچی کے پاس سوٹ پیس رکھ دیا۔

''اور دادی جان یہ رہی چھالیہ اور آپ کے بیڈ کی چادریں۔'' وہ جانے کیا کیا خرید لائی تھی یہ اس کی عادت تھی کہ جب بازار جاتی تو ڈھیروں چیزیں خرید لاتی۔ وہ پھر وہیں ٹک گئی بڑے ابا یاد آئے لیکن دل مسوس کر رہ گئی چچی جان اور دلہن چچی نے بہت ٹٹولا کہ کچھ تو بڑی اماں کی بات کرے لیکن وہ کبھی کسی کی غیبت تو کیا کوئی ذرا سی برائی بھی نہ کرتی۔ جاب سے آ کر وہ کبھی چچی جان کے تو کبھی دلہن چچی کے کام کرتی دادی جان کی تو وہ تھی ہی دیوانی۔ رات دادی کے بستر پر لیٹتی تو ایسی پرسکون نیند آتی کہ ساری دنیا سے کوئی ڈر نہ لگتا۔

ابھی پندرہ دن نہ گزرے تھے کہ وہ بات جو خود نہ کہہ سکی تھی بڑی اماں نے اشاروں میں بڑی چچی جان کو سمجھائی۔

''ایسا ہمارے جیتے جی ہو ہی نہیں سکتا'' دادی جان سخت غصے میں بیٹھی تھیں۔ وہ جان کر انجان بنی رہی۔

''غیروں کا اور اپنوں کا فرق آج پتا چلا۔ کیسے برسوں کی بات ختم کرنے پر تلی ہوئی ہے رئیسہ بیگم۔ بچیوں والی ہو کر ڈر نہیں۔ بے ماں اور بے باپ کی بچی کے حق میں ناانصافی اللہ کو پسند نہیں۔'' اس وقت وہ کس قدر زخمی سی ہوگئی۔

''دادی جان کیا بات ہماری ہے؟'' وہ ابھی تک انجان بن رہی تھی۔ اتنا کہنا تھا کہ دادی جان کے بھل بھل آنسو بہنے لگے۔

''ارے میری دادو کیا ہوا؟'' وہ لپٹ گئی۔ دادی جان کو اور بھی رونا آ گیا۔

''رئیسہ نے برا کیا'' وہ آنسوؤں سے تر چہرے کو چھپا کر بولیں۔

''دادی جان آپ بڑی اماں کو غلط سمجھ رہی ہیں۔ دراصل ناصر خود ذہنی طور پر تبدیل ہو گئے ہیں اور یہ تو ان کی اپنی اولین پسند ہے کہ لڑکی گوری چٹی ہو۔'' اس نے آنسوؤں کو پونچھا لیکن دادی جان کے آنسو بہتے رہے۔

''خدا کا خوف اکبر میاں کو بھی نہ آیا۔.''

''بڑے ابا بے چارے کیا کہہ سکتے ہیں؟'' وہ دکھی سی ہو کر بولی۔

''رئیسہ غیر تھی اس لئے اس نے غیر بن کر سوچا۔'' دادی جان ابھی تک بڑی بہو کے لتے لیئے ہوئے تھیں۔

''بس اماں جان۔'' چچا جان آ گئے۔ وہ بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اماں یہ سب کچھ اکبر بھائی کی کمزوری کا نتیجہ ہے دکھ تو ہمیں بھی ہے لیکن اماں نجر بھائی کا خیال آتا ہے۔ تو خاموش ہو گئے ورنہ یہ ایسی خبر ہے کہ اماں رشتہ داری ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیتے۔'' دکھ تو چچا جان کو بھی تھا لیکن دادی جان رونے بیٹھ گئیں وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں گئی تو بڑی اماں چچی جان کے ساتھ بیٹھی تھیں۔

''آؤ بیٹی۔'' بڑی اماں نے پاس بلا کر بٹھایا چچی البتہ چپ تھیں۔

''بڑے ابا تمہیں بہت یاد کرتے ہیں بیٹا۔'' ان کی کنجی آنکھیں مسکرا رہی تھیں دلہن چچی سامنے سے آتی نظر آئیں۔

''تم اپنے کمرے میں جاؤ۔'' بڑی چچی نے آہستہ سے کہا تو اس کی نظر چھوٹے چچا پر پڑی جو پیچھے کھڑے تھے وہ وہاں سے چلی تو گئی لیکن پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے۔ اسے اپنی ذلت اور رسوائی پر رونا آ رہا تھا۔ اسے ناصر کا دکھ نہیں تھا بڑی اماں کے وہ سارے ڈرامے کو اچھی طرح جانتی تھی۔ بڑی اماں نے کیا خوب ڈرامہ رچایا کہ ناصر کی دوستی افشاں کے بھائی سے وہیں ہو گئی تھی یہ بات وہیں نکلی اور ناصر کی خواہش کے مطابق وہ لڑکی دیکھنے گئی تھیں اب بھلا وہ بڑی اماں کے اس جھوٹ کو کیسے بتاتی۔ گھر میں سب سے زیادہ ملال دادی جان کو تھا دادی جان کے بعد چچا جان بہت دکھی سے تھے دادی جان کے بعد صرف وہی بدر بھائی کو یاد کر کے روتے تھے۔

''تمہارے چچا جان بہت اداس ہیں'' دلہن چچی نے آہستہ سے بتایا۔

''تو بھلا اس میں اداس ہونے کی کون سی بات ہے؟'' وہ اٹھ کر سیدھی چچا جان کے کمرے میں گئی۔

''چچا جان!'' وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی بہت پیار سے پکاری چچا جان پھر آبدیدہ سے ہو گئے۔

''چچا جان!'' وہ پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

''بڑی اماں کے انکار سے آپ لوگ تو یوں رو پیٹ رہے ہیں جیسے کوئی نکاح ٹوٹ گیا ہے ارے چچا جان جس کے سر پر آپ کا سایہ ہو وہ اتنا بدنصیب ہو ہی نہیں سکتا اب میں اتنی بھی کمزور نہیں ناں ہی شیشے کی گڑیا ہوں کہ بڑی اماں کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ جاؤں گی۔ اصل بات تو یہ ہے چچا جان کہ اگر مقدر میں ہی لکھا نہ تھا تو آپ اور ہم کیا کر سکتے ہیں اگر ہم نے اتنے سیریس رویئے کا اظہار کیا تو بڑے ابا بالکل تنہا ہو جائیں گے ایسا تو نہ کریں ان کی خوشی میں۔'' یہ کہہ کر خود سسک پڑی۔ چچا جان نے جلدی سے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

''شاباش میرا بیٹا بہت بہادر ہے'' چچا جان یہ کہہ کر اٹھے اور باہر نکل گئے۔

''سچ کہتی ہوں چچی جان کہ یہ دکھ کے آنسو نہیں۔'' اس نے آنسوؤں کو پونچھا۔

''میں جانتی ہوں چندا لیکن تمہارے چچا تمہیں بہت پیار کرتے ہیں اور اس وقت انہیں بدر بھائی یاد آ گئے'' چچی جان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بیڈ پر بٹھا لیا۔

''کیا ہوا؟'' دلہن چچی بھی وہیں آ گئیں۔

''کچھ نہیں۔'' بڑی چچی جان نے اشارے سے منع کیا۔

''خیر دکھ تو انہیں بھی بہت ہے۔'' دلہن چچی کی آواز آئی تو وہ دوبارہ سے زخمی ہو گئی۔

''کیا میں اتنی بھاری ہوں کہ ہر کوئی مجھے یہی احساس دلا رہا ہے کہ ناصر سے میرا رشتہ ٹوٹ گیا۔ ارے دلہن چچی بات تھی ختم ہو گئی۔''

''لیکن دلوں میں تو فرق آ جائے گا۔ تمہاری دادی نے اجنبیت کی اس دیوار کو جو بڑی بھابی نے قائم کی ہے گرانے کے لئے تو یہ رشتے جوڑے تھے، خیر کوئی بات نہیں کل اس گھر میں سحاب بھی تو آ جائے گی'' ۔ دلہن چچی نے بڑی چچی جان کی طرف دیکھا۔

پھر سب کچھ نارمل ہو گیا ناصر کا نام جب کبھی آتا تو اسے یوں لگتا گویا وہ اسے جانتی بھی نہیں ہے۔ ایک بار بڑے ابا دادی جان سے ملنے آئے تو وہ رو پڑے۔

''بڑے ابا آپ اگر مجھ سے پیار کرتے ہیں تو اس طرح مجھے میری نظروں میں ذلیل نہ کیجئے۔ سب کچھ بھول جائیے، میں آج بھی وہی ہوں صرف انتظار میں ہوں کہ بڑی اماں خود بلائیں گی تو آ جاؤں گی۔ آپ کمزور ہو رہے ہیں اپنا خیال رکھا کیجئے۔'' وہ چائے بنا کر لائی تھی۔

''اماں ہم شرمندہ ہیں آپ سے۔'' بڑے ابا دکھی سے لگ رہے تھے۔

''چلو جس میں تمہاری بیوی خوش، وہی بہتر ہے۔''

''خوشی کیسی اماں وہ جوش میں پاگل ہوئی ہے اس پاگل پن کی اب کوئی دوا نہیں بس سوچتا ہوں کہ جونہی بیٹیوں کے فرض سے فارغ ہوا کسی ایسی جگہ منہ اٹھا کر چلا جاؤں گا جہاں میں اور بس میری صورت ہو۔'' بڑے ابا اماں کے سامنے بچے سے لگ رہے تھے۔

''خیر چھوڑو تم، کب آ رہا ہے ناصر؟''

''بس یہی کوئی ہفتہ عشرہ۔'' بڑے ابا اس بات کے بعد سے آج پہلی بار شرمندہ شرمندہ سے آئے تھے۔

موسم خشک تھا لیکن ہوا تیز تھی ہر طرف خشک پتے اڑتے پھر رہے تھے، وہ لان میں پانی دے رہی تھی کہ اچانک لگریز اندر آیا۔

''دادی جان!'' وہ اندر آتے ہی بولا۔

''وہ ناصر بھائی آئے ہیں۔'' پائپ ہاتھ سے گر گیا۔ وہ کیسے کرے گی اب اس کا سامنا؟ وہ دادی جان کے پاس چلی آئی۔ سب لوگ کمروں سے نکل آئے۔ بڑی اماں، سحاب اور ناصر بھائی اندر آ گئے تھے

''ارے دادی جان!'' ناصر آ کر لپٹ گئے وہ اجنبی سی بنی کھڑی رہی۔

''ناصر بھائی۔'' سحاب نے بازو پکڑ کر اشارہ کیا تو وہ چونکی سی ہو گئی۔

''سائرہ'' وہ ایک منٹ کے لیے رک گئے۔

''کیسی ہو؟'' پاسداری کا خیال آیا۔

ابھی اس نے ہونٹ کھولے بھی نہ تھے کہ بڑی اماں نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

''اے دیکھو کتنی بڑی ہو گئی ہے فرح۔'' انہوں نے دلہن چچی کی آڑ میں چھپی ہوئی فرح کا ہاتھ پکڑ کر سامنے کیا، وہ دادی جان سے الگ ہو کر فرح کی طرف بڑھے لیکن فرح ماں کی آڑ میں چھپ گئی۔ وہ خود کو ناصر کے سامنے بہت کمتر سمجھ رہی تھی کہاں ناصر کہاں وہ؟ اس نے محسوس کیا ناصر بھائی اس سے نظریں

نہیں ملا رہے ہیں۔ بات کہیں اور کر رہے ہیں لیکن دھیان اس کی طرف ہے۔ وہ نظر انداز کر کے باہر نکل آئی۔ آج کے ماحول میں صرف سحاب چھائی ہوئی تھی۔

''سحاب آپا نے آپ کو البم دکھایا؟'' نگریز ناصر سے مخاطب تھا۔

''ابھی اتنی فرصت کہاں ہے۔'' بڑی اماں نے مسکرا کر دیکھا تھا۔

''بیٹے ناصر کی صحت تو اچھی ہوگئی ہے خوب رنگ بھی نکھر آیا ہے۔'' دادی جان ابھی تک جائزہ لے رہی تھیں۔

''دیکھ لیجئے اماں اب غیر خاندان کا طعنہ نہ دیجئے گا کیسا میں نے بنایا سنوارا ہے یہ میری تربیت ہے کہ ناصر کو امریکہ پسند ہی نہیں، کہتا ہے امی بہت دور رہ لیا اب نہیں جاؤں گا۔''

کیونکہ شہریار وہیں کی سٹیزن شپ لینے کے انتظار میں تھا اس لئے چچی جان نے رشک بھری نظروں سے ناصر کو دیکھا۔

''اور کبھی شہریار سے بھی بات ہوئی؟'' چچی جان نے پوچھا۔

''ارے چچی جان کافی دنوں سے ہم دونوں نہیں ملے حالانکہ شہر ایک ہے لیکن فاصلہ اور پھر الگ الگ مصروفیات بس چلتے وقت فون پر ہی رابطہ ہوا تھا۔ کہہ تو رہا تھا کہ اس سال کے آخر میں پاکستان کا چکر لگاؤں گا۔ ویسے ٹھیک ٹھاک ہے آپ فکر نہ کیجئے۔'' اس نے مسکرا کر سحاب کی طرف دیکھا جو شہریار کے نام پر شرما گئی تھی۔ بڑی اماں ہنسنے لگیں چچی جان نے سحاب کو لپٹا لیا۔

''ابھی سے نخرے اٹھوا رہی ہیں۔'' عاصمہ نے دھیرے سے کہا تو سحاب کمرے سے پانی پینے کے بہانے اٹھ کر چلی گئی۔

''اماں ناصر آگیا ہے اب بھائی سے کہیں ناں کہ وہ شہریار پر زور ڈالیں۔'' بڑی اماں نے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھ دیئے۔ چچی جان نے تائید میں سر ہلایا۔

''ہاں بات تو ٹھیک ہے جہانگیر سے بات کروں گی'' دادی جان نے بڑی اماں کو اطمینان دلایا۔

''آ گئیں ناصر بھائی جاجے پر ابا میاں بلا رہے ہیں۔'' موسم تو حبس کا تھا پر خوشیاں ہر طرف بکھر گئیں۔ بل سمٹ گئے ناصر کی تاریخ رکھی گئی راتوں کو رت جگے ہوئے لڑکیاں بالیاں آگئیں ڈھول بجے، پیلے کپڑوں پر گوٹے کناری کا کام خوب سجا دادی جان کی بیماری بھاگ گئی۔ چچا جان اور چھوٹے چچا مصروف

ہو گئے۔ ہر لمحہ محفوظ کر لیا گیا انہی دنوں سحاب کے کسی ڈرامہ سیریل کی شوٹنگ بھی ہو رہی تھی کیسا بھاگ بھاگ کر انجوائے کرتی تھی پھر وہ دن بھی آ گیا۔

''سائرہ آہستہ سے غرارہ تھامو، تم نے تو سارا کام ہی مسل ڈالا۔'' سحاب نے سرخ غرارے کا پائنچا اس کے ہاتھ سے چھڑایا۔

''سحاب'' وہ دھک سے رہ گئی۔

''میں لے کر چلتی ہوں بھابی کو تم ذرا دادی جان کا خیال رکھنا'' سحاب نے دلہن کا بازو تھام لیا۔ عاصمہ دلہن کے پیچھے قرآن اٹھائے چل رہی تھی۔ اسے تو دلہن چچی نے کہا تھا کہ دلہن بھابی کا فرشی غرارہ زمین پہ نہ لگے۔ ناصر کیسے خوب رو لگ رہے تھے بڑی اماں کھلی جا رہی تھیں۔

''جی دلہن بیگم تھوڑے ہی دن میں یہ رنگوں کی بارات تمہارے گھر میں اترے گی'' بڑی اماں نے چچی جان کو دیکھ کر گلے میں باہیں ڈال دیں چچی جان بے چاری ہنس کر رہ گئیں پھر رخصتی ہوئی تو دلہن آنگن میں اتری کیسا سہانا منظر تھا۔ دادی جان اپنے بچوں کو ایک ساتھ دیکھ کر مسکرائے جا رہی تھیں۔

''بیٹا سائرہ اسے ٹانگنا'' بڑے ابا نے شیروانی ہاتھ میں اتار کر اس کی طرف بڑھائی تو وہ جلدی سے لیکر چل دی۔

''اس گھر میں تو کام بہت ہے اور میں بے حد مصروف ہوں عاصمہ کو تو آپ جانتی ہی ہیں سائرہ کو دو چار دن کے لئے روک لیجئے گا۔'' سحاب کی آواز کانوں میں آئی۔

''تم خود کہو ناں دادی سے۔'' بڑی اماں نے جھنجھلا کر کہا۔

''میں نہیں کہتی اور نہ ہی میں اس وقت چائے بنا سکتی ہوں۔'' سحاب تیزی سے گزر گئی۔

فرح دلہن سے لگی بیٹھی تھی بنی سنوری افشاں مسہری پر بیٹھی تھی۔ دادی جان نے منہ دکھائی دی تو بڑے ابا کو بھی بلا لیا۔ بڑی اماں صدقے واری جا رہی تھیں بڑے ابا اجنبی کی طرح سلامی دے کر چلے گئے۔

''بس بس سائرہ ایسے مت دیکھو ورنہ نظر لگ جائے گی۔'' سحاب کے جملے پر سب ہنس پڑے پر وہ زخمی سی ہو گئی۔

''کیسی کندن سی بھابی ہیں'' عاصمہ خوشی سے کھلی جا رہی تھی۔ بڑی اماں اشاروں میں چچی جان کو، دادی کو زیورات دکھا رہی تھیں نگریز کھڑا مووی بنا رہا تھا برابر میں ناصر بھائی بیٹھے تھے۔

''اچھا بڑی بھابی اجازت۔'' دلہن چچی چلنے کی تیاری میں تھیں۔

''ارے تم کہاں؟'' بڑی اماں نے اس پر ایک نظر ڈالی تو وہ فرح کا ہاتھ تھامے قریب آ گئی۔

''دو چار دن کے بعد چلی جانا'' بڑی اماں مسکرائیں تو اس نے دادی کی طرف دیکھا۔

''اماں آپ تو رک رہی ہیں ناں!''

''ہاں میں رکوں گی، دو، چار دن کے بعد گلریز کو بھیج دینا۔''

''دادی جان دو چار دن نہیں اب آپ یہیں رہیں گی۔'' ناصر نے تیز روشنی سے چہرے کو بچاتے ہوئے کہا۔

''سن لیا اماں آپ نہیں جائیں گی'' بڑی اماں نے دادی کو روک لیا تو وہ بھی رک گئی۔

اس نے محسوس کیا کہ بڑے ابا بہت دکھی سے ہیں۔ ناصر کس قدر مہربان اور جانثار ہو رہے تھے دادی پر۔ رات وہ دادی جان کے ساتھ ہی عاصمہ اور سحاب کے کمرے میں سوئی۔ گھر میں کیسی بے ترتیبی سی پھیلی ہوئی تھی اس کے ذہن میں ایک ایک لمحہ جاگ رہا تھا کھیلتے دوڑتے بھاگتے لمحوں کی کہانی کا ڈراپ سین ہو گیا تھا۔ کسی کو کوئی خبر نہیں تھی قربانی رائیگاں گئی۔

زندگی کے سارے رنگ ناصر کے حوالے سے افشاں کی مٹھی میں بند تھے اور جو اس کے خواب تھے وہ اس کی آنکھوں میں اٹک گئے۔

''کیا ہوا دادی جان؟'' دادی نے کروٹ بدلی تو وہ زخم اور ریزے سمیٹ کر اٹھ بیٹھی۔

''بس یونہی نیند نہیں آ رہی۔'' دادی جان بھی اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے دادی؟''

''ہاں ٹھیک ہے۔'' وہ جماہی لے کر بولیں۔

''مجھے تو سخت نیند آ رہی ہے۔'' وہ چہرے پر دوپٹہ ڈال کر لیٹ گئی حالانکہ نیند کوسوں دور تھی۔

ولیمہ اور چوتھی بھی گزر گئی تھی۔

''بڑے ابا جا رہی ہوں'' وہ اجازت لینے آئی تھی بڑے ابا منہ سے کچھ نہ بولے سر کے اشارے سے خدا حافظ کہا تو اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ دل چاہا کہ وہ خوب لپٹ کر رو دے۔

''اچھا دادی آتی ہوں۔'' وہ پلٹ کر آئی کبوتروں کی کونڈی میں پانی ڈالا اور لوٹا بھر کر اس نے اس پودے میں ڈالا جس میں نہ ہی پھول تھے اور نہ ہی پھل، ایک نظر صحن پر ڈالی، جو بپ چاروں طرف بکھری تھی۔

گلریز ہارن دے رہا تھا بڑے ابا چلتے ہوئے آ رہے تھے لیکن اس نے مڑ کر نہیں دیکھا یہ سوچ کر کہ وہ پتھر

کی بن جائے گی۔ جب گلریز نے خدا حافظ کہا تو وہ دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔

زندگی کی شوخیاں وہ ہنگامے جو ناصر کی ذات سے دو خاندانوں میں نمودار ہوئے تھے ان کی بازگشت کم ہو گئی تھی۔

''سائرہ تمہارے بڑے ابا کی طبیعت ٹھیک نہیں۔'' دادی جان نے گھر میں گھستے ہی اسے اطلاع دی۔

''کیا ہوا انہیں؟'' اس کا دل دھک سے ہوا۔

''مجھے خود نہیں معلوم تمہارے چچا سے بات ہوئی ہے۔'' دادی جان مضطرب تھیں فکر مند تو، وہ بھی تھی فوراً فون کرنے بیٹھ گئی۔

''بڑی اماں کیسے ہیں بڑے ابا؟ دادی جان نے ابھی ابھی اسکول سے آئی ہوں تو بتایا ہے۔'' اس کا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا۔

''ناصر ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے ہیں ابھی تک تو نہیں آئے۔'' بڑی اماں اداس تھیں۔

''آپ فکر نہ کیجئے میں اور دادی ابھی آپ کے پاس آتے ہیں۔'' فون بند کر کے وہ دادی کے پاس آ گئی۔

''دادی جان آپ چل رہی ہیں تو میں رکشہ منگوا لوں؟''

''تھوڑی دیر دم تو لے لو۔''

''نہیں دادی جان۔'' اس نے چادر اٹھا لی۔

''چچی میں دادی کو لے کر بڑے ابا کو دیکھنے جا رہی ہوں۔'' وہ چچی کو بتا کر آ گئی۔

جب وہ دادی کے ساتھ وہاں پہنچی تو اس وقت شدید گرمی تھی عاصمہ اور سحاب اپنے کمرے میں تھیں پورا گھر کھلا ہوا پڑا تھا وہ سیدھی دادی کے ہاتھ کو تھامے بڑی اماں کے کمرے میں چلی آئی بڑی اماں بہت اداس لگ رہی تھیں۔ دادی جان کی تو سانس ہی رکنے لگی خود وہ بھی سہم گئی۔

''کہاں ہے اکبر؟'' ماں کی نظر پیاسی لگ رہی تھی۔

''بس آتے ہی ہوں گے۔''

''کیا ہوا ہے اسے؟'' دادی جان نیم جان سی ہو کر بولیں۔

''ہونا کیا ہے اماں، ہماری قسمت ہی کھوٹی نکلی گھر کا سکون ختم ہو گیا ہے۔'' بڑی اماں سسک پڑیں۔

''ارے ہوا کیا ہے؟'' دادی جان لرز گئیں۔

''بس اماں میں تو دل کا غبار کہہ سن کر نکال لیتی ہوں یہ ہر وقت پریشان رہتے ہیں اماں ہمارے ساتھ دھوکہ ہوا کہاں کی دولت اور کہاں کی امارت؟ جو دیا ہے وہ اپنی بیٹی کو، بیٹی بھی ایسی کہ کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتی سیدھے منہ بات تو کیا وہ اپنے کمرے میں ہی رہتی ہے۔'' بڑی اماں سسک پڑیں۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' دادی جان نے تسلی دی۔

''ارے نہیں اماں ناصر ایسا بدلا ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ دو دن میں یہ کیسے ہو گیا ہر بات اس کی ٹھیک ہے ہر عیب ہم لوگوں میں ہے اماں افشاں میں کوئی گن نہیں ہیں، وہ کپڑا سینا نہیں جانتی، باورچی خانے میں وہ کام نہیں کر سکتی۔ بابا نے دو ہاتھ کا فریج کمرے کے لئے دیا ہے ضرورت کی ساری چیزیں وہ تیسرے دن سے ہی وہیں رکھتی ہے ٹی وی وہ کمرے میں دیکھتی ہے۔ ہمیں کیا ملا؟'' بڑی اماں پھر رو پڑیں۔

''دل چاہتا ہے جان دے دوں۔'' بڑی اماں آنسوؤں سے روئے جا رہی تھیں۔

''میں افشاں بیٹی کو سمجھاؤں گی۔''

''کیا سمجھے گی اماں وہ؟ ایسا پٹ سے جواب دیتی ہے کسی کا لحاظ نہیں کرتی اسے باپ کی دولت پر ناز ہے لیکن اماں ہمیں کیا ملا؟''

''چپ کر جاؤ رئیسہ!'' دادی نے بڑے ابا اور ناصر کی آواز سن لی تھی۔

''کیسے ہو اکبر؟'' دادی جان خود ہمت ہارے بیٹھی تھیں۔

''بس زندگی کے دن گزار رہا ہوں'' وہ نڈھال سے لگ رہے تھے۔

''کچھ بھی نہیں ہے دادی جان بلڈ پریشر زیادہ ہے'' ناصر سلام کر کے دادی کے برابر کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا

''بڑے ابا آپ ٹھیک تو ہیں؟'' وہ جلدی سے اٹھ کر آ گئی۔

''ٹھیک ہوں'' نقاہت چہرے سے ٹپک رہی تھی۔

''تم لوگ کب آئے؟''

''بس ابھی تھوڑی دیر پہلے۔'' وہ قریب ہی بیٹھ گئی۔

''دادی جان آپ امی کو سمجھائیے۔'' ناصر نے ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھ لئے تھے۔

''میں کہتی ہوں تم یہاں سے فوراً چلے جاؤ۔'' بڑی اماں برہم سی ہو کر بولیں۔

''سمجھائیے دادی جان! خود اپنی پسند سے کی ہے شادی، کس نے کہا تھا یہ برسوں کی......'' ناصر رک گئے

وہ سہم کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

''عاصمہ کہاں ہے؟'' وہ بہانے سے کمرے سے نکل آئی لیکن دل دھڑک رہا تھا۔

''دادی جان، اب اگر اس کو عادت نہیں ہے کام کرنے کی تو میں کیا کروں؟'' ناصر سوالیہ نشان بن گئے۔

''تم اسے پیار سے سمجھاؤ بیٹا کہ اب یہ گھر تمہارا ہے۔'' دادی جان نے رسان سے کہا۔

''یہ گھر اس کو تو وہ چڑیا خانہ کہتی ہے۔'' بڑی اماں زخمی سی لگ رہی تھیں۔ بڑے ابا اپنے کمرے میں چلے گئے۔

''میں کہتی ہوں تم اپنے کمرے میں جاؤ میں تمہاری صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتی'' بڑی اماں رونے لگیں تو ناصر اٹھ کر چلے گئے۔

صحن میں شام اتر آئی تھی عاصمہ نے نہ صحن دھویا نہ بڑے ابا کے کبوتروں کے پاس آئی وہ خود ہی دانہ دانہ کھا کر ادھر ادھر چلے گئے تھے، گھر میں بڑی خاموشی تھی سحاب اب زور زور سے نہیں بلکہ آہستہ آہستہ ڈرامے کے ڈائیلاگ یاد کر رہی تھی۔ وہ جب دادی جان کے ساتھ جانے کے لئے اٹھی تو ہر طرف ایک نظر ڈال کر چپ ہو گئی۔ کیسی ویرانی برس رہی تھی۔

''دیکھا اماں ساری دوپہر آپ بیٹھیں لیکن وہ شکل کرنے آئی، سارا وقت ناصر سے بحث کرتی رہی۔ سنئے ابھی بھی آواز آ رہی ہے۔'' بڑی اماں نے اشارہ کیا لیکن دادی جان رکی نہیں اور آگے بڑھ گئیں۔ بڑے ابا دوا کھا کر سو رہے تھے وہ دیکھ کر واپس آ گئی تھی۔

''کہتی تھی اپنے اپنے ہی ہوتے ہیں رئیسہ بیگم لیکن عقل کی ماری یہ بات نہ جان سکی۔'' دادی جان نے اسٹاپ پر کھڑے ہوئے کہا تو وہ رکشہ کو ہاتھ دینے لگی۔

نہ رنگ بھرے سے نہ موسم آئے بڑی اماں کے آنگن میں یونہی جھپ بکھری تھی۔ ہر وقت وہ سر نیہوڑائے پچھلی باتوں کو سوچا کرتیں افشاں نے اپنا چولہا الگ کر لیا تھا۔ بڑی اماں کا عمل دخل تھا۔

چچی جان ایک شام مغرب کی نماز کے بعد دعا مانگ کر اٹھیں تو چچا جان نے بلا کر خوش خبری سنائی کہ شہریار آ رہا ہے۔ ہر طرف جلترنگ سا بج اٹھا پانچ سال کے بعد اچانک خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

''میں دو رکعت شکرانہ پڑھ کر ابھی آتی ہوں۔'' چچی جان کے چہرے سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔

''آپ ذرا اکبر بھائی کو خوش خبری سنا دیجئے۔'' وہ جاتے جاتے رک گئیں۔

''چچی جان شہریار کا کمرہ دیکھ لیجئے۔'' وہ صفائی کر کے نکلی تھی۔

"چھوٹا بھائی آ رہا ہے ناں خوب صفائی کی ہے" بڑی اماں نے چچی جان کی بجائے سائرہ سے کہا۔

"ہاں بڑی اماں شہریار مجھ سے دو ماہ دس دن چھوٹے ہیں۔"

"کیا ڈائری میں لکھ لیا ہے؟"

"ارے اسے کیا پتا وہ اماں جو ہیں۔" چچی جان ہنس دیں۔

"سائرہ، میری بیٹی بس یہ شہریار کی پسند کے کباب رہ گئے ہیں۔"

"بس چچی جان آپ فکر ہی نہ کریں جب آپ واپس آئیں گی تو ساری چیزیں ٹیبل پر موجود پائیں گی۔" وہ تیزی سے کچن میں چلی گئی۔

"سچ کہتی ہوں بھابی مثالی لڑکی ہے جس گھر میں جائے گی وہ قسمت والے ہی ہوں گے۔"

"ارے ہم ایسے بدنصیب نہیں تھے لیکن بس ناصر کی خواہش۔"

"کیا ناصر میاں نے ایسا کہا تھا؟"

"ہاں اور کیا ورنہ ہم اور تمہارے بھائی بھلا یہ کب چاہتے تھے؟"

"لیکن بیٹے کی خوشی کی خاطر کہ برسوں بعد لوٹا ہے۔" بڑی اماں ہاتھ مسل مسل کر بات کر رہی تھیں

"خیر چھوڑو دولہن قسمت والی تو تم ہو کہ صحاب گھر آئے گی ورنہ کوئی افشاں تمہارا گھر بھی لوٹ سکتی تھی۔"

"جب آپ دکھی کیفیت میں نظر آتی ہیں بھابی تو اماں کا کہا سچ نظر آتا ہے جو بات اپنوں سے رشتے داریوں میں ہے وہ غیروں میں نہیں اور افشاں نے تو یہ ثابت ہی کر دیا۔" وہ آنے والی خوشی میں پور پور ڈوب رہی تھیں لیکن بڑی اماں تو ڈھیروں من مٹی تلے دبتی چلی گئیں۔

"چلیں آپ تو نکلیں،" گلریز چچی جان کے پاس کھڑا اچانک گھبرا رہا تھا۔

"اور اماں؟" جہانگیر پلٹ کر آئے۔

"سائرہ اماں کے پاس رہے گی چھوٹی دلہن کو بلاؤ۔" چچی جان نے فرح عاصمہ کو بھیجا تھا۔

"جو اصلی مہمان ہیں آج وہی غائب۔" گلریز عاصمہ کو تنگ کرنے لگا۔

"جی جناب شہریار بھائی کو بھی تو معلوم ہو کہ یہاں پر لڑکیاں گھروں میں بیٹھنا پسند نہیں کرتیں۔"

"کیا مطلب کیا آپ کو گھر پسند نہیں؟"

"جی نہیں یہ مطلب نہیں ہے۔"

"تو پھر؟"

"پھر یہ کہ ایک تصور ہے کہ یہاں کی لڑکیاں کچھ نہیں کرتیں۔"

"یہ کس نے کہا؟"

"بھاڑ میں جاؤ تم۔" عاصمہ تنگ آ کر چل دی۔

"بجیا جو شہریار بھائی نے اس حالت میں دیکھ لیا تو یہی سمجھیں گے کہ فارسی پڑھ کر تیل بیچ رہی ہیں، کچھ تو امپریس آپ بھی کیجیے گا کہ ماسٹر ڈگری ہولڈر ہیں اور کچھ نہیں تو اپنی ذہانت کا سکہ ہی بٹھا دیجیے گا۔"

"پہلے ہی یہ رعب کیا کم ہے کہ وہ مجھ سے عمر میں چھوٹا ہے۔"

"لیکن بجیا اب بات دوسری ہے۔"

"بات وات جو ہو سو ہو تم فکر مت کرو ذرا خود پر دھیان دو۔"

"کیوں میں کیسا لگ رہا ہوں؟"

"سچ کہہ دوں؟" وہ آنکھوں میں مسکرائی۔

"بتائیں ناں۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"چلیں آپ" فرح نے ہاتھ کھینچا۔

"اب یہ اڑ کر کھڑا رہے گا جب تک سائرہ اس کی تعریف نہ کر دے۔" چچی جان ہنسیں تو بڑی اماں کو سائرہ پر تھوڑا غصہ آ گیا۔

"کیا ہے سائرہ اچھا خاصا سب جا رہے تھے۔"

"تو جائیے ناں بڑی اماں اس بدھو کو کس نے روکا ہے۔"

"سچ بتائیں بجیا یہ قمیض کیسی لگ رہی ہے؟"

"بالکل نہیں جچ رہی۔" وہ کہہ کر ہنس پڑی۔ وہ دوڑ کر شرٹ تبدیل کر آیا

"ہاں یہ چلے گی۔"

"سائرہ کی بڑی اہمیت ہے اس گھر میں۔"

"ایسی ویسی، بڑی اماں ہمارے گھر کی تو صبح ہی سائرہ کے نام سے ہوتی ہے۔ سائرہ او سائرہ۔" اس نے دادی جان کی آواز میں نقل اتاری چھالیہ کترتی ہوئی دادی جان ہنس پڑیں اور پھر آیت الکرسی پڑھ کر دم

کرنے کے لئے نگریز کو بلایا۔

''دادی جان ناانصافی نہیں آدھی حصے دار ہوں اس کی محبت میں۔'' وہ دادی جان کے سامنے جھک گئی۔

''اچھا بیٹا ذرا دھیان رکھنا سب کمروں میں تالے ڈال لو اور دادی کے پاس رہنا۔'' بڑے چچا جب اس کے پاس آئے تو بڑی اماں نے بہت حسرت سے نظر ڈالی۔

''چچا جان اللہ حافظ آپ بے فکر رہیں میں سب لاک کرلوں گی۔''

''اللہ خوش رکھے بڑی پیاری بچی ہے۔'' چچا جان نے بڑی اماں کو مخاطب کیا تو بڑی اماں کو یوں لگا گویا انہوں نے از خود کوئی بھالا کچوک دیا، وہ تلملائیں اس ایک سانولی سلونی دھان پان سی لڑکی میں ایسا کیا ہے جو سب اس کے ہی دیوانے ہیں؟ انہوں نے غور سے دیکھا۔ ان کے چہرے سے ایک ملال اور حسرت کا اظہار ہو رہا تھا۔

جب وہ بڑا گیٹ بند کر کے چابیوں کا گچھا اچھالتی ہوئی باورچی خانے کی طرف جا رہی تھی تو فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

''ہیلو!'' اس نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سحاب تھی۔

''کیا ہوا سب لوگ گئے؟'' وہ گھر آ کر سب سے پہلے فون کرنے بیٹھی تھی۔

''بس ابھی ابھی، تم کیوں نہیں آئیں؟'' وہ پوچھنے لگی۔

''یہ سوال بہت مشکل ہے اکٹھا ہی جواب دے دوں گی۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ جان گئی تھی لیکن ہنس دی۔

''کیا اچھا ہوتا سحاب کہ تم بھی شہریار کو لینے جاتیں، وہ منتظر ہوگا۔''

''کیوں آ رہے ہیں شہریار؟''

''یہ تو مجھے پتہ نہیں۔''

''خیر ایسا بھی مت بنو تمہیں سب خبر ہے، یوں اچانک تو شہریار نہیں آ سکتے چچی جان کو پہلے سے علم ہوگا۔''

''مجھے تو یہی علم ہے کہ بس پندرہ دن پہلے اس نے فون کیا تھا۔''

''رہنے دو سارہ! چچی جان اور اس گھر کے لوگ سب ہمیں غیر سمجھتے ہیں بنیاد ہماری امی کو بنا دیا ہے۔''

''کیسی باتیں کرتی ہو تم؟''

''کیوں برا لگ گیا؟''

''کیوں نہیں؟''

''ہاں بھئی تم زیادہ وفادار ہو ہم کچھ بھی نہیں۔''

''کچھ نہیں بہت کچھ ہو تم تمہیں اپنی اہمیت کا اندازہ نہیں۔''

''اندازہ ہو گا ناں تب ہی، ورنہ کون کسی سے رشتہ ناتا جوڑتا ہے؟'' اس کی آواز میں خبر کا رنگ تھا۔

''پلیز سحاب ایسی باتوں کو دل میں جگہ نہیں دیتے۔''

''چلو یہ بھی اچھا ہے کہ تم بزرگوں کی طرح سمجھا تو لیتی ہو۔''

''مجھے اپنی بزرگی پر فخر ہے، اچھا لگتا ہے جب سوچتی ہوں کہ میں سب سے بڑی ہوں۔''

''اچھی بات ہے، ورنہ تو لوگ اپنی عمر چھپاتے ہیں۔''

''احمق اور بے وقوف ہوتے ہیں جو ایسا کرتے ہیں۔''

''خیر یہ بتاؤ کہ کب تک واپسی ہوگی؟'' وہ اصل موضوع پر دوبارہ آ گئی۔

''اب یہ تو فلائٹ پر ہے اگر دس بجے ٹھیک وقت پر آ گئے تو گیارہ تو بج ہی جائیں گے نکلتے نکلتے۔''

''پھر تو بہت دیر ہو جائے گی اچھا خدا حافظ۔'' اس نے فون بند کر دیا

''کس کا فون تھا؟'' دادی جان نے وہیں سے پوچھا۔

''دادی سحاب تھی اسے دیر ہو گئی اس لئے نہیں آ سکی۔'' وہ کہتی ہوئی ادھوری ڈش تیار کرنے کچن میں چلی گئی۔ رات کے بارہ بج رہے تھے وہ دادی کے کمرے میں تھی۔

''دادی آ گئے۔'' گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ وہ اچھل کر گیٹ پر پہنچ گئی۔

''تم لینے کیوں نہیں آئیں؟'' وہ گیٹ پر ہی تن کر کھڑا ہو گیا۔

''ارے تم پہلے اندر تو آؤ دادی بیچاری اندر۔'' وہ اشارہ کر کے سامنے سے ہٹی۔

''وہ تو میں ملوں گا لیکن پہلے حساب کتاب، اتنی بے وفائی۔ ایسی مصروفیات کہ محترمہ ایئر پورٹ نہ آ سکیں۔'' اس نے زور سے لمبی سی چوٹی کھینچی۔

''چچی جان!'' وہ زور سے چیخی۔

''بدتمیز بالکل ویسے ہی اجڈ اور گنوار ہو زمانہ سلیقہ آیا۔''

''ہوں ہوں یہ کیا ہو رہا ہے؟'' چچی جان ہنسیں۔

''بچیا ہوشیار۔'' گلریز بیچ میں آ گیا۔

''اور وہ کہاں ہے؟'' شہریار نے چاروں طرف نظر ڈالی۔

''اچھا تو یوں کہو کہ اس کی تلاش ہے، اس کو ہم نے نانیوں بٹھا دیا۔'' وہ جلدی سے بات کہہ کر چچا کے پاس کھڑی ہو گئی۔

''سائرہ! تم اتنی بڑی ہو گئیں لیکن حرکتیں بچوں والی کرتی ہو، بیٹا کیا بات کب کرنی ہے موقع دیکھا کرو۔'' بڑی اماں کی تیوری چڑھ گئی۔

''بڑی اماں آپ نے نہیں دیکھا کس طرح اس نے میری چوٹی کھینچی ہے؟'' اس نے بالوں کو صحیح کیا۔

''بیٹا! تم اس طرح کودتی اچھلتی ہو جیسے کوئی سترہ سال کی لڑکی ہو۔'' بڑی اماں نے آہستہ سے اسے زخمی کر دیا۔

''بھئی بہت بھوک لگی ہے۔'' چچا جان بول اٹھے۔

''شہریار! تم دیکھو تو یہ سارے کھانے سائرہ نے بنائے ہیں۔ یہ رہی تمہاری پسند کی ڈش۔'' چچی جان نے ڈش اس کی طرف بڑھائی۔

''اچھا اچھا تو اس چوہیا کو کھانا پکانا آ گیا؟''

''شہریار بھائی آپ کچھ بھی نہیں بھولے۔'' عاصمہ ہنسنے لگی۔

''عاصمہ۔'' بڑی اماں نے آنکھیں دکھائیں تو خاموش ہو گئی۔ گلریز لفظ چوہیا پر ابھی تک منہ میں لقمہ رکھے ہنس رہا تھا۔

''اور بڑی اماں رانی بھی نظر نہیں آ رہی، وہ کیسی ہے اور کیا کر رہی ہے؟'' لیکن اس کی نظریں سائرہ ہی کی طرف تھیں۔

''وہ تو تم اپنی اماں سے پوچھو۔'' وہ بے طرح خوش تھیں۔

''شہریار بھائی دراصل کئی دن سے بکنگ تھی رانی آپا نے پارلر کھولا ہوا ہے ناں کسی دلہن کا اپائنٹمنٹ تھا۔ اسی لئے نہیں آ سکیں۔'' عاصمہ نے وجہ بتا دی۔

''تو گویا ان پانچ سالوں میں بڑی ترقی ہو گئی ہے ہر شخص بہت مصروف ہے۔'' اس نے چلیں اٹھاتی ہوئی سائرہ کو پھر تنگ کیا۔ رات بڑی اماں گھر چلی گئیں لیکن دل اسی صحن میں چھوڑ آئی تھیں۔ جہاں سائرہ کی

ہنسی گونج رہی تھی۔

''آپا! اتنے ہینڈسم سے لگ رہے تھے شہریار بھائی اور بالکل بھی نہیں بدلے۔ اسی طرح چھیڑ چھاڑ بچیا کی جو ریڑھ لگائی ہے تو سارا بچپن یاد آ گیا۔'' عاصمہ نے جلدی جلدی گفتگو پوری کی۔

''کچھ زیادہ ہی نہیں مرعوب ہو گئیں تم اور اماں شہریار سے۔''

''دیکھیے گا تو سبھی کیسے ہینڈسم لگ رہے ہیں۔''

''تو کیا ہماری بیٹی کم ہے؟'' اماں نے سحاب کے چہرے پر ایک نظر ڈالی۔

''اچھا چلو سو جاؤ صبح ہم بھی دیکھ لیں گے۔'' اس نے چادر تان لی۔

''شہریار اٹھو تمہیں بڑے ابا سے بھی ملنے جانا ہے۔'' آج کا سورج نکھرا نکھرا اور چچی جان کا لہجہ چاندنی جیسا تھا۔

''امی پہلے اس چوہیا سے کہیے کہ وہ اچھی سی چائے بنا لائے۔''

''شہریار، مت تنگ کیا کرو۔ وہ تو اسکول چلی گئی۔''

''کیوں امی کیا ابھی اس کی بی ایس سی کی کلاس ختم نہیں ہوئی؟'' وہ پھر لیٹ گیا۔

''اچھا تو گویا تمہارے خیال میں پڑھنے گئی ہے۔'' چچی جان ہنسیں۔

''وہ اسکول میں ہیڈ مسٹریس ہے۔''

''واؤ کون؟ ہماری چوہیا.....'' وہ حیرت سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''گویا وہ اب اس گھر کی استانی بن گئی ہے۔'' دلہن چچی کے ہاتھ سے پیالی چھوٹتے چھوٹتے بچی۔

''دلہن چچی ڈر گئیں اس کے نام سے۔'' اس نے پیالی پکڑ لی۔

''بیٹھئے ناں دلہن چچی۔'' وہ بیڈ سے اٹھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

''تم اب سائرہ کو اس طرح مت تنگ کیا کرو آج کل وہ بہت کرائسس سے گزر رہی ہے۔ اسے محبت اور اپنائیت کی سخت ضرورت ہے۔ جب سے ناصر کی شادی غیروں میں ہوئی ہے۔ ہم لوگ اس کا بہت خیال رکھتے ہیں۔'' چچی جان نے شہریار کو سمجھایا۔

''آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا امی کہ میں اسے تنگ کر رہا ہوں۔ میں اسے صرف احساس دلا رہا تھا کہ مجھے بچپن کی ساری چھیڑ چھاڑ یاد ہے۔''

''بائی دی وے امی! یہ ناصر کو ہوا کیا تھا؟'' وہ حیران سا ہو گیا۔

''ناصر کو کیا ہونا تھا۔ تمہاری بڑی اماں کو غیر اچھے لگے۔ ایسے بھاگے کہ بس کچھ نہ پوچھو اور اب افشاں ناکوں چنے چبوا رہی ہے۔'' چچی جان نے پیالی لے کر میز پر رکھ دی۔

''ویری سیڈ! امی اور اب خود ناصر بھائی کیسے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ ٹھیک ہی ہے، اوپر والے حصے میں شفٹ ہو گیا ہے۔ سنا ہے کہ وہ واپس امریکہ جانے کی فکر میں ہے۔ بیوی کا کچھ ویزے کا پرابلم ہے اسی لئے رکے ہیں ورنہ وہ تو چلا بھی گیا ہوتا۔''

''لیکن امی! ناصر بھائی تو ہمیشہ کے لئے آ گئے تھے اور ان کا کوئی ارادہ نہیں تھا وہاں جانے کا۔''

''لیکن اب بیوی چاہ رہی ہے تو......''

''کیا بیوی اتنی پاورفل ہوتی ہے امی؟'' وہ حیرانی سے پوچھ رہا تھا۔

''ہوتی ہیں لیکن سب نہیں۔'' وہ اٹھ کر کمرے سے باہر آ گئیں۔

''السلام علیکم دادی جان۔'' وہ تیار ہو کر دادی کی قدم بوسی کے لئے حاضر ہوا تھا۔

''جیتے رہو۔ کیسا شہزادہ لگ رہا ہے عالیہ کا چاند۔'' دادی جان کے لفظ چچی جان پر پھوار بن کر برسے کہ وہ رنگوں میں ڈوب گئیں۔

''اماں آپ چلیں گی؟'' وہ اندر آ گئیں۔

''تم سب جاؤ اور ہاں خالی ہاتھ نہیں۔'' دادی جان نے یاد دلایا۔

''سمجھ گئی اماں۔'' وہ ہنس پڑیں۔

''ہاں تو دادی جانو آپ نے کیا کہا شہزادہ لگ رہا ہوں۔ دادی جانی وہاں پر جہاں سے میں آ رہا ہوں ناں، وہاں ایسے ہزاروں شہزادے سڑکیں صاف کرتے نظر آتے ہیں۔''

''لیکن میرے بیٹے جیسا شہزادہ کہیں نہیں ہو سکتا۔''

''اٹھئے شہری بھائی آپ تو حضرت داغ ہیں جہاں بیٹھ گئے سو بیٹھ گئے۔'' وہ دروازے پر کھڑے ہو کر انتظار کر رہا تھا۔ اب بور ہو کر بولا تھا۔

''چلتا ہوں یار کیا کروں وقت کم اور محبت ڈھیری ہے۔ دادی جانی میں صرف پندرہ دن کے لئے آیا ہوں۔ جو کچھ آپ لوگوں کو کرنا ہے کر کرا دیجئے۔ مجھے وہاں امیگریشن کے مکمل پیپر جمع کرانے ہیں۔'' فون پر وہ تفصیلات تو بتا ہی چکا تھا۔ اس لئے اسی حوالے سے بات کی۔

''بس آج تمہاری اماں بات کریں گی تمہیں اختیار ہے کہ تم ایک نظر سحاب پر پھر ڈال لو۔ یہ تمہارے ابا اور چچا کی خواہش ہے۔''

''چھوڑیئے دادی! اب نظر وظر کو، آپ کے فیصلے کے آگے سر خم ہے۔ دیکھتا ہوں کہ امتحان کتنا باقی ہے؟''

''یہ تمہاری سعادت مندی ہے بیٹے اس سلسلے میں ناصر نے ہم لوگوں کو بہت مایوس کیا ہے۔'' دادی جان روہانسی ہو گئیں۔

''دادی! آپ رو رہی ہیں۔'' اس نے دوپٹہ چہرے سے ہٹایا۔

''کس بے رحمی سے ریکسہ نے میری بچی کے سر سے چادر اتاری ہے لیکن خوش تو وہ بھی نہیں ہے۔''

''آپ نے ناصر بھائی سے بات کی ہوتی۔''

''وہ ان دنوں تو ایسا ناصر کو چھپائے ہوئے تھی کہ چڑیا پر نہ مارے اور اب اپنی بیٹی بیاہنی ہے تو کیسی چوکھٹ کی دھول لے ڈالی۔''

''بات بہت سیریس تھی، آپ لوگ ناصر بھائی سے بات تو کرتے کہ آخر ایسی کیا کمی ہے ہماری سائرہ میں؟'' وہ بھی جذباتی ہو گیا۔

''جاؤ اپنی آنکھوں سے دیکھو، وہ تو عقل کی اندھی تھی۔ خواری تو تمہارے بڑے ابا کی ہوئی ہے۔''

''اور بڑے ابا؟''

''وہ کیا بولتا وہ تو ہے ہی بیوی کا غلام بزدل۔'' دادی کو غصہ آ گیا۔ نکلتے نکلتے بھی ایک بج گیا۔ گلریز بور ہو گیا تھا۔

''تھوڑی دیر کی بات ہے۔'' دلہن چچی کا کوئی کام رہ گیا تھا وہ اندر گئی تو چچی جان تیار ہو کر آ گئیں۔ جب سب بڑی اماں کے یہاں پہنچے تو وہاں دوپہر سے لے کر رات تک کا انتظام تھا۔ ناصر بھائی گھر پر ہی تھے۔ وہ باہر ہی ان سے بغل گیر ہو گیا۔

''کیسے ہیں آپ بڑے ابا۔'' بڑے ابا سے گلے لگ کر وہ دکھی سا ہو گیا۔

''بیٹے صحت ٹھیک نہیں رہتی۔'' اس وقت بھی وہ بہت کمزور نظر آ رہے۔

''شہریار بیٹے ادھر آؤ۔'' بڑی اماں نے پکارا۔

"اچھا بڑے ابا ابھی آتا ہوں۔" وہ مڑ کر بڑی اماں کی طرف آ گیا۔

"شہریار بھائی آپا سے ملے؟" عاصمہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"بھئی تمہاری آپا سے بھی مل ہی لیں گے۔"

"کوئی زیادہ فاصلہ نہیں ہے نظر تو اٹھایئے۔" رانی نے بھی لقمہ دیا۔

"ان سے ملو تمہاری افشاں بھابھی۔" اس کی نظر افشاں پر پڑی۔

"السلام علیکم۔" وہ جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

"کیسی ہیں آپ؟" اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

"ٹھیک ٹھاک ہوں اور کتنے عرصے رکنے کا خیال ہے؟"

"یہی کوئی دو ہفتے۔"

"بس دو ہفتے۔" وہ تعجب سے بولیں۔ سحاب ٹرے میں ٹھنڈے مشروبات رکھے ہوئے آئی تو گل ریز نے اشارہ کیا۔ "سحاب آپا۔" تو وہ مڑ کر دیکھنے لگا۔ بڑی اماں انجان بن کر اٹھ گئیں۔

"بھئی، وہ کیا چکر ہے۔ بے حد مصروفیات کا؟" اس کی شوخ نظر کا تصادم سحاب کو گلنار کر گیا۔

"بس ویسے ہی چھوٹے موٹے کردار کر لیتی ہوں۔" اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔

"لیجئے جناب ایسی بھی کیا انکساری۔ اچھا خاصا لوگ جانتے ہیں۔"

"سحاب آپا نے کئی ڈراموں میں کام کیا ہے اور اب تو سیریل چلنے والا ہے۔" رانی نے تفصیلات بتا دیں۔

"سحاب آپا امی بلا رہی ہیں، کھانا لگ گیا ہے۔" عاصمہ اطلاع دے کر چلی گئی تھی۔

"آیئے پلیز۔" سحاب بہت ہی آداب سے مخاطب تھی۔

"بڑی اماں آپ نے کچھ زیادہ تکلف نہیں کر لیا؟" اس نے پوری میز بھری ہوئی دیکھ کر کہا۔

"تمہاری بھابھی کے ہاتھ کے کھانے ہیں۔" انہوں نے بہو کی جھوٹی تعریف کی تو ناصر مسکرا کر رہ گئے۔ لیکن آج بہرحال یہ طے تھا کہ امی کے سامنے پردہ داری رکھی جائے اور گھر کے ماحول کو بھی ناگوار نہ ہونے دیا جائے۔ اسی لئے آج افشاں بھی ساس کے برابر میں آ کر بیٹھ گئی تھیں۔

"کیا بڑے ابا نے کھانا کھا لیا؟" وہ لقمہ اٹھاتے اٹھاتے چونک سا گیا۔

"کسی کو بھی ہوش نہیں کہ ان کا کھانا وہیں پہنچا دے۔" بڑی اماں جلدی سے اٹھ گئیں۔

"یہیں بلا لیجئے بڑے ابا کو۔" لیکن بڑی اماں جا چکی تھیں۔

"شہری بھائی کافی۔" عاصمہ کافی لے کر آئی تھی۔

"یہ لیجئے بیگم صاحبہ ڈبل کافی کا مگ۔" اس نے سحاب کو مگ تھما دیا۔

"شہری بھائی اب ہماری آپا اتنی ترقی کر گئیں کہ ہم کو یہ خود مہمان سی لگتی ہیں۔ تھوڑے دن کی بات ہے۔" عاصمہ یہ کہہ کر آپا کی طرف دیکھنے لگی۔

"اور ہماری سیریل کا کیا ہوگا؟" سحاب نے کافی کا مگ تھام لیا۔

"ہمیں بھی تو کچھ دکھاؤ، بس سن ہی سن رہے ہیں کہ سحاب نے یہ کر لیا وہ کر لیا۔ کل گل ریز بھی بہت چہک رہا تھا۔" اس کا تجسس بڑھ گیا۔

"بھائی! ہم نے تو کیسٹ تیار رکھا ہے یہ لیجئے۔" رانی نے وہیں بیٹھے بیٹھے ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی کو آن کر دیا۔

"شہریار بھائی! یہ تو آپا کا پہلا ایڈ ہے اس کے بعد بھی کئی میں آپا آئی ہیں اور یہ رہا آپا کا پہلا ڈراما۔" کسی گاؤں کی لڑکی کا کردار تھا جو باپ کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلا رہی تھی۔

"کیسا لگا شہری آپ کو؟" افشاں بھابھی اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔

"دیکھنے سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ سحاب اچھی خاصی ایڈوانس ہو گئی ہے۔" اس کی نظریں اسکرین پر اور ذہن کہیں اور تھا۔

"یہ دیکھئے۔" اتنے میں عاصمہ دوسرا کیسٹ لے آئی۔

"جو دیکھا ہے عصمی وہی کافی ہے، باقی تو دیکھنے کی گنجائش ہی نہیں رہی۔" اس کا ذہن اس وقت ماؤف سا ہو گیا تھا۔ سحاب کی صورت صرف ذہن کے کسی خانے میں گردش کر رہی تھی۔ چلتی ریل کی پٹری پر وہ آن کھڑا ہوا تھا، وہ تھکا تھکا سا گھر لوٹا تھا۔ اسی وقت وہ اپنے کمرے میں چلا آیا۔

"شہریار کچھ چپ چپ سا ہے۔" چچی جان یہ سوچ کر اس کے کمرے میں چلی آئیں۔ وہ یونہی خالی خالی نظروں سے چلتے ہوئے پنکھے کو تک رہا تھا۔ امی کو دیکھا تو اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"امی!" وہ کہہ کر رک گیا۔

"شہری کچھ کہنا چاہتے ہو؟" چچی جان بہت قریب آ گئیں۔

"امی! آپ لوگوں نے سحاب کو کیوں نہیں روکا، مجھے بیوی چاہئے کوئی آرٹسٹ نہیں۔ میں اس طرح کی آزاد لڑکی کا تصور بھی نہیں کر سکتا جس نے شادی سے پہلے ہی بیگم کا رول ادا کیا ہو۔ پلیز امی۔" وہ سر پکڑے بیٹھا تھا۔

"شہری، یہاں کے معاشرے میں بھی تبدیلی آئی ہے اور اب لڑکیاں ہر شعبے میں برابر کا حصہ چاہتی ہیں۔" چچی جان کے دل و دماغ دونوں گھوم گئے۔

"اس کے علاوہ بھی تو امی اور بہت سے شعبے ہوں گے۔ گورا رنگ اور ایڈ دانس کلچر تو وہاں بھی ہے لیکن امی مجھے تو اپنے گھر کے لئے ایک مشرقی لڑکی چاہئے تھی۔ جو وہاں رہ کر ہماری فیملی کو اور مجھے اس تہذیب، کلچر سے بچائے رکھے سحاب تو خود اس کلچر کا ایک حصہ ہے۔" اس کا چہرہ بالکل سفید ہو گیا تھا۔

"آپ بڑی اماں کو انکار کر دیجئے۔" وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔

"شہری، برسوں کا فاصلہ اتنی جلدی نہیں مٹے کرتے۔"

"میں صبح کا انتظار کر ہی نہیں سکتا امی اس لئے رات ختم ہونے سے پہلے میں نے ذہن سے یہ خیال ہی نکال دیا ہے۔" وہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ چچی جان سکتے میں بیٹھی رہ گئیں۔ ان کی نظروں کے سامنے نجانے کتنی افشاں آن کھڑی ہوئیں جو اکلوتے بیٹے کو جدا کرا کے لے گئیں۔ وہ تھکی تھکی سی اٹھیں تو یوں لگا جیسے برسوں کی بیمار ہیں۔

"شہری!" وہ پردہ اٹھا کر اندر آئی تو ٹھٹک سے رہ گئی۔ کمرے میں دھواں ہی دھواں تھا اور سگریٹ کی بو۔

"شہری!" وہ جلدی سے قریب آ گئی۔

"کیا ہوا؟" اس نے گھبرائی ہوئی ایک نظر ڈالی۔

"تم ابھی تک جاگ رہے ہو اور یہ سب کیا ہے؟" اس نے ایش ٹرے کی طرف اشارہ کیا۔

"سگریٹ۔" وہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"وہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں۔"

"سو واٹ؟" وہ آہستہ سے بولا۔

"تم یہ تحفہ لائے ہو۔ اگر چچا جان کو اس کا علم ہو گیا تو.....؟ اور خود تمہاری صحت کا کیا بنے گا؟" اس نے

جلتی ہوئی سگریٹ اس کی انگلیوں سے نکال لی۔

"میں جانتی ہوں تم کیوں اپ سیٹ ہو؟"

"کیا جانتی ہو تم؟" اس کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔

"آخر ایسا کیا ہوا ہے؟" وہ اس کی سرخ آنکھوں سے خائف سی ہو گئی تھی۔

"تم اس وقت تک کیوں جاگ رہی ہو؟" اس نے کلاک پر نظر ڈالی۔

"بچوں کے ٹیسٹ پیپر چیک کر رہی تھی۔ ابھی تو دیکھا تمہارے کمرے کی لائٹ جل رہی ہے۔ میں سمجھی شاید تم سو گئے ہو۔ سوچا لائٹ آف کر دوں۔" اس نے دوسری بار شہریار کو اتنا سنجیدہ دیکھا۔

"پلیز لائٹ آف کر دو اور جاؤ۔" وہ یہ کہہ کر لیٹ گیا۔ وہ حیران سی ایک منٹ کھڑی رہی پھر لائٹ بند کر کے چلی آئی تھی۔

☆☆

"کیا کہا یہ شہری کہہ رہا ہے۔ ہرگز نہیں جو بھابھی نے کہا ہے، وہ ہم لوگ نہیں کر سکتے۔ کہہ دینا اپنے برخوردار سے کہ وہ بے شک وہاں کرے لیکن یہاں ایسا کم از کم ہماری زندگی میں تو ممکن ہی نہیں ہے۔" چچا جان بے انتہا غصے میں آ گئے تھے۔

"باہر سے آ کر دماغ خراب ہو گیا۔ اگر گھر کی بچیوں کو ہم نہیں دیکھیں گے تو کون آ کر پوچھے گا؟" چھوٹے چچا برہم ہو رہے تھے۔

"اماں آپ ہی کچھ سمجھائیں شہری کو۔" چچی جان کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

"تو اسے بھی غیروں کی ہوا لگ گئی۔ بس دلہن! ناصر کی دلہن جیسے حسن سلوک کے لئے تیار رہو۔"

"اللہ نہ کرے اماں!" ان کا دل ہولنے لگا۔

"صاحب زادے کے لچھن تو یہی ہیں۔" دادی جان دل برداشتہ تھیں۔

"اگر کسی میں اتنی ہمت نہیں ہے تو میں بڑی اماں سے بات کرتا ہوں۔" دلہن چچی سے وہ ناراض ہو گیا۔

"یہ بات نہیں ہے۔"

"تو پھر کیا ہے کہہ دو نا کہ مجھے صرف بیوی چاہئے ڈرامے کی فنکارہ نہیں۔ مجھے یہاں کی تہذیب سے محبت ہے۔ یہاں کے کلچر میں، آنے والی زندگیوں کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ میرا کوئی ارادہ نہیں ہے پاکستان

آنے کا چچی۔ میں وہیں اپنی، دنیا، اپنا گھر، اپنا کلچر آباد کروں گا اور یہ میری بدنصیبی ہے۔ سحاب میرے بچوں کو اور مجھے کیا تہذیب، دے سکے گی؟ باپ گھر میں بیمار ہے، وہ اپنے فن کی آبیاری میں لگی ہوئی ہے۔ کیا دنیا میں اس کے علاوہ کوئی اور جاب نہیں تھی۔ یہ سب بڑی اماں کی کمزوری کا نتیجہ ہے۔ آپ لوگ بھی روک سکتے تھے۔'' وہ غصے میں آگ بگولہ سا ہو رہا تھا۔

''ٹھیک ہے یہ سلسلہ میں خود ہی ختم کرتا ہوں۔'' اس نے نمبر ڈائل کیا۔ لائن پر بڑی اماں ہی تھیں۔

''جی بڑی اماں میں شہریار۔'' اس کی آواز ٹھہر گئی تھی۔ جواب میں وہ صدقے واری ہونے لگیں۔

''بڑی اماں آپ سے ایک بات کہنی تھی۔'' وہ ریسیور تھام کر دیوار سے ٹک کر کھڑا ہو گیا۔

''دراصل بات یہ ہے بڑی اماں میں سحاب کے معیار پر پورا اترتا ہوں یا نہیں لیکن وہ میرے معیار اور آئیڈیل سے بالکل مختلف ہو گئی ہے۔ آیا تو اسی خیال سے تھا کہ میں اپنے گھر والوں کی پسند کو اولیت دوں گا لیکن اب میرا ارادہ بدل گیا ہے۔ میں اپنی پسند کو اہمیت دوں گا۔ یقیناً یہ بات بڑے ابا اور آپ کے لئے تکلیف کا باعث ہو گی لیکن یہ اب ممکن نہیں رہا کہ سحاب میری زندگی کا حصہ بنے۔'' اس کے دل کے اندر جو طغیانی تھی اس میں ٹھہراؤ آ گیا۔ بڑی اماں پتھر کی بن گئیں۔

''تم سب سائرہ کا انتقام لے رہے ہو؟'' بڑی اماں کی آواز پاتال سے آئی تھی۔

''تم جیسے تو اس کے جوتے اٹھاتے ہیں، تم ہو کیا چیز؟ کہہ دینا اماں اور دادی سے۔ کہاں گئی وہ شرافت خاندانی طرہ کہ جو بات آپس کی رشتہ داریوں میں ہے وہ غیروں میں نہیں۔'' وہ اس وقت انگاروں پہ جل رہی تھیں۔ اس نے فون رکھ دیا۔ دلہن چچی کا رنگ اسی وقت پیلا پڑ گیا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر اماں کے کمرے میں چلی گئیں۔

''شہری بھائی...... شہری بھائی...... آپ کو دادی بلا رہی ہیں۔'' فرح کودتی ہوئی اندر آئی تھی۔

''دادی جان وہ اپنے کمرے میں ہی نہیں ہیں۔'' وہ دوبارہ ان کے پاس گئی۔

''شہری کہاں گیا ہے؟'' سب لوگ گھبرا گئے۔ چچی جان کے دل میں ہول اٹھنے لگے۔ چچا جان نے جلدی سے اس کی الماری میں پاسپورٹ چیک کیا۔

''ہو گا یہیں کہیں، اس کی چیزیں سب رکھی ہوئی ہیں۔'' وہ مطمئن ہو کر چلے گئے۔

''میں دیکھتا ہوں بڑی چچی آپ پریشان نہ ہوں۔'' گلریز چابی لے کر نکلا اور سیدھا قریبی جھیل کی طرف چلا آیا۔

''شہری بھائی۔'' وہ بری طرح چونک گیا وہ جھیل میں مچھلیوں کو پاپ کارن ایک ایک کر کے پھینک رہا تھا۔

''آپ یہاں بیٹھے مچھلیوں اور مرغابیوں سے دل بہلا رہے ہیں، وہاں آپ کی ڈھنڈیا پڑی ہے۔''

گلریز ہنس کر بیٹھ گیا۔

''چلئے اٹھئے پاپ کارن ختم ہو گئے۔'' وہ کھڑا ہو گیا۔

''وہاں کہاں؟'' وہ چونک گیا۔

''ڈھائی بج رہے ہیں اس وقت میں بجیا کو پک کرتا ہوں ورنہ گھر آتے آتے تین بج جاتے ہیں۔'' اس نے کار اسکول کی باؤنڈری کے قریب پارک کر دی۔

''بس آتی ہوں گی دس منٹ بعد۔'' وہ انتظار کرنے لگا۔

''شہریار بھائی، میں آپ سے پورا پورا اتفاق کرتا ہوں لیکن میں کچھ کر نہیں سکتا اور اب اتنا چھوٹا بھی نہیں ہوں۔ بی ایس سی کے فائنل میں ہوں۔'' اس نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''مشکل تو یہی ہے کہ کوئی بات ہی نہیں سمجھ رہا۔''

''کچھ وقت لگے گا۔''

''لیکن، ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہو گا سمجھنے اور نہ سمجھنے کے لئے ایک بات ہی کافی ہوتی ہے۔ یو انڈر اسٹینڈ!''

''میں چار دن سے آپ کی فیلنگ محسوس کر رہا ہوں۔'' اس نے انہیں احساس دلایا۔

''کیا سائرہ کے دل میں ذرا سی گنجائش نہیں، کوئی صورت گر ایسی ہو۔''

''گنجائش...... دلوں میں تو ہے لیکن آپ ان کی طرف سے امید نہ رکھئے گا۔'' وہ دبی دبی مسکراہٹ لئے انہیں دیکھنے لگا۔

''برملا میں دادی جان سے اس کا اظہار کروں گا رزلٹ خواہ کچھ بھی ہو میرا ضمیر تو مطمئن رہے گا۔ میں کیسے اسے یوں چھوڑ دوں۔ شی از ڈپریسڈ۔'' اس کی آواز میں محبت کی گہرائی تھی۔

''بجیا آ رہی ہیں۔'' اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور قریب لے گیا۔

''بھائی دروازہ۔'' سائرہ نے شہریار کی طرف والے ڈور کی طرف دیکھا تو وہ نجانے کسی خیال سے چونک گیا اور جلدی سے اتر کر اس نے دروازہ کھولا۔

''شہریار تم؟'' وہ قریب آچکی تھی۔

''کیا ہوا جناب کے چہرے پر بارہ اور گلریز کیوں کھلے جا رہے ہو؟'' اس کا چہرہ دھوپ کی تمازت سے اس وقت بھیگ رہا تھا۔

''بات ہی کچھ ایسی ہے بجیا کہ دونوں کا ردعمل آپ کے سامنے ہے۔''

''خیر شہریار کا ردعمل تو جان سکتی ہوں کل سے جب سے بڑی اماں کے گھر سے آئے ہیں جلدی سو گئے۔ رات بھی کچھ بے چین سے تھے۔''

''بجیا! آپ کو کچھ خبر نہیں، یہاں قیامت گزر چکی ہے۔'' وہ مسکرایا۔

''مجھے اس قیامت کا اندازہ تھا اسی لئے میں نے اس بے وقوف لڑکی کو سمجھایا تھا کہ جو ہے اسے تم اپنے شوق کی حد تک رکھو۔ کیا ضروری ہے کہ شوق کو بڑھایا جائے؟''

☆☆

''کیا کہا آپ نے چچی جان؟'' اس کا لقمہ حلق میں اٹک گیا۔

''جو تم نے سنا ہے۔'' ان کا اداس چہرہ کھلی کتاب کی طرح تھا۔

''خود شہری نے فون پر بڑی اماں سے بات کی؟'' اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

''اس کے بعد سے وہ چپ چپ ہے پھر اٹھ کر نجانے کہاں چلا گیا۔ ابھی گلریز تمہارے ہی ساتھ تو لے کر آیا ہے۔ رات اماں بات کریں گی۔ بڑی ضدی طبیعت ہے۔'' وہ روہانسی ہو گئیں۔ رات کھانے کی میز پر وہ کسی سے بھی آنکھ نہ ملا سکا۔ بس یونہی اٹھ کر آ گیا۔ سب ہی لوگ سوگوار سے تھے۔ ناصر کے بعد آج دوسری بار چچا جان اداس دکھائی دیئے۔ وہ رات کافی دیر سوچتا رہا۔ پھر اٹھ کر خود ہی دادی کے پاس چلا آیا۔

''دادی!'' وہ ان کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

''شاباش بیٹا تم نے بھی ناصر بن کر دکھا دیا۔'' ان کی آواز دب گئی۔

''دادی صاحب میرا آئیڈیل کبھی نہیں تھی لیکن آپ نے جو فیصلہ کیا میں نے سر جھکا دیا وہ اب اتنی دور فاصلے پر کھڑی نظر آتی ہے کہ میں خود کو دھوکا نہیں دے سکتا۔''

''تو کیا کوئی گوری چمڑی والی میم پسند آ گئی ہے؟''

''اگر پسند ہوتی تو لے کر آتا جب خالی ہاتھ آیا ہوں تو یہ بات جان لیجئے کہ میں آپ لوگوں کی رضا کو

اولیت دوں گا۔''

''اولیت کا بچے اور کون سا مقام آئے گا؟'' انہوں نے گہرا سانس لیا۔

''جو چیز مجھے نظر آتی ہے، وہ آپ لوگوں کو کیوں نظر نہیں آتی۔ آپ ظاہری روپ کو اولیت دیتی ہیں میں ظاہر سے متاثر نہیں میں جو کہنا چاہتا ہوں وہ آپ کیوں نہیں محسوس کرتیں؟ کیا ضروری ہے سحاب ہی ہمارا مقدر بنے کیا کوئی اور لڑکی آپ کے معیار پر پوری نہیں اترتی؟'' وہ جذباتی ہو گیا۔

''کیوں نہیں؟ تو جس پر ہاتھ رکھ دے، تیری ماں راضی مگر ہم یہی چاہتے ہیں کہ جو بھی ہو وہ ہمارے خاندان کی ہو۔'' دادی کی اس بات پر، وہ کچھ بے چین سا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے گھنگھریالے بال ماتھے پر آ گئے تھے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے بالوں کو کنگھا کرنے لگا۔ ننھے ننھے پسینے کے قطرے ماتھے پر پھوٹ نکلے۔ گہری شلوار قمیض میں بہت سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ مدھم مدھم روشنی میں پوری کائنات اس کے اردگرد گھوم رہی تھی۔

''دادی جان!'' ان کے، وہ قدموں میں بیٹھ گیا اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔

''دادی آپ سائرہ کو کیوں نظرانداز کر رہی ہیں؟ کیا وہ ہمارے خاندان کا حصہ نہیں؟'' اس کے دل کا غبار بہت شدت سے نکلا اور دادی کے گھٹنوں پر ہاتھ کی گرفت اور سخت ہو گئی۔ دادی جان نے جلدی سے چشمہ لگا کر اسے دیکھا۔

''شہری تم۔'' ان کی آواز میں بے یقینی کی کیفیت تھی تو اس نے جواب میں سر ہلا دیا۔

کہاں اتنی سوگواری تھی کہ گھر کا ہر فرد چپ چپ گھوم رہا تھا کہ اچانک ماحول میں بسنت بہار چھا گئی۔

''کیا کہا دادی جان آپ نے مجھ سے؟'' اس کے تو وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں تھی۔

''ہے کہاں شہریار؟'' اس کے وجود میں ایک گرم لہر دوڑ گئی۔

''اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔'' دادی جان کے لبوں پر آخر بات آ ہی گئی۔

''کیسی باتیں کرتی ہیں آپ؟'' وہ اٹھ کر سیدھی اس کے کمرے میں چلی آئی۔

''شہری!'' اس نے زور سے دروازے کا لاک گھمایا کہ اس کی آنکھ کھل گئی، کمرے میں ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔

اس نے پردہ زور سے کھینچا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا عین توقع کے مطابق وہی تھی۔

''میری ذات کو حوالہ بنائے بغیر تمہیں اجازت ہے جو چاہو کرو، مجھے انوالو مت کرو، اپنی حماقتوں کو اگر خود

تک محدود رکھو تو مناسب ہوگا۔" وہ غصہ میں آ گئی۔

"تم اسے میری حماقت کہتی ہو؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"اور نہیں تو کیا کبھی تم نے یہ سوچا کہ تمہاری ضد سے مجھے کتنا دکھ پہنچے گا۔ میں تم سے بڑی ہوں۔"

"صرف دو ماہ اور دس دن۔" وہ یوں بے نیازی سے بیٹھا تھا گویا اسے کوئی پرواہ یا اس کے غصے کا اثر ہی نہ ہو۔

"دیکھو شہری ہمارے اور تمہارے درمیان بہرحال ایک فاصلہ ہے۔"

"یہ شرعی فاصلہ تو نہیں ہے۔"

"کس نے کہا ہے لیکن شعور کی تہوں میں پڑی اس بات کو کیا ہم اور تم جھٹلا سکیں گے؟"

"میری ذات کا حوالہ مت دو تم مجھے نہیں جانتیں۔"

"پلیز یہ مذاق نہیں ہے۔ سنجیدگی سے اس کے بارے میں سوچنا چاہئے۔"

"جو سوچنا تھا وہ میں سوچ چکا اب باری تمہاری ہے۔"

"یہ گڈے اور گڑیوں کے کھیل کی بات نہیں شہری یہ زندگی کے نہ ختم ہونے والے سفر کی بات ہے۔"

"مجھے سفر میں تمہارے ساتھ کے علاوہ کچھ نہیں چاہئے۔"

"میں تہی دامن ہوں اس لئے زادِ سفر مانگ رہے ہو یہی بات ہے ناں کہ میں یتیم ہوں تمہیں رحم اور ہمدردی نے آن گھیرا ہے۔"

"جی نہیں یہ صرف تمہاری سوچ ہے۔"

"تم جانتے ہی نہیں کہ کیا سے کیا ہو سکتا ہے؟"

"جو میں نہیں سمجھ سکا تو اسے تم سمجھا دو۔"

"یہی کہ تمہارا خیال ایک خوبصورت جملے کے علاوہ کچھ نہیں۔"

"آزما کر صداقت کی پہچان کر لو۔"

"مجھے اس کی ضرورت نہیں۔"

"لیکن مجھے تو ہے۔"

"یکطرفہ خیالات ہمیشہ تکلیف کا باعث بنتے ہیں۔"

"محبتوں میں یہی ہوتا ہے۔"

"جی نہیں دوسرے کے احساسات کا بھی دخل ہوتا ہے۔"

"کمال ہے ایک انسان باہوش وحواس محبت کا ذکر کرے تو یقین نہیں آتا۔"

"خوشبو کا کوئی رنگ اور وجود کہاں سے لاؤں

محبت تو خود ایک نرم خوشبو کا جھونکا

تھوڑی دیر میں اڑ جانے والے جذبہ کی کتھا کہانی۔ تم جس کو محبت کہتے ہو نا شہری وہ تمہارے یہاں پائے ہیلو کہنے کا ایک وقفہ ہے۔"

"فیصلہ دادی کی کورٹ میں ہوگا۔"

"اب وہ کورٹ نہیں کہ دادی ہر چیز مجھ سے چھین کر تمہارے ہاتھ میں تھما دیں گی۔ میرا ابھی کوئی فیصلہ ہوگا اور اسے تسلیم کرنا پڑے گا۔ میں کل والی سائرہ نہیں۔"

"یہ بڑا مشکل ہے دستانی جی۔" وہ ذرہ بھر مایوس نہیں تھا۔

"پلیز شہری اگر یہ شرارت ہے تو جا کر ابھی ابھی دادی جان اور چچا کو بتا دو، کیوں تم مجھے گستاخی کا راستہ دکھا رہے ہو۔"

"کوئی کسی کو راستہ نہیں دکھاتا، راستے خود چل کر آ جاتے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے کہ میں تم سے بحث میں ہار جاؤں گی۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو اور یہ آخری شرارت دائمی ہو۔"

"اوہ! ممکن ہی نہیں تم نے کبھی بڑی اماں اور بڑے ابا کا خیال کیا؟ کیا یہ خود غرضی نہیں کہ برسوں کے ناتے اور رشتوں کو یوں ختم کر دیا جائے، قربانی دینے والے خود غرض نہیں ہوتے۔"

"وہ اس چیز کو تم سے اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"لیکن افسوس ہے کہ تم نہیں جانتے صرف ہمدردی غالب ہے اور کچھ نہیں، نہ میں لنگڑی ہوں اور نہ جاہل اور کسی پر بوجھ بھی نہیں۔ اپنی ہمدردیاں یہاں سے سمیٹ کر لے جاؤ۔"

"میں قطرہ قطرہ محبت کے موتی لٹا کر جاؤں گا۔"

"محبتوں کے یہ موتی میری زندگی میں کبھی نہیں برسے۔"

"برسے تھے تم نے محسوس ہی نہیں کیا یہ ضروری تھا کہ جذبوں کی پھوار تمہارے آنچل میں گرتی۔"

"نظر تو آتی۔"

"اگر احساسات نہ ہوں تو بصیرت بھی بے کار ہوتی ہے۔" وہ کرب سے اس بار کھڑا ہو گیا۔

"ناصر کی بے انصافی نے شاید مجھے آج بہت قریب کر دیا ہے۔"

"پتہ نہیں تم نے یہ احساسات بے خبری میں کہاں سے چن لئے؟"

"اتنی بے خبر تو تم بھی نہیں تھیں انجان بنتے بھی تمہاری آنکھیں کیوں اس دن چھلک پڑی تھیں؟ اور مجھے تمہاری اور ناصر بھائی کی انگیجمنٹ کے دن اتنا اہم اور خاص کام لاہور میں کیوں پڑ گیا تھا۔ میں نے خود کو اس دن شکست خوردہ سمجھ لیا تھا لیکن اب یہ میرے اختیار سے باہر ہے سحاب وادی کی خوشی تھی سو میں چپ ہو گیا لیکن آج میں اپنے لئے خود غرض ہوں آئی لو یو سائرہ!"

"پلیز شہری ایسی باتیں مت کرو، سحاب مجھ سے کہیں بہتر ہے۔"

"سائرہ میں ریزہ ریزہ ہو گیا تھا میں نے تمام عمر دیار غیر میں ہی گزارنے کا عہد کر لیا اور تمہیں خبر نہ ہوئی بولو سائرہ۔ ناصر کی شادی کی خبر ملی تو میں تڑپ کر آ گیا۔ کس کے لئے؟ پھر بھی احساسات کی کوئی شکل، کوئی صورت درکار ہے؟"

"پلیز شہری میں بڑے ابا اور بڑی اماں سے نظریں نہیں ملا سکوں گی۔"

"چاہے میں ٹوٹ کر بکھر جاؤں۔" اس کی آنکھوں میں سرخی اتر آئی۔

"بس بات ختم ہو گئی۔" وہ مڑی۔

"بات اب شروع ہوئی ہے۔" اس نے ہاتھ پکڑ لیا۔

"میں کہتی ہوں ہاتھ چھوڑو شہری!" اس نے مزاحمت کی۔

"غور سے سن لو اگر تم مجھے نہیں ملیں تو میں خود کو تباہ کر لوں گا۔" اس نے جھٹکے سے ہاتھ چھوڑ دیا۔

"کیسی پاگلوں جیسی حرکت کرتے ہو۔" وہ اپنی کلائی پکڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

کوئی بھی اس کا طرف دار نہیں تھا ہر طرف سے فیصلہ شہریار کے حق میں ہوا جو گھر میں بھوک ہڑتال کئے ہوئے کمرے میں بند تھا۔

"آ گئے! پڑ گئی دل میں ٹھنڈک! ہو گیا فیصلہ!" بڑی اماں نے بڑے ابا کی خوب خبر لی۔

"ہاں فیصلہ کرنا مشکل تھا، سائرہ مختلف بچی ہے، بہت زیادہ حساس ہے، اسے تم سب کی طرف سے

شرمندگی کے احساس نے روک کے رکھا تھا۔ رو رو کر وہ ہلکان تھی کہ میں اتنی خود غرض نہیں ہوں۔" بڑے ابا ابھی تک دکھی سے تھے۔

"یہ بھی کوئی ڈراما ہو گا تمہارے گھر والوں کا۔" بڑی اماں چیخ کر بولیں۔

"فیصلہ جو اس کے نصیب کا تھا اس کے اختیار میں میری اہمیت یوں بھی تھی کہ بدر بھائی نے اسے مجھے سونپا تھا، وہ میری ذمہ داری تھی، یہ الگ بات ہے کہ میں چاہتے ہوئے بھی اسے گھر میں نہ رکھ سکا۔" وہ تھکے ہوئے لگ رہے تھے۔

"تو گویا تم آخری مہر لگا رہے ہو۔" وہ تڑپ کر بولیں۔

"بس کچھ یونہی ہوا۔" بڑے ابا نے ان کے کانوں میں بم بلاسٹ کیا۔

"شرم کرو تم کیسے باپ ہو کہ اپنی بیٹی کے لئے تم احتجاج نہ کر سکے۔"

"جب میں اپنے گھر میں اس کے لئے احتجاج نہ کر سکا تو وہاں اپنی بیٹی کے لئے کیسے کر سکتا تھا۔"

"تم نے ہمیشہ اپنے بچوں پر اسے فوقیت دی آج اس کا کھل کر ثبوت دے آئے۔"

"کبھی کبھی ربیعہ بیگم ایسا ہی ہوتا ہے۔ تم نے جو فصل بوئی شاید اس کے پھل صبر شکر کرنے والوں کے دامن میں ایسے ہی گرتے ہیں۔" بڑے ابا نے باہر جانے کے لئے شیروانی دوبارہ پہن لی، بڑی اماں بے بسی سے رونے لگیں۔

☆☆

"کتنی خوبصورت رات ہے۔" اس نے مہندی اور کھنکتی چوڑیوں والا نازک سا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ابھی تک بے یقینی کی کیفیت میں ہوں کچھ تو بولو۔" اس نے سرخ ہتھیلی پر اپنے گرم ہونٹ رکھ دیئے صندل جیسی خوشبو روح تک اتر گئی۔ وہ تھوڑا اور سمٹ گئی۔

"ناراض ہو؟" اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

"مجھے معلوم ہے میں نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے، اس کا مجھے دکھ ہے لیکن خوشی اس بات کی ہے کہ تم میری دسترس میں ہو دل کے بہت قریب۔" اس نے حنائی ہاتھ اپنے دل کے پاس کر لیا۔ شرم سے اس کے چہرے پر گلال کھلنے لگا۔

"آج کی شب تو چاند تاروں سے روشنی مانگ لائی ہے اور تم ہو کہ یہ سرخ جھلمل کرتا لباس پہن کر گونگی بنی

بیٹھی ہو، میں کہتا ہوں کیا کوئی آواز سنائی دی تمہیں؟" وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے بند آنکھوں کو کھول دیا۔

"صبح ہونے میں صرف چار گھنٹے باقی ہیں۔ کل اس پہر میں بہت دور چلا جاؤں گا۔" اس نے آہستہ سے حنائی ہاتھ چھوڑ دیا۔

"اتنی جلدی بھی کیا ہے؟" عورت کی ازلی سرشت بیدار ہو گئی۔ سرخ گھونگھٹ سر سے سرک گیا۔

"ایک خلش ہے، جو دل میں شام سے چبھ رہی ہے۔" وہ خاموش ہو گیا تھا۔

"پچھتانے کی تمہیں عادت ہے۔" مانگ کی افشاں بالوں میں اتر آئی تھی۔ جب اس نے تھوڑا سا جھکا ہوا سر اٹھایا۔

"سائرہ کیا سچ تمہیں مجھ سے محبت نہیں تھی؟" اس نے آہستہ سے اس کے ماتھے کی بندیا کو یوں چھوا گویا آبگینہ ہے۔ ٹوٹ جائے گا۔

"شہری اب کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" اس کی آنکھوں میں کاجل بہنے لگا۔

"بس یہی کہ کہیں یہ صرف میرا ہی یکطرفہ خیال نہ ہو۔" وہ اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

"جو بھی ہو، وہ تو ہو چکا اب اس طرح......" اس کے ہونٹوں پر شریر لالی پھیل گئی۔

"شکر خدا کا کہ تم مسکرائیں، میں تو تمہاری خاموشی سے ڈر گیا تھا۔" اس کا لہجہ دوبارہ شوخ ہو گیا۔

"اب تو تمہیں یقین آ گیا میری باتوں کا، میں نے کہا تھا ناں اگر عمر بھر کے ساتھی کے انتخاب میں میری پسند کو شامل کیا گیا تو میں تم جیسی ہی لڑکی کو پسند کروں گا کتنا بزدل تھا کہ یہ بھی نہ کہہ سکا کہ میں تمہارا انتخاب کروں گا۔" وہ ہنسا۔

"لیکن وہ ساری بزدلی کیا ہوئی؟ تم نے تو گھر میں مجھے تماشا بنا کر رکھ دیا۔ کیا ضرورت تھی اس بھوک ہڑتال کی؟ شرم سے میں نے ابھی تک چچی جان کی طرف دیکھا نہیں۔" اس کے چہرے پر حیا کی سرخی پھیل گئی۔

"میں تمہیں دوبارہ کھونا نہیں چاہتا تھا۔" اس کی آنکھوں میں شوخی مچلنے لگی۔

"سائرہ!" اس نے سرگوشی کی۔

"جی!" اس نے جھکی جھکی نظروں سے دیکھا جس میں ہر وعدے کا اقرار تھا۔

"تم میری محبت ہو!"

آہستہ آہستہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ اماں کے جہلم کا انتظار تھا۔ مہمان بھی سب رخصت ہو گئے۔ اب کل سنبل بھی چلی جائیگی۔

ہر طرف خاموشی اور اداسی کا ڈیرہ ہو گا۔ آج کل کالج بھی بند ہے۔ میں اتنے طویل عرصے کیا کروں گی؟ کس طرح رہوں گی؟ کیسے کہوں گی سنبل رک جاؤ۔ اگر میں کچھ کہوں گی تو فٹ جواب ہو گا شادی کر لو۔" وہ مسکرائی اور تیز شاور اس نے کھول دیا۔

سارا تن بھیگ گیا لیکن من سوکھا رہا۔ من کی پیاس من کی آگ برکھا رت نہ بجھائے تو یہ پانی سی جو گرے اور بہہ جائے۔ تن من دونوں سوکھے۔ نین بھیگے نہ تن بھیگے۔ بس دونوں برکھا رت میں جل جائیں۔ ریزہ ریزہ ہو کر خوابوں کے رنگ جلتے رہیں۔ تیز بارش کی بوندیں اتنی طاقت ور کب ہیں کہ من کی سوکھی کھیتی کو سیراب کریں یہ تو آگ کی طرح اور من کو الاؤ بنائیں۔

"کنول! بہت دیر ہو گئی اب باہر آ بھی جاؤ۔" سنبل نے دروازہ دھڑ دھڑ پیٹا۔ شور رک گیا۔

"بس آ رہی ہوں سنبل!" کنول کی آواز میں واپسی کی تھکن کا احساس تھا۔ وہ باتھ روم سے باہر آ گئی۔

گلابی رنگ کا کاٹن کا سوٹ زیب تن کر کے جب اس نے بڑے سے آئینے میں خود کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں مسلسل نہانے کی وجہ سے کپڑوں کے ہم رنگ ہو رہی تھی۔

کنول کی عمر اٹھائیس سال تھی۔ لیکن روپ آج بھی جوبن پر تھا۔ سیاہ لمبے بال اور سفید رنگت، وتی کلیوں جیسے سفید دانت جواب کھلکھلا کر نہیں ہنستے تھے۔ صرف مسکراتے تھے۔

عجیب سی پرکشش شخصیت تھی کہ ہر کوئی اس عمر کے باوجود اس کے حسن کو دیکھتا رہتا تھا۔ اس کے وجود سے ہمیشہ باسی پھولوں کی مہک آتی تھی یوں لگتا تھا رات وہ پھولوں کی سیج پر سوتی ہے۔ یا ڈھیروں گجرے اس کے وجود سے لپٹے تھے۔

بس ایک خاص مہک تھی جس کا احساس ہر کوئی کرتا تھا اور یہی احساس اماں کو ہمیشہ خوفزدہ رکھتا کہ اس کے وجود سے ابھی تک پھولوں کی مہک کیوں نہیں گئی۔

کنول کے سیاہ بالوں سے ننھے ننھے پانی کے قطرے گر رہے تھے۔ وہ بالوں کو بل دیتی ہوئی لان میں سنبل کے برابر آ کر بیٹھ گئی۔ کرسی کو اس نے تھوڑا اور سنبل کے قریب گھسیٹ لیا۔

''کیا ہے؟ اتنی دیر تو نہیں ہو گئی تھی۔ تم نے آوازیں دینا شروع کر دیں۔'' سنبل کی دھڑ دھڑ آوازوں کا جواب اس نے آتے ہی دیا۔

''مجھے سناٹوں سے خوف آتا ہے۔'' سنبل کی نظریں وسیع ترین لان تک اٹھیں۔

''کبھی تم نے میری طرف بھی دیکھا ہے۔ میں کیسے رہوں گی؟'' اس نے اپنے دل کے سناٹوں کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ سناٹے تم نے خود اپنے اردگرد ڈال رکھے ہیں۔''

''ہر بار تم لوگ مجھے ہی قصوروار ٹھہراؤ گی۔'' کنول نے بہن سے شکوہ کیا۔

''کیوں نہیں۔ تم بابر کی بات مان لو گی۔'' سنبل نے ڈرتے ڈرتے دل کی بات کی۔

''پھر وہی پرانا قصہ۔'' کنول نے سنبل کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔

سنبل نے گھبرا کر کیتلی سے چائے کپ میں ڈالی۔

''کیا ہوا۔ تم ڈر گئیں۔'' کنول نے اپنی گلابی آنکھیں شرارت سے کھول کر مسکرا کر دیکھا۔

سنبل نظریں چرائے رہی۔

''میری پیاری سی جڑواں بہن۔ یہ تم سب کی تو ہم پرستی ہے کہ جب میری آنکھیں لال ہوتی ہیں تو اپنے ماضی کی طرف پلٹ جاتی ہوں۔ کیسے بتاؤں بہنا اماں کو بتا نہیں سکتی تھی۔ لیکن جب دیر تک شاور لیتی رہتی ہوں تو آنکھیں بھیگتی رہتی ہیں۔ میں اس عشق میں جلتی رہتی ہوں جو مجھ سے روٹھ گیا ہے۔''

''اور عبداللہ۔'' وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی تھی۔

''وہ سب۔'' سنبل کہتے کہتے رک گئی۔

''کہو ناں۔ رک کیوں گئیں۔ بالکل اماں کے انداز میں بولو وہ سب ایک پل کا خواب تھا۔ اس میں کوئی بھی حقیقت نہیں تھی۔ ایسے حادثات اس عمر میں ہوتے ہی رہتے ہیں۔''

کنول خاموش ہو گئی۔ اس نے چائے کا کپ بھی ختم کر لیا لیکن سنبل نے نظریں نہ اٹھائیں۔ وہ ہلکے ہلکے سپ لیتی رہی۔

''تم خود نفسیات میں ماسٹر ڈگری ہولڈر ہو اور ابھی تک تم اسی خواب کے دائرے میں بند ہو۔'' سنبل نے اسے حقیقت کا احساس دلایا۔ کنول کا دل دھک سے ہوا پھر وہ بولی۔

''میری پیاری بہنا! جوں جوں وقت گزر رہا ہے۔ میں واپس دائرے کے اندر قید ہو رہی ہوں دراصل اماں نفسیاتی مریض تھیں۔ ان کا بھی قصور نہیں تھا۔ پھوپھو کے ماحول نے انھیں بھی متاثر کر رکھا تھا۔'' کنول نے اماں کے نفسیاتی مرض کی مکمل نشاندہی کی۔

''چلو چھٹی ہوئی۔ گویا اماں نفسیاتی مرض کے دباؤ میں تھیں۔'' سنبل نے حیرت سے بہن کو دیکھا۔

''آف کورس۔'' کنول نے بہت گہری نظروں سے دیکھا کہ سنبل ہنس پڑی۔

''تم ٹھیک ہی کہتی ہو کہ یہ سارا فساد پھوپھو کا ہی پھیلایا ہوا تھا۔ جس آگ میں وہ خود جل رہی تھیں۔ اسی میں انھوں نے تمھیں بھی جلا ڈالا۔'' سنبل کا دکھ سے لہجہ بوجھل تھا۔

''مغفرت کی دعا کی بجائے تم لوگ ابھی تک پھوپھو کو موردِ الزام ٹھہراتے ہو۔'' کنول نے سنبل سے شکوہ کیا۔

''زندوں کی مغفرت کی کون دعا کرے؟'' بے دھیانی میں سنبل کے منہ سے نکل ہی گیا۔

''کیا؟ پھوپھو زندہ ہیں؟'' وہ حیرت سے جاگ اٹھی۔ سنبل پشیمان ہو رہی تھی کہ یہ اس نے کیا کہہ دیا۔

''سچ سنبل!'' وہ خوشی سے بے تاب تھی۔

''ہاں پھوپھو زندہ ہیں۔ اماں نے تمھاری وجہ سے چھپائے رکھا۔'' سنبل نے سچ کا اعتراف کیا۔

''لیکن کیوں؟''

''اسی لئے کہ کہیں تم پھوپھو کے پاس نہ چلی جاؤ۔''

''لیکن مجھے جانے سے کون روک سکے گا؟''

''تو یہی ہوا ناں جس کا اماں کو ڈر تھا۔'' سنبل کنول کے سامنے پریشان سی بیٹھی تھی۔

''لیکن یہ بھی تو دیکھو، کتنا بڑا ظلم ان کے ساتھ ہوا ہے کہ وہ زندہ ہیں۔ ہم لوگ یہ سمجھتے رہے کہ وہ ہنگاموں میں کہیں مر کھپ گئیں اور اماں کو دیکھو یہ راز سینے میں لئے چلی گئیں۔ لیکن آخری وقت تک یہ

نہ بولیں کہ پھوپھو زندہ ہیں۔'' کنول نے شکوہ کیا۔

''تمہاری محبت میں۔'' سنبل نے کنول کو دلاسا دیا۔

''یہ کیسی محبت تھی کہ خون خون سے جدا ہو جائے۔ اور ابا زندہ ہوتے تو اماں ایسا کبھی نہیں کر سکتی تھیں۔''

کنول اداس اداس سی لگ رہی تھی۔

''نہیں کنول دراصل اماں کا خیال تھا کہ اگر دوبارہ تم پھوپھو سے ملیں تو پھر وہی سلسلہ چل جائے گا۔ امی نے تمہیں ان سے بچانے کیلئے ان کو نظر انداز کر دیا۔ بل تو ان کا بھی پھوپھو کیلئے رونا رہتا تھا مگر وہ تمہاری محبت سے مجبور تھیں۔ جب سے ہی ملک سے باہر ہوں۔ ان سے رابطہ رہتا ہے۔ وہ ٹھیک ٹھاک اسی گھر میں رہتی ہیں اماں نے ہمیشہ ہی مجھے منع کیا کہ میں تمہیں ان کے بارے میں کچھ نہ بتاؤں۔''

''اور تم یہ راز چھپائے رہیں۔'' کنول نے کاٹنے والے انداز میں سوال کیا۔

''مجبوری تھی۔''

''یہ کیسی مجبوری تھی؟'' اس کا دل چاہا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے لیکن ضبط کر گئی۔ سنبل سکتے کے عالم میں بیٹھی تھی کہ آج برسوں کی اماں کی محبت ایک پل میں ختم ہو گئی۔

''یہ میں نے کیا کیا؟ یہ کیسے ہو گیا؟ اب کیا ہوگا کون ہے جو اس کو روک سکے گا؟''

''صرف میری وجہ سے اتنی سزا کہ سب لوگ انہیں چھوڑ دیں۔'' وہ پھوپھی کی محبت میں دکھی ہو گئی۔

''تنہا کہاں ہیں ہزاروں کی تعداد میں ان کے گرد ہیں جو سب ان کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ پہلے جیسے حالات ہو گئے ہیں آپس میں پھر دہی بھائی چارہ۔ کوئی کسی کا اب دشمن نہیں ہے۔'' سنبل نے بہت تسلی سے اسے سمجھایا۔

''ماسوائے اپنوں کے۔'' کنول نے طنز کیا۔

''کنول کیسی باتیں کرتی ہو۔''

کنول خاموش رہی۔ اس کی آنکھوں سے تواتر سے آنسو بہنے لگے۔ وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔ سنبل اس کے پیچھے پیچھے بھاگی لیکن وہ منہ چھپائے تکیے میں سسکتی رہی۔ وہ ہر سزا سے گزرنے کیلئے تیار تھی۔

''میں انتظار کے راستوں پر چلتے چلتے ختم ہونے کیلئے کھڑی تھی۔ اماں کی ضد نے مجھے پابند کیا۔ میں تنہا رہ گئی۔ اور آج پھر سامنے پھوپھو آ گئی ہیں میں کیسے آنکھ بند کر لوں گی میں کیسے ان سے مل سکوں گی؟

وہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔ کبھی کبھی سارے دکھ آنکھوں کے ایک ہی دریچے سے بہنے لگتے ہیں سارے دکھ مل کر گلے لگ کر روتے ہیں تو پتا نہیں لگتا کہ آنکھ کسی کیلئے نم ہے اور آج میں کس لئے رو رہی ہوں اس عشق کیلئے جو مجھ سے روٹھ گیا۔ اس پھوپھو کیلئے جو برسوں کے بعد آج زندہ ہیں۔ اس اماں کیلئے جو آج ہمارے درمیان نہیں اس بہن کیلئے جو کل پھر چلی جائے گی۔

اس کنول حمید کیلئے جو تنہا ہے اور اس طویل سفر میں کسی سائے کی منتظر ہے آنکھ بھیگتی رہی۔ شام رات میں ڈھل گئی۔

جب رات سنبل کو وہ رخصت کر کے ایئرپورٹ سے گھر واپس آ رہی تھی۔ جگہ جگہ گاڑیاں اور بسیں جلی ہوئی نظر آئیں۔ ہر دو قدم پر فوجی گاڑیاں رینجرز اور پولیس والے چیکنگ کر رہے تھے یوں لگ رہا تھا پورا شہر جل رہا ہے اداس ہے، ضد، انا، بھوک اور ناانصافیاں، دور تک بکھری پڑی تھیں۔ فوجیوں نے اس کی گاڑی روک لی۔ ڈرائیور کار سے اتر کر باہر کھڑا ڈگی کھول رہا تھا۔ قریب ہی لائن سے موٹر سائیکل سوار نوجوان ہاتھ اوپر اٹھائے کھڑے تھے کنول کا دل دھک سے رہ گیا۔ ایک خوف سا طاری تھا ہر طرف اندھیرا، قانون کا اندھا راج دور پولیس والے رقم گن رہے تھے۔ آج کی طرح برسوں پہلے بھی یہ سب کچھ ہوا تھا۔ آج میں اپنوں کے اس طرح روکنے سے خوفزدہ ہوں کل ہاں تیئس چوبیس سال پہلے بھی ہم ان کی آمد پر خوش تھے۔ ہم نے اپنے گھروں میں چراغاں کیا تھا۔ ہم نے چھتوں پر پاکستانی جھنڈا لہرایا تھا خوشی اور پاکستان زندہ باد کا نعرہ کتنا دلکش اور تحفظ کا احساس دلا رہا تھا۔ بھارت کا خوف دور تک نہیں تھا خود کو ہم لوگ محفوظ سمجھنے لگے تھے اور آج دل رک گیا ڈر غالب تھا ڈرائیور واپس سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کار چل دی۔ کنول کا دل ابھی تک ساکت تھا۔ گھر کے سناٹوں سے وہ جاگ گئی۔ اماں کا ساتھ چھوٹ گیا۔ سنبل کے دم سے تین ماہ سے جو رونق تھی وہ ساتھ چلی گئی۔ اب میں ہوں اور میری تنہائیاں ہر سمت اداسی بکھری پڑی تھی۔ اتنے بڑے گھر میں کس طرح میں تنہا رہوں گی؟ کیسے دل لگے گا؟ کون ہوگا جو مجھے آواز دے گا؟ اماں زور زور سے آواز تو دیا کرتیں بلاوجہ ڈر کروں کو ڈانٹ، کام کی نگرانی آنے جانے والوں کی آمد لیکن میں ان تمام چیزوں سے بہت دور ہوں میں صبح کالج جاؤں گی اور دوپہر کو واپس آؤں گی۔ اتنا بڑا طویل گرمیوں کا دن سر پر سوار رہے گا۔ سارا کام کر لوں گی اگلا پچھلا کام پھر بھی یہ لمحے کتنے سخت ہوتے ہیں کہ گرمی کی شدت کے ساتھ چپٹے رہتے ہیں۔

کنول آنکھیں بند کیے ابھی تک لیٹی تھی۔ سنبل کے چلے جانے کا دکھ اس کی آنکھوں میں محسوس کیا جاسکتا تھا رات کا پچھلا پہر بھی بیت گیا۔ لیکن نیند نہ آئی۔ وہ اٹھ کر کاریڈور میں چلی آئی۔ سامنے دور تک اندھیرا تھا۔ ستارے ڈوب رہے تھے۔ ابھی چاند آسمان پر ٹکا ہوا تھا۔ پھولوں کی مہک اس کے قرب وجوار میں بسی ہوئی تھی۔ ڈر اور خوف کی تو وہ عادی ہی نہیں تھی۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر وہ کھلے آسمان تلے کھڑی ہر طرف دیکھ رہی تھی۔ سمندری ہواؤں کا شور اس کے من کے اندر تیز جھکڑ چلا رہا تھا ہوا سے بال بکھر بکھر کر اس کے چہرے پر آ رہے تھے۔ وہ سیاہ بالوں کو بار بار لپیٹ رہی تھی، وہ نیچے جا کر سو جانا چاہ رہی تھی۔ لیکن یہ سمندری ہوائیں اسے اپنی طرف گھسیٹ رہی تھیں وہ آنکھ بند کر لینا چاہ رہی تھی۔ لیکن گزرا وقت اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

☆☆

بانس کے گہرے سبز جھنڈ قطار در قطار ناریل کے درختوں کا سایہ، ہر طرف ہلکا ہلکا اندھیرا پھولوں اور جامنے کی بھینی بھینی مہک اور ندی نالے والا چھوٹا سا شہر پھوپھو کی سرخ حویلی کے اردگرد، جھونپڑیوں میں کھیلتے کودتے ندی میں نہاتے ہوئے وہ بچے وہ تالابوں میں کھلے ہوئے کنول ان کی ہری ہری ڈنڈیاں جن کو ؟ کی طرح بنا کر گلے میں ڈالے ہوئے وہ بنگالی بچیاں جو تالاب کی سیڑھیوں پر بیٹھی ہوتیں وہ سنبل جو آج امریکا چلی گئی۔ وہ کنول جو سنبل کا ہاتھ پکڑے گھنے درختوں کے نیچے سانپ اور گرگٹوں کو پتھروں سے مار رہی ہوتی سنبل تو ہمیشہ کی ڈرپوک تھی۔ وہ تو اس وقت بھی ابا کی گن سے سانپ مار دیتی تھی۔ سنبل تو دیکھ بھی نہ سکتی تھی اسے چھپکلی کی کٹ کٹ سے نیند نہ آتی تھی۔ وہ نشانہ لیا کرتی تھی اسے گھنے درختوں سے خوف آتا تھا۔ وہ تو اس وقت بھی بچیوں کے ساتھ دور تک ساگوان کے اونچے نیچے درختوں پر چڑھی ہوئی جنگلی بیلوں پر سے پھول چن کر لایا کرتی تھی۔ اماں ڈانٹتیں پھوپھو منع کرتیں لیکن وہ آنکھ بچا کر چلی جاتی۔ دریائے کرنافل میں ہچکولے کھاتی وہ کشتیاں اور وہ گنجان جنگل سندر بن جہاں اس نے ابا کے ساتھ سیر کی تھی ایک طرف ٹھاٹھیں مارتا سمندر جیسا جوار بھاٹا دوسری طرف ہرے ہرے درختوں کے پہاڑ۔ خطرناک موڑ اس کے اردگرد وہ آبادیاں جہاں کی سیر کیلئے ابا گھر آئے مہمانوں کو لے جاتے۔ وہ ساتھ ہوتی۔ وہ سب خوابوں کے منظر آہستہ آہستہ اس کے وجود میں سما گئے ہیں۔ گزرتا سماں ٹھہر گیا ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کا احساس اسے اور قریب لے گیا۔

اس حویلی کے اندر پھوپھی جی جن کے ہاتھ میں ایک مضبوط ڈنڈا ہوتا تھا جو صرف دھمکی کیلئے استعمال کر لیتی تھیں اس نے کبھی اسے استعمال میں نہیں دیکھا۔ جہاں لڑکیوں نے قرآن پڑھنے میں غلطی کی۔ پھوپھو نے سوٹی اٹھائی اور کہتیں۔

''اس سے ادھیڑ کر رکھ دوں گی۔'' بس یہی ان کا ہتھیار اور دھمکی تھی نجانے کتنے لوگ پھوپھو جی سے قرآن کا فیض حاصل کر چکے تھے وہ حافظ قرآن تھیں۔ تخت پر بیٹھے بیٹھے کھانا کھاتیں۔ وہیں پر سو جاتیں اس پر تمام نمازیں ادا کرتیں۔ وہیں پر خواتین کو ہر ہفتے درس دیتیں وہی تخت تھا جس پر محلے کی بچیوں نے قرآن پڑھا۔ ہر وقت تکیے کے نیچے، وہ موٹی سی نقش والی چھڑی رکھی رہتی تھی۔ عجب قسم کا پھوپھو کے چہرے پر جلال تھا لوگ ان کا احترام کرتے تھے۔ ابا، امی سب ہی ڈرتے تھے۔ لیکن انہوں نے پڑھاتے وقت کبھی تشدد نہیں کیا ان کی آواز سے، جب وہ قرات کر رہی ہوتیں، سننے والے پر رقت طاری ہو جاتی۔ ہر طرف ایک خاموشی چھا جاتی۔

اماں کہتی تھیں۔ پھوپھو کی آواز سن کر چرند پرند بھی آواز نہیں نکالتے انسانوں کی کیا مجال۔ گھر کے صحن میں گھنے درختوں کے نیچے ایک اور تخت بچھا رہتا تھا۔ جس پر پھوپھو صبح کی نماز کے بعد تلاوت کرتی تھیں۔

اس دن بھی پھوپھو قرآن پاک اپنی ترنم بھری آواز میں تلاوت کر رہی تھیں۔ کنول نے غور کیا کہ تمام درختوں کے پرندے خاموش تھے پھوپھو رک گئیں۔ پرندے چہچہاتے ہوئے اڑ گئے۔ پھوپھو نے سب کو سبق دیا۔ سب پڑھ رہے تھے کہ اچانک پھوپھو کی چھڑی اٹھی۔ اور وہ حسب معمول بولیں

''دیکھ باز آ جا ورنہ اس گھر میں ایک دن بھی رہ نہ سکے گا۔'' پھوپھو نے اپنا تکیہ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

''کمبخت آہستہ آہستہ تکیہ کھینچ رہا ہے۔'' پھوپھو اٹھتے ہوئے بڑبڑائیں۔

''پھوپھو کون؟'' کنول نے بے ساختہ پوچھا۔

''وہی منحوس جان کا پاپی میرا دشمن۔'' پھوپھو نے یاد دلایا۔

ہاں اسے یاد آیا کہ پھوپھو سے ایک کہانی منسوب تھی کہ ایک جن عاشق ہو گیا تھا۔ جس نے پھوپھو کو اسیر کر رکھا ہے۔ اس بات کا خاندان میں اتنا چرچا ہوا کہ پھوپھو کی بچپن کی بات ختم ہو گئی۔ یاد اللہ میں پھوپھو غرق ہو گئیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس جن نے پھوپھو جی کا پیچھا نہ چھوڑا۔ پھوپھو نماز

پڑھتیں تو سامنے سے تسبیح غائب ہو جاتی۔ ڈھونڈنے پر درخت پر لٹکتی ہوئی نظر آتی۔ پھو پھو لیٹی ہوتیں تو کوئی دوپٹا کھینچ کر پھینک دیتا۔ پھو پھو سو رہی ہوتیں تو تکیہ کھینچ لیتا۔ پھو پھو کھانا کھا رہی ہوتیں تو کبھی کبھی غائب ہو جاتا پھو پھو کے سامنے دوسرا کھانا آ جاتا تو پھو پھو ہاتھ نہ لگاتیں کبھی پھو پھو اٹھتیں تو گر پڑتیں کیونکہ دوپٹے کا آنچل تخت سے بندھا ہوتا۔ غرض یہ تمام باتیں گھر اور باہر مشہور تھیں۔ اماں یقین رکھتی تھیں۔

ابا اس کو کوئی بیماری بتاتے تھے سنبل پھو پھو سے ڈرتی تھی کنول پھو پھو کے قریب تھی۔ اماں ہر طرح سے ڈرتی تھیں لیکن وہ یہی کہتی تھی کہ اماں کچھ نہیں ہے۔ میں نے بھی دیکھا ہے۔

''لیکن جو کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کم نہیں ہے۔''

اماں دلائل دیتیں وہ تھوڑی دیر کو مان جاتیں باغی فطرت، پھر سب کچھ بھلا دیتی۔ اماں کہتیں۔

''کنول شام کے وقت ہرگز چھت پر نہیں جانے گی۔''

وہ جان بوجھ کر دو چکر لگاتی تھی۔ کئی لڑکیاں ڈھیروں پھول چن کر پھو پھو جی کے پاس لاتیں پھو پھو جی گجرے بناتیں۔ اماں کہتیں بوڑھی ہو گئیں لیکن گجروں کا شوق نہ گیا۔ پھو پھو گجرا بنا کر پانی کے مٹکے پر ڈلواتی تھیں ایک ایک گجرا ہر لڑکی لے جاتی۔ اماں کو پھول پسند نہیں تھے۔ اس لئے پھو پھو کا ایک گجرا ابا کی مسہری پر رکھوا دیا۔ باقی پھول اور گجرے جو بچ جاتے وہ اپنے کمرے میں رکھ لیتی تھی۔ اماں کو سخت اعتراض تھا اور اسے عشق۔ اماں کو چنبیلی کی مہک سے خوف آتا اور اسے رات کو نیند نہ آتی۔ صبح کی پہلی کرن گھڑونچی پر پڑتے ہی وہ مٹکے سے گجرے اتار کر اپنے کمرے میں رکھ آتی تھی۔ سارا دن پھولوں کی مہک بسی رہتی۔ خوشبو سے کمرے بھرے دن اور رات۔ اماں کہتیں۔

''اوپر والی چھت پر چراغ ہے مت جایا کرو۔''

وہ چھم چھم کرتی ہوئی شام تک رات میں بھی دو تین چکر لگاتی تھی۔ باوجود کوشش کے کچھ بھی نظر نہ آیا۔ البتہ جب پھو پھو رات کو تہجد کیلئے اٹھ کر جاتی تھیں۔ اکیلے تخت پر ڈر لگتا۔ وہ اٹھ کر دوسرے دالان میں اماں کے پاس چلی جاتی۔ لیکن صبح تک اماں کے قرب، جوار میں پھو پھو کے وجود کی بھینی بھینی مہک بے چین رکھتی۔ جونہی سفیدی نمودار ہوتی۔ پھو پھو کی تلاوت کی آواز کے ساتھ ہی وہ دوبارہ ان کے پاس چلی جاتی۔ وہ تلاوت کرتی جاتیں اور ان کی انگلیاں کنول کے بالوں میں ہوتیں۔ وہ دوبارہ سو جاتی۔

اسکول کیلئے اماں آواز دیتی تھیں پھو پھو پیار سے اٹھاتی تھیں وہ سب اکٹھے ناشتہ کرتے۔ پھو پھو کی آنکھیں لال ہوتی تھیں تمام رات ہی وہ عبادت میں بسر کرتیں۔

بقول اماں تمام رات عبادت کریں اور دن میں لمبی تان کر سوئیں۔

گھر میں پھر بھی پھو پھو کا بڑا رعب تھا۔ سب سے پہلے کھانے پر انہیں آواز دی جاتی پہلے پھو پھو کھانا شروع کرتیں گھر کیا محلے میں دور تک پھو پھو سے لوگ محبت کرتے تھے دکھ اور بیماری میں لوگ آتے پھو پھو کہتیں۔

''اللہ سے مانگو۔ بندوں سے طلب کرنا شرک ہے''

دم کیا ہوا پانی ضرور دیتی تھیں۔ پیپل کے پتوں سے بنا ہوا دونا جس میں مٹھائی بھری ہوتی تھی۔ کوئی نہ کوئی پھو پھو کو دے جاتا۔

پھو پھو مہینہ بھر بچوں کو بانٹتی رہتیں پھر بھی نہ ختم ہوتا۔ اماں کہتیں۔

''خود سوچا ایک دونا کتنے دنوں چلے گا۔ وہی بھرتا رہتا ہے۔'' اور پھو پھو بھی یہی کہتی رہتی تھیں۔

''تو بھرے جا دونا پھر بھی میں اپنے ہاتھوں سے تجھے نہیں دوں گی۔'' وہ غصے سے چھڑی اٹھاتیں اور سارے بچے ہنسنے لگتے۔ گویا جن ان کے ہاتھ سے تمنا کیے ہوئے بیٹھا تھا۔

اس دن بھی پھو پھو نے غصے سے ڈنڈا اٹھایا۔

''میں کہتی ہوں چھوڑ دے میرا تخت دورنہ میں ورنہ۔'' ڈنڈا ہاتھ میں تھا اور پھو پھو غصے میں تھیں کمبخت پورا تخت ہلا کے جھٹکے دے رہا تھا۔ دن کو ایک پل نہیں سونے دیتا۔ کنول جو اس کے پاس سے گزر رہی تھی

''کون پھو پھو جی؟ وہی۔''

اماں نے اشارے سے بلا لیا۔

''ایسے وقت ان کے قریب مت جایا کر۔ میرا بس چلے تو میں تم دونوں کو لیکر اتنی دور چلی جاؤں۔ ان کے سائے سے بھی دور پر کیا کروں تمہارے ابا۔''

ابا کی طرف دیکھ کر انھوں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا وہ ان سنی کر کے گزر گئی۔ عصر سے مغرب تک پھو پھو ہم سب کو قرآن پڑھاتی تھیں۔ اس وقت کئی حافظ قرآن لڑکیاں اور لڑکے ان کے شاگرد تھے۔ یہ وہ

دور تھا جب کنول کا بچپن ختم ہو گیا تھا وہ اب شعور کی منزل پر قدم رکھ چکی تھی۔

☆☆

وہ شہر، وہ بستی، تیز سمندری ہواؤں کا شور، سیاہ بادلوں میں سے جھانکتی ہوئی دھوپ، گھر کے صحن میں لگے ہوئے بیلے اور موتیے کے سفید سفید پھول۔ ہرے ہرے درختوں کے سائے میں وہ جھولے۔ ساون کی رم جھم، چھوٹی چھوٹی گلیوں سے نکلنے والا دھواں، ہر طرف کھانوں کی مہک، سیاہ جسموں سے سرمئی رنگ کے کپڑے، کیچڑ میں کھیلتے بھاگتے وہ بچے سب بڑے ہو گئے ہوں گے۔ ان میں کئی اب اچھی نوکری تلاش روزگار کیلئے کہیں اور جا چکے ہوں گے، وہ عورتیں جن کو وہ کسی کو چاچی، کسی کو ماسی کہتی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ سیلاب کا ایک ریلہ آیا اور وہ سب کسی مچھلی کی طرح ادھر ادھر بکھر گئے ہوں۔ طاقوں میں سجی گڑیاں پتا نہیں کسی نے اتاریں؛ رنگی ہمارے گھر کے آنگن میں لگے جھولے شاید گل سڑ گئے ہوں گے لمبے دالانوں میں، وہ شیشم کے نقش و نگار والی مسہریاں جن کے سرہانے شیشے لگے ہوئے تھے اب کہاں ہوں گی؟ پھوپھو جی کس طرح رہ رہی ہوں گی؟ کیا سب کچھ ویسا ہی ہوگا اس کے خوابوں کی وہ ہنستی دنیا۔

سمندری ہواؤں کا ایک تیز جھونکا آیا۔ اس نے بالوں کو سمیٹ کر جوڑا بنایا۔ ایک لمحے کی کہانی نے پورا شہر اس کے قرب و جوار میں کھڑا کر دیا۔

کالج کے راستے میں گھنے گھنے درختوں کے درمیان میں سے گزرتے ہوئے کتنا خوف آتا۔ سنبل ہاتھ پکڑ کر چلتی تھی۔ جگہ جگہ خود رو سبزہ، جھومتے درخت ان درختوں کے سائے میں کھیل تماشے والوں کی ٹولیاں اکثر جمع رہتی تھیں کہیں جھولے لگے ہیں تو کہیں پر کوئی دوسرا تماشا دکھا رہا ہے ایک طویل اور لمبا راستہ جو ہماری پتھروں کی حویلی کو جاتا تھا۔ جس کے بالکل پیچھے گھنے سایہ دار درخت قریب ہی دریا گزر رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ سرخ اینٹوں کی مسجد جس کی دیواروں تک پانی ٹکرا رہا تھا۔ حویلی کے پچھلی جانب بالکل ایک دوسری بستی آباد تھی کسانوں کی بستی، ناریل کے درخت فضا میں چائے کی مہک ان کے گھروں کے دیوں کی روشنی میں دریا میں چلنے والی کشتیاں۔ فضا میں ان کے نغموں کی آوازیں ان کی محبت بھری آوازوں کا وہ جادو دار و شعار میں ڈوبے ہوئے لفظ سمندری ہواؤں کا زور جب در باں سے گزرتا تو آوازیں غائب ہو جاتیں۔ بارش کی بوچھاڑیں جب ان کی آبادی بستی کے اردگرد گرتیں تو دیئے بجھ جاتے۔ سب کچھ تاریک ہو جاتا چند لمحوں میں سب کچھ پھر ویسا ہی ہو جاتا۔ حتیٰ کہ اس نے یہ بھی

دیکھا تھا کہ وہاں سے زندگی کا نشان مٹ جاتا۔ لیکن چند ہفتوں میں زندگی دوبارہ معمول پر آ جاتی۔ دھوپ نکلتی تو کتنی تیزی سے مرد، عورتیں اور بچے اپنے گھروں کی مرمت کر رہے ہوتے۔

ان کے جانور پانی میں بہہ جاتے، وہ پھر سے آباد کر لیتے۔ شاید ان کی زندگی کا یہ ایک معمول تھا۔ اماں روکتی تھیں لیکن اسے کبھی ان لوگوں سے گھن یا نفرت نہیں محسوس نہیں ہوئی۔ ایک تجسس ان کے گھروں میں لے جاتا اور وہ گھنٹوں ان کے گھروں میں کھیلتی تھی۔

ان کے دن بھر کے مشاغل بھی کیا مشاغل تھے سارا سارا دن، وہ عورتیں گھروں میں کام کرتی رہتی تھیں۔ کوئی بیڑیوں میں زردہ بھر رہی ہے تو کوئی چٹائیاں بن رہی ہوتی۔ ہر وقت کام میں مشغول عورتیں جفاکش اور ہاتھوں کے ہنر سے کس طرح آراستہ تھیں ان کے آدمی کھیتوں پر یا کسی فیکٹری میں مزدوری کرتے تھے ان کے بچے آتی جاتی گاڑیوں کے پیچھے بھاگتے تھے۔ ان کی بچیاں، بنگلوں اور گھروں میں صرف روٹی کے عوض کام کرتی تھیں۔

بھوک افلاس غربت میں پلے ہوئے یہ محنتی انسان پھر بھی خوددار تھے۔ روزی کما کر کھاتے تھے؛ اماں روکتی رہتیں اور وہ چھم چھم کرتی ہوئی بالائی منزل پہ چلی جاتی۔ کھڑکی کے پٹ کھلتی تو یہ سارے مناظر ایک پل میں نظر آتے وہی کشتیاں وہ ٹھاٹھیں مارتا پانی،، یوکلپٹس درخت گھروں کے اندر روشن دیے، ادھر ادھر چلتی ہوئی عورتیں رات تک پانی میں کانٹا ڈالے وہ بچے جو صبح سے بیٹھے تھے شاید ابھی تک کچھ ہاتھ نہیں آیا تھا، وہ مچھلیاں پکڑ کر گھروں کو لاتے تھے۔ کھڑکی سے ہوا کا جھونکا آیا۔ دیا بجھ گیا۔ سنبل چیخ کر پھوپھو سے لپٹ گئی تھی۔ وہ دونوں جلدی سے نیچے اتر آئیں۔ اماں چیخ رہی تھیں۔ اماں نے جتنا بھی ڈرا، وخوف بٹھایا۔ اسے ان تک لے جاتا۔ اماں کہتی تھیں کہ پھوپھو کے ساتھ لپٹ کر مت سویا کر، ان کے پاس جن آتا ہے۔ اسے تو کبھی نظر نہ آیا۔ اماں کہتی تھیں۔

''شام کے وقت پچھلی جانب مت جایا کر، وہاں سایہ ہے۔'' وہ رات گئے گھوم آتی۔ کبھی کوئی سایہ نہ نظر آیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھتی کچھ نہ نظر آتا۔ اماں پھولوں کے گجرے نوچ کر پھینک دیتی تھیں۔ حتیٰ کہ کبھی اس نے خوشبو بھی نہ لگائی۔ اماں کو ڈر لگتا تھا کہتیں گھر میں پھوپھو کو پھول اور خوشبو سے عشق تھا سائے کا اثر ہو گیا۔ پھوپھو بیمار رہنے لگیں۔ بات گھر سے باہر پھیل گئی۔ پھر رشتے داروں کو پتا چل گیا۔ پھوپھو تو بچپن کی مانگ تھی، ٹوٹ گئی۔ پھر خاندان سے کوئی رشتہ نہ آیا۔ عمر ڈھل گئی۔ وہ

انہیں تمام عمر ستاتا رہا۔ اماں خوفزدہ ہو کر کنول اور سنبل کو بچاتی رہیں۔ سنبل تو اماں کے لفظوں میں اسیر ہو کر بزدل بن گئی لیکن وہ۔ باہوش و حواس کبھی اس عاشق جن کو نہ دیکھ سکی۔ اس نے پھوپھو کا بھی مذاق اڑایا۔ ہر وقت ان کو چھیڑتی۔

''کیا ہوا پھوپھو! آخر وہ ہمارے رشتے دار ہیں کبھی ان سے ملوائیں۔''

''ہائے ہائے کمبخت!'' اماں کھجور کے پنکھے کی سوٹی سے زور سے پیٹھ پر مارتیں۔ پھوپھو بھی انگلی کے اشارے سے چپ رہنے کو کہتیں۔ پھوپھو سوتے سوتے اٹھ کر بیٹھ جاتیں۔

''دیکھ، دیکھ! میں کہتی ہوں۔'' وہ اپنا ڈنڈا اٹھاتیں۔

''کیا ہوا پھوپھو؟''

''کمبخت منحوس وہی ہے۔ کان میں سیٹی بجا رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ لحاف کھینچ رہا تھا۔ آنکھ کھل گئی۔ ابھی تو تہجد پڑھ کر لیٹی تھی۔ آنکھ لگی تھی کہ منحوس نے اٹھا دیا۔'' وہ غصے سے ڈنڈا پکڑے بیٹھی تھیں۔ اس نے پھوپھو کو زبردستی لٹا دیا۔

''لیٹ جائیں پھوپھو! آپ اس کی پرواہ ہی کیوں کرتی ہیں؟ بجاتا ہے سیٹی بجائے۔ آپ سو جائیں۔''

''میں سچ کہتی ہوں، جس دن میرے صبر کی حد ختم ہو جائے گی اور میں نے یہ ڈنڈا اٹھا لیا ناں اس دن یہ گھر تو کیا دور تک نہ نظر آئے گا۔ میں برداشت کر لیتی ہوں۔ ابھی حکم نہیں ہوا ورنہ میں اس کو ایک دن بھی رکنے نہ دوں۔'' وہ بغل کے پاس ہاتھ ڈال کر پھوپھو سے لپٹ کر بولی۔ ''پھوپھو جی!''

''پھوپھو جی کی جان'' وہ محبت کی سرشاری سے پور پور بھیگی آواز میں بولیں۔

''آپ نے کبھی اس کو دیکھا؟'' اس نے آہستہ سے پوچھا تھا۔ پھوپھو نے جواب نہیں دیا۔ وہ کچھ سوچ رہی تھیں۔ اس نے ان کے سینے پر انگلیوں سے گدگدی کی۔ تب پھوپھو بولیں۔

''کبھی نہیں۔'' اس کا سارا تجسس ختم ہو گیا۔ ابا درست کہتے ہیں کہ پھوپھو کو ایک وہم کی بیماری ہے اور کچھ نہیں۔

☆☆

برکھارت ایسی برسی کہ من کی آگ پر پہلے چھینٹے نے سارا تن ٹھنڈا ٹھنڈا کر دیا۔ کیسی پھوہار تھی من بھیگا

تن آپ ہی پانی پانی ہو گیا۔ من میں کیسی جوت جگائے سمندر پر جوار بھاٹا آیا کہ کنول جی تم آپ ایک چاند کی کرن سے اس بیراگن کی طرح سدھ بدھ کھو بیٹھیں۔ رنگوں کی یہ پھوہار کیسی تھی کنول جی! نہ رنگ نہ موسم پھر بھی جیون رنگ گیا۔ گجروں کی وہ ننھی ننھی کلیاں جو کل بیراگن کے ہاتھوں کی مالا تھیں، وہ ساری تمہاری گردن سے لپٹ گئیں۔ پور پور خوشبوؤں میں ڈبوتی اس سے اتر گئی۔ جیون کے لمبے راستوں میں نہ کوئی خار نہ خطر۔ ہر طرف من میں پھوہار ہر طرف رنگ۔ جیون کی مہک جوار بھاٹے کی طرح بیچ سمندر کنول پور پور من کی برکھارت میں ڈوب گئی۔ جہاں پر اپنا سایہ بھی نظر آئے تو بیری۔ یہ عشق کی برکھا اور سنبل سب چھوٹ گئے۔ صرف من سکھی اور دل اس من کی اگنی جس میں برکھارت برسائے۔ آنکھ روئے۔ تن بھی بھیگے اور من کی پیاس بڑھائے۔ جیون میں سب کچھ کھو جائے۔ کچھ بھی ہاتھ نہ آئے۔ رات کی سیاہ چادر جگنوؤں سے بھرے یا سمندر موتی موتی کر دے۔ زمین پر دیا جلے یا بجھے۔ ماہی آواز بلائے یا بھنور میں کشتی ہچکولے کھائے۔ کون جانے کسی کے تن میں آگ کسی کے من میں پیاس۔ سب کچھ ساحل سمندر کی ریت میں گر کر ذروں میں مل جائے۔ دھوپ نکلے تو پھر وہی من کی اگنی باہر برکھارت، جشن بن جائے۔ کون آئے کون جائے۔ کسی کو خبر کسی کو آس۔ سب کچھ تن میں ڈوب گیا۔ ہر موسم کا رنگ دل کے آنگن میں لحہ لحہ اترا چپکے چپکے کھوجی بیراگن گیروے کپڑے پہنے ہاتھ میں بر مالا لئے اس کے پھولوں کی مہک سے راستہ تلاش کرتی اسی ساحل پر اسی دریا کے کنارے گھنے درختوں کی آڑ میں جھانکتی رہتی۔ چاند چھپ کر درختوں سے دیکھتا تو من شرماتا۔ کسی کو ہے اپنی سدھ بدھ سب کچھ تیاگ دیا ہر روپ پیا سہاگن آس کے موتی۔ نہ من روئے نہ من ہنسے۔ یہ کیسے سے دل جل گیا۔ عشق جائے تن کی سدھ بدھ سسک سسک کر روئے۔ ایک پہر بس اس سے دھرتی پر پاؤں دھرے کے دھرے رہ گئے اور کنول جی کہیں تم دور، بہت دور پربتوں کی چھاؤں تلے سے کسی گہرے پاتال میں اتر گئی۔ من ڈوب گیا۔ تن بھیگ گیا۔ صرف سے ٹھہر گئے۔

☆☆

اماں اسے دیکھ کر ہول گئیں۔

''اے ہے کیا ہوا؟'' اس کی پیشانی پر تڑپ کر ہاتھ رکھا۔

''بخار بھی نہیں ہے۔'' اماں نے تشویش بھری نظروں سے دیکھا۔

"پھر اتنی کھوئی کھوئی ہر وقت سوئی کیوں رہتی ہے؟" اماں کو تشویش پیدا ہوتی۔ وہ گھبرائے ہوئے انداز میں اس کے زرد چہرے کو دیکھ رہی تھیں۔

"کچھ نہیں۔" وہ بمشکل بولی۔ من بالکل خالی لگ رہا تھا۔ پھوپھو پڑھ پڑھ کر دم کر رہی تھیں۔ اب وہ کیا بتاتی کہ سدھ بدھ کہاں کھو آئی۔ کس آگ میں جل گئی۔ کون سا وقت تھا جب اس نے دھرتی سے پیر ہٹائے کس پاتال نگری میں اتر گئی۔ جہاں سے کوئی واپس نہیں آیا۔ بھلا وہ کیا لوٹ سکے گی۔ بس من اچاٹ رہا۔ نہ وہ ہنستی بولتی۔ نہ سکھی سہیلیوں کے ساتھ گھومتی۔ ہرے بھرے درختوں پر پرندے چہچہاتے۔ جھولے ساون کے پکارتے۔ بارش کی رم جھم گنگناتی لیکن وہ سوئی رہی، نہ من جاگا نہ تن ہنسا۔ سارے موسم آتے گئے۔ اماں سر پیٹ کر خاموش ہو گئیں۔

"میں اسی دن کے لئے ڈرتی تھی کہ یہ ہر وقت ادھر ادھر نہ جایا کرے۔ لیکن میں تو وہمی تھی۔ اب کرو اس کا علاج۔" اماں ابا سے دکھی لہجے میں گلا کرتیں۔

"یہ کیسی بیماری ہے کہ ہر وقت اپنے آپ میں گم صم بیٹھی رہے۔" ابا کے پاس خاموشی تھی۔ وہ ان دنوں میٹرک کی تیاری کر رہی تھی۔ ہر وقت اس میں کھوئی رہتی۔ خالی خالی نظروں سے اماں اور سنبل کو دیکھتی تو وہ دونوں گھبرا جاتیں۔ وہ ہر چیز کو گھنٹوں دیکھتی رہتی۔ کہیں من کا موتی نہ پایا۔ بس کھوجتی رہی اور جب رزلٹ آیا تو وہ سارے پرچوں میں فیل تھی۔ صرف اس نے کتابوں کی ورق گردانی کی تھی۔ من تو کہیں اور تھا۔ جہاں وہ اپنی سدھ بدھ گنوا آئی تھی۔ وہ سائے کی طرح اس کے آس پاس تھا اور جب تپیا کے دن پورے ہو گئے۔ اسے اپنے اندر ایک گیان کا احساس ہوا۔ اماں نے ہر بار روکا۔ پھوپھو نے سمجھایا۔ لیکن وہ ہر روز زینہ چڑھتی ہوئی اوپر تیسری منزل پر چلی جاتی۔ پچھم میں کھلنے والی کھڑکی کے پٹ تھامے وہ ملاحوں کے گیتوں میں کھوئی رہتی۔ سمندری ہواؤں کے شور میں اسے گیتوں کی مدھ بھری آوازیں بھلی لگتی تھیں۔ اماں آتی ہوئی نظر آتیں تو وہ پٹ چھوڑ دیتی۔ جو خود ہی بند ہو جاتے۔ اماں کھڑکی سے باہر دیکھتیں تو انہیں ہر طرف پانی، گھنے درختوں کے علاوہ اور کچھ نظر نہ آتا۔ وہ اتر آتیں پھر آخر اماں نے ہار مان لی۔ یقین آ گیا کہ کوئی سایہ کنول پر بھی آ گیا ہے۔ سنبل وہ درود پڑھتی۔ اماں کا دل ہول کر رونے چاہتا تو وہ ابا سے لڑنے اور غصہ کرنے بیٹھ جاتیں۔ اس دن بھی وہ طوفانی سہ پہر تھی۔ تیز بارش ہولناک تباہی کی محکمہ موسمیات نے پیش گوئی کی تھی۔ تمام حفاظتی اقدامات مکمل تھے۔

ساحلوں کے نزدیک سے آبادی منتقل ہو چکی تھی۔ دریاؤں میں کشتیاں خاموش کھڑی تھیں۔ ہواؤں کے جھکڑ صبح سے چل رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہواؤں اور گرج کے ساتھ دن تاریک ہو گیا۔ موسلا دھار بارش کی وجہ سے لوگ گھروں میں محصور تھے۔ چل کنول جی آج اس کی محبت کا امتحان ہے۔ وہ پچھم کی طرف کھلنے والی کھڑکی کو تھامے کھڑی تھی۔ ہواؤں کا شور، تیز بارش کی بوچھاڑ، سارا کمرا بھیگ گیا۔ لیکن وہ کھڑکی تھامے کھڑی رہی۔ ہر طرف پانی ہی پانی، درخت جھوم جھوم کر درختوں کو چھو رہے تھے۔ اس کی نظریں گھنے درختوں کے سائے تلے مرکوز تھیں۔ سارا جسم پانی سے بھیگ گیا۔ وہ پھر بھی نہ ہٹی۔ برفانی ہوا کے تیز جھونکے آتے لیکن جسم تھرتھرایا نہ وہ ہٹی۔ وہ کھڑی رہی، بھیگتی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے من کا مایہ درختوں کی آڑ سے نمودار ہوا۔ وہ بھی اس کی طرح بارش اور ٹھنڈ میں بھیگتا رہا۔ تاریک سیاہ گھنے درختوں کے نیچے جہاں پرندے بھی ساکت تھے وہ کھڑا تھا۔ جسے اماں جن یا سایہ کہتی تھیں۔ وہ عبداللہ تھا۔ وہ اپنی ضرورت کی چیزوں کو حفاظتی مقام پر پہنچا کر واپس اسی درخت کے نیچے آ گیا تھا۔ کنول بھیگتی رہی۔ عبداللہ اس ریلے میں درخت کے تنے سے لگا کھڑا رہا۔ رموز عشق سے اماں غافل رہیں۔ جب ہوش آیا تو دوڑی چلی آئیں۔

"مر جائے گی کنول! کوئی یوں کرتا ہے۔" انہوں نے کھڑکی کے پٹ پکڑ کر باہر دیکھا۔ ہولناک تباہی اور بربادی کے آثار تھے۔ گھبرا کر انہوں نے جلدی سے کھڑکی بند کرنی چاہی۔ لیکن تیز ہواؤں نے زور لگا کر دوبارہ کھول دیا۔ وہ کنول کا ہاتھ تھامے نیچے بھاگی چلی آئیں۔ سانس زور زور سے چل رہا تھا۔ کنول پانی میں شرابور تھی۔ یہ کیسا عشق تھا کہ تن بھیگ گیا۔ لیکن من پیاسا تھا۔ امتحان میں وہ سرخرو ہوئی تھی۔ رموز عشق کے روشن روشن باب صرف عبداللہ کے نام سے منسوب ہو گئے تھے۔

☆☆

وہ کیسی تاروں بھری رات تھی۔ وہ تو بے خبر سو رہی تھی کہ بانسری کی آواز پر آنکھ کھل گئی۔ وہ جلدی سے مسہری سے اتری۔ اس کا دوپٹا سنبل کے نیچے دبا ہوا تھا۔ سنبل بے خبر سو رہی تھی۔ اس نے دوپٹا وہیں چھوڑا۔ کون پاؤں میں سلیپر ڈالتا۔ وہ تو دبے قدموں اندھیرے میں سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔ عبداللہ درختوں کے تنے دریا میں بیڑا لے بیٹھا تھا۔ بانسری کی آواز رات کی تاریکی میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ پتا نہیں کیسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ آ گئی ہے۔ کوئی آواز، کوئی آہٹ کچھ بھی تو نہیں تھا۔ وہ پٹ

تھامے کھڑی تھی۔ آہستہ آہستہ بانسری کی آواز رک گئی۔ اس کے بول آج بھی کانوں میں گونج رہے تھے۔

"میرے محبوب میں سمندر کی لہروں سے لڑتا ہوا تم تک صرف تمہارے لئے آیا ہوں۔ صرف ایک جھلک اپنے محبوب کو دیکھنے کے لئے۔ اور تم چلی جاؤ گی تو یہ سنگیت خاموش ہو جائے گا۔ سمندر کی لہریں مجھے لے جائیں گی۔ تم ابھی مت جانا میرے محبوب۔ صرف تمہارے لئے آیا ہوں۔" عبداللہ کی مدھر آواز میں گیت رک گیا۔ وہ پلٹی تو آواز کے سریلے جادو نے پھر قدم روک لئے۔ چند لمحوں میں پھر سب کچھ رک گیا۔ وہ پھر پلٹی۔ آواز کا جادو دوبارہ اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ وصل کی شب اتنی کالی اتنی خاموش کہ اپنی سانس ایک آواز کی طرح لگ رہی تھی۔ اس نے غیر ارادی طور پر پٹ چھوڑ دیئے۔ وہ نیند کی سی کیفیت میں چلتی ہوئی نیچے اتر آئی۔ والان کی الگنی سے اماں کی سیاہ چادر اپنے سر پر ڈالی۔ ننگے پاؤں بے خودی میں پیا ملن کو چلی۔ بانسری کی درد بھری آواز رات کے سناٹے میں بلا رہی تھی۔

"آ میرے محبوب! اپنے پریم سے ملنے آ۔ میری محبت سفید پانی، نیلے آسمان تلے بالکل ننھے بچوں کی طرح ہے۔ اس میں صرف کچی کلیوں کی مہک ہے۔ ابھی ہاتھوں کے گجرے پھول نہیں بنے۔ میری محبت صحیفہ ہے۔ جس کو تم پڑھو۔ اس کی پاکیزگی کی یہ لہریں گواہ رہیں گی۔ آسمان اور زمین گواہی دیں گے کہ تم صرف ایک مہک ہو......

تم رک کیوں گئیں میرے محبوب۔ کیا تمہیں گواہی پر شک ہے۔ اگر تو کہے تو میں آواز کا جادو اسی طرح جگا دوں۔ کہ دریا اور سمندری لہروں کا شور اس محبت کو پڑھ کر سنا دے۔" وہ آواز کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جب دریا کے کنارے بے خودی میں پہنچی تو ایک درد بھرے گیت کی لے پر رک گئی۔ آوازوں کا بہت شور تھا۔ سب کچھ رک گیا۔ دل بھی دھڑکنا بھول گیا۔ وہ دبے قدموں اور قریب گئی اور عبداللہ کے نزدیک بیٹھ گئی۔ اس نے ایک بار بھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ وہ ننھے ننھے پتھروں کو پھینکتا رہا۔ وہ پتھروں کے ان دائروں کو دیکھتی رہی جو پتھر گرنے سے بنتے تھے۔ وہ ننھا پتھر جب پانی میں گرتا تو یوں لگتا یہ پتھر نہیں سونے کا ٹکا ہے۔ جو چاندی کے کٹورے میں گرا ہے۔ دور گھنے جنگلوں کے اوپر چاند چمک رہا تھا۔ نیند کی اس وادی میں عبداللہ اور وہ کتنی دیر تک ان سونے کے ٹکوں کو پکڑتے رہے۔ یہ تو نہ جانا۔ پر جب دریا میں کشتیاں چلنے لگیں تو پتا چلا کہ اب بھور ہو گئی ہے۔ چپوؤں کی آوازوں نے طلسم توڑ

دیا۔ عبداللہ کھڑا ہوا تو وہ بھی اٹھ کر چل دی۔ اور جب کشتی کھلنے کی آواز آئی تو وہ آگے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ اسے معلوم تھا کہ عبداللہ جا چکا ہے۔ جب وہ آنگن میں آئی تو پھوپھو صحن کی چوکی پر نماز پڑھتے پڑھتے سو گئی تھیں یا جاگ رہی تھیں۔

"کنول!" ان کی آواز میں ٹھہرنے کا حکم تھا۔ وہ قدم اٹھانا چاہ رہی تھی لیکن رک گئی۔

"آواز کی سمت مت جایا کر۔ تن من دونوں ہی جل جائیں گے۔ کل سے میں ڈیوڑھی کا تالا خود لگاؤں گی۔" پھوپھو نے اس کی چوری پکڑ لی تھی۔

"لیکن پھوپھو وہ تو۔" وہ اس محبت کی طرف بتلانا چاہ رہی تھی۔ جس کے گواہ دریا اور زمین، آسمان تھے۔ لیکن پھوپھو نے پھر ٹوک دیا۔

"ماں پہلے ہی جلی جلی رہتی ہے۔ اب تو وہ تیری بھی دشمن بن جائے گی۔"

"لیکن پھوپھو جی!" اس نے آہستہ سے مزاحمت کی۔

"آواز کی سمت کان مت لگا، ورنہ پتھر کی بن جائے گی۔ من مار دے۔ سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔" وہ تقلید کی کیفیت میں کھڑی تھی۔ پھوپھو کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ دانوں کو آہستہ آہستہ گھما رہی تھیں۔

"من اور تن کو جلانا ہی عبادت ہے۔ میری طرف دیکھ میں نے اپنے آپ کو تج دیا۔" ان کے ہونٹوں سے پھول جھڑ رہے تھے اور پیشانی سے نور کی کرنیں جھلک رہی تھیں۔ اور وہ تو پور پور محبت کے اسرار و رموز میں غرق تھی۔ کس کو ہوش تھا۔ صرف آنکھیں جاگیں، من تو سویا سویا سے پیروں پر رک گیا تھا۔ مؤذن کی آواز کا جلترنگ سن کر اندر کے بھید تک پہنچا کس کے بس میں تھا۔ ایک پل میں ساری کائنات کے رنگ ہی بدل گئے۔ وہ سرمئی سایہ بھری دوپہر کا پل نجانے کون سا تھا جو آنکھوں میں بس گیا تھا۔ سورج چاند سب ڈوب گئے۔ آکاش دھرتی چاروں میں تتلی بن کر اڑنے والے پر جل گئے۔ بس من کھویا کھویا۔ تن میں آلکسی سی چھائی رہی۔ آنکھوں میں بس دریا کی لہروں کا وہ سنہرا پانی کھنکتے ہوئے ٹکوں کی جھنکار ماہی گیروں کے وہ گیت جواب ہوائیں گنگنا رہی تھیں۔ من کے اندر بج رہے تھے۔ بھیگے بھیگے موسم کی وہ رت نمکین پانی کا ذائقہ اب تک ہونٹوں پر تھا۔ کنول نے زبان کو ہونٹوں پر پھیرا۔ من میں دور تک سناٹا تھا۔ کوئی بھی تو ارد گرد نہیں تھا۔ پھر وہ عالم خواب کی کیفیت میں چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔

☆☆

ایک دن ابا کہہ رہے تھے۔

''بہت برا حال ہے۔ سیاسی طور پر ملک بدحال ہے۔ صوبے ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہرا رہے ہیں۔ ہر انسان گروہوں میں بٹ گیا ہے۔ بھارت کے عزائم خطرناک ہیں۔ وہ اندرونی خلفشار سے فائدہ اٹھا سکتا ہے مکتی باہنی کو بھارت میں تربیت دی جا رہی ہے۔ حالات خطرناک رخ اختیار کر رہے ہیں۔ ہمارے سیاست دان فوجی قوت کا استعمال کر کے صوبے کو کنٹرول کر رہے ہیں۔ لیکن یہ حل نہیں ہے۔ مسائل کا حل فوجی قوت نہیں ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو اپنا دشمن سمجھ رہے ہیں۔ جگہ جگہ قتل و غارت گری۔ کسی دن بڑا طوفان لائے گی۔'' پھر ایک دن بہت شور تھا۔ ابا گھبرائے ہوئے آئے تھے۔

''کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا ہے۔ ہر چند کہ ہمارے فوجیوں نے جگہ جگہ چوکیاں بنائی ہیں۔ لیکن بنگالی بچہ بچہ اس وقت نفرت کی آگ میں جل رہا ہے۔ جب آبادی ہی نفرت میں جل رہی ہو تو کوئی طاقت فاتح نہیں بن سکتی۔ تم لوگوں کے ٹکٹ میں لے کر آیا ہوں۔ تم سب کو کل کی فلائٹ سے کراچی چلے جانا ہے۔'' ہر طرف آگ، دھواں جگہ جگہ وردی میں ملبوس فوجی جوان ہر گھر کی تلاشی لے رہے تھے۔ مکتی باہنی اور بنگالی کھلے عام اسلحے لیے گھوم رہے تھے۔ ہر طرف موت کا سماں تھا۔ زندگی مفلوج تھی۔ اس نے کھڑکی کھول کر دیکھا۔ ساری جھگیاں ہٹا دی گئی تھیں۔ پاکستانی فوجیوں کا دستہ چوکی پر پہرے پر تھا۔ دریا خاموش تھا۔ کوئی آہٹ، کوئی شور کچھ نہیں، سمندری ہواؤں کی آوازیں درختوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ سرمئی بادلوں بھری، دوپہر میں کیسا جادو جاگتا تھا۔ ہر طرف بارش کی رم جھم ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وہی لمبے لمبے درخت تھے۔ جن کی آڑ میں عبداللہ اس دن بھی کھڑا تھا۔ اماں اسے کھینچ رہی تھیں۔ وہ کھڑکی کا پٹ تھامے نظروں میں آخری لمحوں کو سمو رہی تھی۔

''جلدی کرو کنول! ابا گاڑی لے آئے ہیں۔'' اس کا دل چاہا کہ وہ یہیں رک جائے۔ پیر من من بھر کے ہو رہے تھے۔ کون من کے اندر سما گیا تھا۔ اماں ہاتھ تھامے زینے طے کرتی ہوئی اسے تقریباً کھینچتی ہوئی لے آئیں۔ جب وہ گاڑی میں بیٹھے تو پھوپھو جی نہیں تھیں۔ ابا نے آوازیں دیں۔ اماں نے پکارا۔ نجانے کس طرف نکل گئی تھیں۔ آخر وہ لوگ ابا اور پھپھو کو چھوڑ کر آ گئے۔ واپسی پر ابا کو شرپسندوں نے قتل کر دیا۔ برسوں پھوپھو کا کوئی سراغ نہیں ملا اور جب سنبل نے بتایا کہ پھوپھو زندہ

ہیں تو تن من میں سب کچھ جاگ پڑا۔ گھر کا ایک ایک کونہ یاد آ رہا تھا۔ تمام لمحے آنچل سے الگ ہو کے چل رہے تھے۔ برسوں وہ دکھ کی کھوئی رہی۔ پر یہ نہ جانا کہ من کیوں سو گئے اور آج جب پتا چلا تھا کہ پھوپھو جی زندہ ہیں تو یوں لگا جیسے وہ دوبارہ زندہ ہو رہی ہو۔ اسی سے میں ایک بار اتر کر دیکھوں۔ من چلے یا تن چلے مجھے جانا ہے۔ اسی نیلگوں پانی میں سونے کے ٹکے ڈالنے۔ وہ آتا ہوگا۔ آج بھی وہ میرا ہوگا۔ اس کی بانسری کی دھن وہی ہوگی۔

☆☆

وہ ایک دن بابر سے کہہ رہی تھی۔

''بابر! مجھے بنگلہ دیش جانا ہے۔'' آواز دھیمی تھی لیکن ارادے پختہ نظر آ رہے تھے۔ خالہ جان تو یہ سن کر چونک گئیں۔ ان کا ماتھا ٹھنکا۔ البتہ بابر بہت زور سے ہنسا۔

''اس میں ہنسنے کی کون سی بات ہے۔ کیا کوئی انہونی بات کہہ دی؟'' وہ برا مان گئی۔

''بس مجھے تمہارا جن یاد آ گیا۔'' بابر نے چھیڑا۔

''تم بکواس مت کرو۔'' وہ مسکرا کر اپنی ناراضگی کا اظہار کر رہی تھی۔

''گویا تمہارے سر سے جن کا بھوت ابھی تک اترا نہیں ہے۔'' بابر نے دوبارہ چھیڑا۔

''شاید۔'' وہ جھینپ گئی۔ ہزاروں رنگ چہرے پر بکھرے تھے۔ وہ اسی وقت گزرتے سمے میں اتر گئی۔ بابر کہہ رہا تھا۔ ''جن سے پہلے میں تھا آپ کا امیدوار۔ یہ رقیب نجانے کہاں سے پیدا ہو گیا؟ اگر مجھے مل جائے تو شوٹ کر دوں گا۔'' بابر کی آنکھوں میں کچھ ایسی شرارت تھی کہ اس نے ہنس کر موضوع بدل دیا۔

''تم کل ہی بکنگ کروا دو۔'' کنول نے یقین کر لینے کے لئے اس کی سیاہ آنکھوں میں جھانکا جہاں ابھی تک شرارت کے رنگ مچل رہے تھے۔

''وہ تو میں کروا ہی دوں گا لیکن یہ بابر علی خان آخری دم تک اس جن سے ہار نہیں مانے گا۔ اگر وہ جن ہے تو میں بھی اس ایٹمی دور کا بابر علی خان ہوں۔ اگر تم اپنے جذبوں میں سچی ہو تو میں بھی پکا ہوں ہر چند کہ۔'' جملہ ادھورا چھوڑ کر اس نے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ کنول کو ہنسی آ گئی۔

''خیر یہ تو دھوپ میں پک گئے ہیں۔''

"جی نہیں کنول جی! یہ انتظار عشق کی کچہری ہے۔" آنکھوں میں شوخی بدستور موجود تھی۔

"دیکھو بابر! تم سے کوئی پردہ نہیں۔ تم تو بچپن کے ساتھی ہو۔ ہر چند کہ میں اس وقت شعور و آگہی کی پہلی منزل پر تھی۔ لیکن وقت نے ذہن کو اتنا باشعور کر دیا ہے کہ میں اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتی اور نہ ہی میں خود کو جھٹلا سکی۔ جو کچھ ہوا اس میں میرا اپنا ارادہ شامل تھا۔ میں یہ کیسے گوارا کر لوں، کیسے ان لمحوں سے آنکھیں چرالوں۔ جبکہ سب لوگ اور تم اس حقیقت سے واقف ہو۔ من میں کسی اور کو بسا کر تمہارا ہاتھ تھامنا مجھے نہیں آیا۔ ہر چند کہ اماں نے بھی یہی کہا کہ وہ بچپن کی نادانی تھی۔ ایسا ہوتا رہتا ہے۔ خالہ جان بھی یہی کہتی تھیں کہ وہ ایک سایہ تھا۔ میں کسی وہم میں پڑ گئی تھی۔ لیکن بابر وہ حقیقت تھی یہ جانتے ہوئے بھی کیسے جھٹلا دوں۔" کنول خاموش ہو گئی۔

"اس میں کیا شک کہ وہ عشق سچا تھا۔" بابر نے پھر اسے چھیڑا۔

"میں یہ بات جانتی ہوں کہ تم فراخدل ہو تم یہ جانتے ہو کہ میں اس وقت کس عمر میں تھی۔ لیکن بابر تمہارے اندر، ہر مرد کے اندر ایک بابر ہے۔ یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔" وہ اداس ہو گئی۔ بابر منانے بیٹھ گیا۔

"اتنے دنوں کے بعد آیا ہوں۔ سب سے پہلے میں کنول جی کے درشن کے لئے دوڑا چلا آیا اور تم؟" اس نے آہستہ سے اس کے سر پر ایک چپت لگائی، کنول مسکرا دی۔

"چلو مائی سویٹ کزن! میں مانتا ہوں لیکن دنیا میں اور بہت سے بابر ہیں۔ کیا ہر بابر کے اندر بھی دوسرا آدمی رہتا ہے۔ جو آپ کے جنون عشق سے واقف ہے؟" بابر نے پھر اس کی سیاہ آنکھوں میں شرارت سے دیکھا۔

"تم جو ہر ایک پرپوزل کو رد کرتی رہی ہو۔ اس کا مطلب کیا ہے؟ جواب دو۔"

"بابر!" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ پھر کچھ سوچنے لگی۔ پھر بولی۔

"بابر! سچائیوں کا اعتراف ہی دلوں کو مطمئن رکھتا ہے۔ میں تمہاری محبت کی مقروض ہوں۔ تم نے مجھے ہر لحہ چاہا لیکن میں تمہاری محبت کا جواب بھی محبت سے نہ دے سکی، لیکن میں ایسی بھی مضبوط دل کی نہیں ہوں کہ اپنے دل پر کوئی بوجھ رکھ سکوں۔ آج جب برسوں بعد پھر مجھے وہاں جانا ہے کیوں نہ میں تمہاری محبت کو جو ایک حقیقت ہے۔ اس کا دوسرا رخ بھی دکھا دوں۔" گویا وہ سارا حال دل آج کھول

کر رکھ دینا چاہ رہی تھی۔ ہونٹ خشک تھے لیکن آنکھوں کی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ اندر سے بہت مطمئن ہے۔ بابر اس کے قریب آ گیا۔

"جن کا آج قرض اتار ہی دیا جائے۔" اس کی شریر آنکھیں بے تاب نظر آ رہی تھیں۔

"ایسی بھی کیا جلدی ہے؟" بابر کی بے چین فطرت سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔ اس لئے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"دیکھو بابر! تم سن کر آؤٹ مت ہو جانا اس دن کی طرح، ورنہ میں تاقیامت بات نہیں کروں گی۔" اس نے دھمکی دی۔

"اچھا اس دن سے تھوڑا سا کم۔"

"شٹ یور ماؤتھ! ساری محفل کے سامنے تماشا بنا دیا۔ یہ تو خیر ہوئی کہ سب تمہاری فطرت سے واقف ہیں۔"

"اچھا، وہ بات تو بتاؤ۔"

"یہ اس دن کی سزا ہے کہ تم انتظار کرو۔ جب فرصت ہو گی میں بتا دوں گی۔" وہ بابر کو تنگ کرنے لگی۔

"لیکن تم جانتی ہو کہ میں جلد باز ہوں۔"

"بہت اچھی طرح۔"

"تو پھر رحم کر دو۔"

"کبھی نہیں۔" وہ تنگ کرنے پر اتر آئی۔

"جی ہاں کبھی نہیں۔ لیکن میں کل چلا جاؤں گا۔"

"تو ٹھیک ہے۔ میں جانے سے کچھ دیر پہلے بتا دوں گی تاکہ تم آسمان پر تارے ٹھیک سے گن سکو۔"

"اے سویٹ کزن! تارے گنتے گنتے تو میں بوڑھا ہو چلا ہوں لیکن شمار پورا نہیں ہوتا۔" وہ بے چارگی سے بولا۔

"تم کسی آسٹرالوجسٹ سے ستاروں کا حال معلوم کر لیتے تو شاید پھر گننے کی ضرورت نہ پڑتی۔" وہ بھی شوخی سے چھیڑ رہی تھی۔

"وہ تو میں خود اس فیلڈ میں ماہر ہوں۔ یاد نہیں بچپن میں تم سب کے ستاروں کا حال بتایا کرتا تھا۔"

اسے بچپن یاد آ گیا۔ کنول بھی شاید انہی لمحوں میں اتر گئی تھی۔

"خیر چھوڑو بابر! اس زمین پر چلنا خاصا مشکل کام ہے۔ تم صرف اچھی فلائنگ کر سکتے ہو۔" بابر نے اسے گھور کر دیکھا۔ وہ اس کے لئے پیالی میں چائے ڈال رہی تھی۔

"خدا کی قسم یہ چائے آج زہر لگ رہی ہے۔" بابر نے پیالی میز پر رکھ دی۔

"اب ہمارے ہاتھ کی چائے اچھی نہیں لگتی۔ تم گھاٹ گھاٹ کی چائے جو پیتے پھرتے ہو۔" اس نے پیالی دوسری طرف رکھ دی۔

"لیکن جو دودھ پتی میں مزا ہے، وہ کسی میکس، ویل کافی میں نہیں۔"

"رہنے دو، صرف باتوں میں ماہر ہو۔"

"وہ قرض والی بات۔" بابر نے بڑی معصوم شکل بنا کر اس کے بھید جان لینے کے لئے پھر گفتگو کا آغاز کیا۔

"شکل دیکھو، اس وقت کیسی معصوم لگ رہی ہے۔" اس نے بابر کی نقل اتاری۔

"میں کل کی فلائٹ سے جا رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، میں یہ خبر تمہیں عین فلائنگ کے وقت دوں گی تاکہ تم آسمان پر تارے گنتے منزل مقصود تک چلے جاؤ۔"

"اور اگر خبر ایسی ویسی ہوئی ناں تو میں رن وے پر ہی جہاز کو ٹکرا دوں گا۔ دوسرے دن بابر علی خان کی موت کی خبر آئے گی۔"

"اللہ نہ کرے۔" وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ اسے اماں یاد آ گئیں۔ موت کتنی بھیانک چیز ہوتی ہے۔

"چلو ٹھیک ہے، اگر یہ انتظار میری سزا ہے تو مجھے منظور ہے، میں کر لوں گا۔ لیکن سچ بتا رہا ہوں آج رات کو سو نہ سکوں گا۔"

"میں تمہاری فطرت سے واقف ہوں۔ اسی لئے تو میں نے یہ انتظار کی سزا دی ہے۔"

"چلئے مجھے منظور ہے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر پلٹ کر آ گیا۔

"بائی دی وے کنول! تم بنگلہ دیش میں ٹھہرو گی کہاں؟"

"اپنے گھر میں۔"

"وہی جنوں والی کوٹھی میں ناں؟" کنول نے ایک لمبا سانس لیا۔

"او کے سی یو۔" وہ ہنستا ہوا چلا گیا۔ وہ بابر کے چلے جانے کے بعد اداس ہو گئی کچھ بھی تو کرنے کو نہیں تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد خالہ کا فون آیا تھا۔ وہ بے حد پریشان تھیں۔

"بس کہہ جو دیا کہ کوئی ضرورت نہیں ہے جانے کی اور ابھی اسی وقت فوراً میرے پاس آ جاؤ۔ تنہائی میں اوٹ پٹانگ خیالات آتے رہتے ہیں۔" گھر جا کر بابر نے ساری تفصیلات بتائی تھیں۔ اسی لئے خالہ نے گھبرا کر فون کیا تھا۔

"آپ پریشان نہ ہوں، میں ابھی آتی ہوں۔" وہ جلدی سے خالہ کے گھر جانے کے لئے تیار ہو گئی، ورنہ وہ پریشان رہیں گی۔ جب اس نے پورے گھر کے کمرے لاک کر کے چابی پرس میں ڈالی تو دل خالی خالی لگ رہا تھا۔ ملازم نے گیٹ بند کیا اور وہ ڈرائیو کر کے تھوڑے ہی فاصلے پر بنے خالہ کے گھر پہنچ گئی۔ خالہ اور بابر ہی اس کے قریب تھے۔ یوں تو دور دراز کے سینکڑوں رشتہ دار تھے، لیکن رشتہ داریاں اماں نبھاتی تھیں۔ وہ تو صبح ہوتی۔ کالج پڑھانے چلی جاتی۔ دو بجے جب وہ آخری لیکچر دے کر باہر آتی تو ڈرائیور موجود ہوتا۔ کالج اور گھر، اس کی دو ہی دنیائیں تھیں۔ لیکن آج کل کالج بھی بند تھے اور اماں نے انتظار سے تھک کر آنکھیں موند لی تھیں۔ اب وہ اتنے بڑے گھر میں بالکل تنہا تھی۔ لاکھ خالہ نے چاہا کہ وہ ان کے ہی پاس شفٹ ہو جائے، لیکن وہ گھر کو لاک کر کے نہ جا سکی۔ لیکن آج اماں کے بعد پہلی بار وہ گھر لاک کر کے صرف خالہ کی تسلی کے لئے جا رہی تھی۔ خالہ کا صرف ایک ہی بیٹا تھا۔ وہ بابر سے چھوٹی ضرور تھی، لیکن ان دونوں کے درمیان ایک امید کا یک طرفہ رشتہ قائم تھا۔ بابر اسے پسند کرتا تھا۔ خالہ کی وہ جان و دل تھی۔ اس لئے وہ اس کو ہمیشہ کے لئے گھر لانا چاہتی تھیں۔ بابر بھی اسے بے حد پسند کرتا تھا، لیکن وہ بچپن کی ایک معمولی سی بھول کو ابھی تک دل سے لگائے بیٹھی تھی۔ جب اس نے بابر سے صاف انکار کر دیا تو کوئی اور کیا ویٹنگ دیتا، وہ بابر کو چاہتے ہوئے بھی اسے اپنی پسند نہ بنا سکی تھی۔ خالہ کہہ رہی تھیں۔

"بابر کل فلائٹ پر جا رہا ہے میں بھی تمہاری ماں ہوں، اکیلی بھی ہوں، تم یہیں پر آ جاؤ۔" وہ محبت سے خالہ کے گلے میں بانہیں ڈالے انہیں مناتی رہی۔ بابر گھر پر نہیں تھا۔ وہ کتنی دیر تک خالہ سے باتیں کرتی رہی۔

''میں صرف چند دن کے لئے جاؤں گی، پھر آپ دیکھئے کہ وہاں پر ہماری پھوپھو جی ہیں۔ اماں نے کتنی بڑی غلطی کی۔ کبھی ہم نے پوچھا ہی نہیں کہ وہ کس حال میں ہیں۔ اب جب وہ ہیں تو میں ان کے پاس ضرور جاؤں گی، صرف چند ہفتوں کے لئے۔'' وہ اس وقت پھوپھو کی محبت میں چور تھی۔ خالہ کی آگے ہمت ہی نہ پڑی کہ وہ کچھ کہہ سکیں۔ بابر نے دوسرے ہی دن اس کی بکنگ کرا دی تھی۔ وہ اپنے خیالوں میں گم تھی۔ آج بابر کو بھی چلے جانا تھا۔ اس کے دو چار دن کے بعد وہ بھی عازم سفر ہونے والی تھی۔ ابھی ابھی بابر کا فون آیا تھا۔

''مائی سویٹ کزن بابر علی!'' اس کے لہجے میں مسکراہٹ کا خمار چھلک رہا تھا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ شاید اسے بھی انتظار تھا۔

''میں تمہارے بارے میں سوچ رہی تھی۔'' دوسری طرف بھی اس کی مدھ بھری آواز گونجی۔

''زہے نصیب کہ آپ میرے ہی بارے میں سوچ رہی تھیں۔ میں آج رات کی فلائٹ سے جا رہا ہوں۔''

''یہ تو میں جانتی ہوں۔'' بابر کے شیڈول سے وہ واقف تھی۔

''لیکن بات جو رہی جا رہی ہے۔'' بابر نے یاد دلایا۔

''وہ'' وہ رک گئی صرف بابر کو تنگ کرنے کے لئے۔

''جی وہ۔'' بابر نے اس کی نقل اتاری۔

''واپسی پر رکھ لیتے ہیں۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ بابر کو اس کی آواز کی کھنک اتنی بھلی لگی کہ وہ چپ ہو گیا۔ کنول کو لگا شاید لائن کٹ گئی ہے۔

''ہیلو بابر!'' دوسری طرف سے پھر آواز آئی۔

''جی کنول جی! لائن پر ہی ہوں۔''

''اتنی خاموشی، کیا سوچ رہے تھے؟'' اس نے اس کی چوری پکڑ لی۔

''تمہارے علاوہ کچھ بھی نہیں سوچتا۔''

''بابر۔'' وہ اداس ہو گئی۔

''صرف چار دن کے لئے آیا تھا۔ اب تم آرام سے رہو، میں تو چلا پردیس۔'' بابر اداس تھا۔

''کوئی بات نہیں، صرف ایک ہفتہ بعد موصوف نظر آئیں گے۔''

''خیر وہ تو آؤں گا ہی لیکن آج تمہیں وہ بات جو ادھوری رہ گئی تھی، بتانی پڑے گی۔''

''اور اگر نہ بتاؤں تو۔'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

''تو شاید بے دھیانی میں رن وے پر ہی جہاز ٹکرا جائے اور پھر بابر واپس ہی نہ آئے۔'' وہ یہ سن کر لرز گئی۔

''بابر! کیسی باتیں کرتے ہو۔'' اس کا دل زور سے دھڑکا۔

''ڈر گئیں۔'' بابر ہنسا۔

''رخصت ہوتے وقت کوئی یوں بدشگونی کی باتیں کرتا ہے؟'' اس کا ابھی تک دل دھڑک رہا تھا۔

''تو کوئی رخصت ہوتے وقت اچھی بات بھی نہیں کرتا کہ جب محو پرواز ہوں تو کوئی خیال، کوئی آواز ہمسفر ہو۔'' بابر کی آواز میں شکوہ تھا۔

''خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں بابر۔'' اس بار اس کی آواز میں برسوں کا پیار جھلک پڑا، جس کا بابر کو بھی احساس ہوا۔

''واہ کنول جی!'' بابر کی آواز میں شکریہ کا رنگ غالب تھا۔

''چلو کیا یاد کرو گے۔ بابر علی خان کہ کس رئیس زادی سے پالا پڑا تھا اور کیا منہ پھٹ اور شرم وحیا سے دور ہے کنول!'' وہ ایک سانس میں بول رہی تھی۔ بابر چپ رہا۔

''بابر! میں جا رہی ہوں کسی سایہ کی تلاش میں لیکن وہ صرف میرے لاشعور میں چھپے ہوئے کسی خزانہ کی تلاش کی طرح ہے، ملے نہ ملے، لیکن ایک حقیقت تھی۔ اس دن جو میں کہنا چاہ رہی تھی، زندگی میں ہزاروں موڑ ایسے آئے جب......'' وہ رک گئی۔ تھوڑی سی شرم محسوس ہوئی پھر بولی۔

''بابر! ہر بار یوں محسوس ہوا کہ میں تمہاری محبت کے سامنے بے بس ہوں۔ اعتراف کرتی ہوں بابر کہ میں نے بھی صرف تمہیں چاہا ہے، لیکن کیا کروں، کہ میرے اندر خود کو سونپ دینے کا جذبہ نہ پیدا ہو سکا اب جب کہ میں جا رہی ہوں، تو میں نے سوچا کہ یہ بڑی زیادتی ہے کہ میں قرض بھی نہ چکاؤں۔ کم از کم اگر سپرد نہ ہو سکی تو ہار مان جاؤں۔'' اس نے بہت مشکل سے اپنے جذبات کا سادہ لفظوں میں اظہار کر دیا۔

"مجھے تمہارے جذبات کا اندازہ تھا۔ شاید اسی لئے میں نے ہار نہیں مانی کنول جی۔" وہ خوشی سے اچھل پڑا۔

"انا اور خودسری کے جس خول میں بند ہو وہ صرف ایک طرفہ سایہ ہے، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔"

"بہر حال بابر!" اس نے بات کاٹ دی۔

"اب تو تم مطمئن ہو، اس سے زیادہ میں جانے سے پہلے تمہیں کیا دے سکتی ہوں؟"

"بہت کچھ۔"

"کیا بابر؟" وہ رک کر سوچنے لگی۔

"وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا، اب اس کا حال سنائیں کیا۔

کوئی مہر نہیں، کوئی قہر نہیں، پھر سچا شعر سنائیں کیا"

"ہائے بابر! میں تو ڈر گئی تھی۔" وہ شعر مکمل ہونے کے بعد بولی۔

"اے بے وقوف لڑکی! یہ غزل سنا رو۔ تمام سفر میں گنگناتا رہتا ہوں، ورنہ تمام راستے بے ڈھنگی آوازوں کا شور رہتا ہے۔"

"اوہ تو بابر۔"

"پلیز کنول!" وہ ملتجی لہجے میں بولا۔

"اچھا، اچھا بابا! تم اتنی آسانی سے ریسیور نہیں رکھو گے۔"

"اگر عادت سے واقف ہو تو پھر؟" اس نے اپنی عادت کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے ریسیور رکھ دیا۔ رات کے سناٹے میں کتنی دیر تک بابر کی بھاری آواز "اک آگ غم تنہائی کی جو سارے بدن میں پھیل گئی" گونجتی رہی۔ یہ کیسی آگ تھی، جس میں وہ نہ چاہتے ہوئے بھی جل گئی تھی۔ بابر جس لڑکی کو پسند کر لیتا، خالہ جی امی کو لے آتیں لیکن بابر آج بھی اس کے انتظار میں تھا۔ وہ ریسیور رکھ کر سامنے لگے بڑے سے آئینے میں بہت دیر تک خود کو دیکھتی رہی۔ زہر غم تنہائی کا ابھی اتنا نہیں بڑھا تھا، گزری ساعتوں کا عکس نہ جانے کیوں آج آنکھوں میں زیادہ ہی چھلک رہا تھا۔ عبداللہ کی شبیہ کئی روپ دھار کر سامنے آ رہی تھی۔ اس کے ہر آئیڈیل روپ میں وہ چھپ رہا تھا۔ کبھی وہ ہنس رہی ہے، کبھی وہ اس کے ساتھ گزری محبتوں کا، اپنی حماقتوں کا خود ہی مذاق اڑا رہی تھی۔ کنول نے اپنے گھنے بالوں کو سنوارا اور

الماری سے کپڑے نکال کر اٹیچی میں رکھنے لگی۔ کل اسے چلا جانا تھا۔ سمندر کے اس پار جہاں، لاشعوری طور پر آج بستی تھی۔ جسم وہاں کے سناٹے میں آج بھی گھلے کرتے تھے، آج بھی باسی پھولوں کی مہک اس کے وجود میں تازہ رہتی تھی۔ سب کچھ وہی تھا۔ صرف چہرے بدل گئے تھے۔ وہ انسانوں کی بھیڑ میں سے گزرتے ہوئے نظر ڈالتی رہی۔ شاید کسی چہرے کو پہچان سکے، لیکن کوئی بھی شناسا نہ ملا۔ وہ ایئر پورٹ سے باہر آ گئی۔ وہاں سے ٹیکسی لے کر اسے پھوپھو جی کے پاس جانا تھا۔ رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ جب اس نے بڑے سے لکڑی کے دروازے پر پڑی بھاری سی زنجیر ہاتھ میں تھامی تو ایک لمحہ کے لئے دل لرز گیا۔ کہیں سنبل نے مذاق نہ کیا ہو اور کہیں اس گھر کے اندر پھوپھو نہ ہوئیں تو کیا ہوگا؟ چلنے سے پہلے کم از کم پھوپھو کے بارے میں تصدیق تو کر ہی لینی چاہئے تھی۔ آخر ڈرتے ڈرتے اس نے دستک دے ہی دی، وہ دستک دیتی رہی، کوئی آواز نہ آئی۔ وہ ٹیکسی سے سامان تو پہلے ہی اتار چکی تھی۔ ٹیکسی جا چکی تھی۔ وہ سامنے والی بالکنی کو دیکھ رہی تھی۔ یادوں کے دریچوں میں سب کچھ تھا، لیکن نام نہیں یاد آ رہا تھا کہ یہاں کون رہتا تھا۔ پھر بھی وہ بڑا سا بیگ اٹھا کر اسی طرف دیکھ رہی تھی کہ دروازے پر آواز آئی۔

"کون؟" وہ جسم و جان سے خالی خالی لرز گئی کہ یہ تو وہی آواز تھی۔ جسے وہ لاکھوں میں پہچان سکتی ہے، پھوپھو کی آواز۔ اس کا سانس ایک لمحے کے لئے رک گیا۔ دوبارہ آواز بہت قریب سے آئی۔

"کون؟" جواب میں اس نے کنڈی چھوڑ کر کہا۔

"پھوپھو میں ہوں۔" اس کی آواز کانپ رہی تھی یہ کہتے ہوئے۔ پھوپھو نے دروازہ کھول دیا۔ اندھیرے میں وہ پہچان ہی نہ سکیں کہ کون ہے، غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کون؟"

"ارے پھوپھو جی! میں کنول ہوں، کراچی سے آئی ہوں۔" وہ تھوڑا سا آگے بڑھی اور مسکرانے لگی۔

"کنول!" پھوپھو جی نے حیرت سے دیکھا اور پھر وہ ان کی بانہوں میں سما گئی۔ یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس لمحے پھوپھو کی بانہوں میں ہے۔ تمام رات وہ پھوپھو سے باتیں کرتی رہی۔ گزری مسافتوں میں ہر ایک چہرے کو وہ دیکھتی رہی۔ ایک ایک فرد کو پوچھتی رہی۔ جب پھوپھو اس کو اس لرزہ خیز قیامت کے بارے میں بتا رہی تھیں، جو ان کے اوپر گزری تھی، تو دل مچلنے لگا کہ پوچھے کہ وہ اس بارش،

طوفان، دھوئیں گھن گرج میں عبداللہ کیوں چھوڑ گئی تھی، لیکن وہ کچھ نہ پوچھ سکی۔ رات بیت گئی۔ سورج سر پر چڑھ آیا، لیکن اس کی آنکھ نہ کھلی۔ وہ بے خبر برسوں کے بعد اپنے اس، بد پر سو رہی تھی اور نیند بھی ایسی کہ جیسے قیامت سے جاگ رہی تھی۔ پھوپھو کتنی بار اس کے کمرے میں آئی تھیں، لیکن نیند نہ ٹوٹی۔ وہ بے خبر سوتی رہی۔ جب سے سنبل اسے بتا کر گئی تھی کہ پھوپھو زندہ ہیں، اسے یوں لگا تھا کہ وہ جاگ رہی ہے اور آج سو گئی۔ اس کے چہرے پر پھوپھو کو اس کا بچپن نظر آ رہا تھا۔ جب ہی تو وہ اسے مسکرا مسکرا کر دیکھ رہی تھیں۔ پھوپھو کا اس لمحے دل چاہا کہ اسے اٹھا کر ڈھیروں پیار کریں اور کہیں اب اسکول کی تیاری، لیکن کتنا سارا وقت بیت گیا تھا، نہ کوئی آہٹ، نہ آواز، بس ایک خاموشی، چپ چاپ پہر جو حائل ہو گیا تھا۔ دو دن تک کنول پر آلکسی طاری رہی۔ خوب دل بھر کر سوئی۔ یوں لگ رہا تھا، وہ برسوں کی نیند چکا رہی ہو۔ آج آئے ہوئے اسے تیسرا دن تھا۔ جب وہ سہ پہر کے وقت نہا دھو کر تر و تازہ ہو کر باہر آئی تو اسے پھوپھو میں تبدیلی محسوس ہوئی۔ وہ بہت زیادہ ہشاش بشاش اور تر و تازہ لگ رہی تھیں۔ وہ باہر درخت کے سائے میں بیٹھی گزرے ہوئے لمحوں کو یاد کرتی رہی۔ وہ ایک ایک کے بارے میں پوچھتی رہی۔ پھوپھو حیران تھیں اس کی یادداشت پر، حتیٰ کہ گھر میں اس وقت جو ملازمین تھے وہ ان کے بارے میں پوچھتی رہی۔ ایک ایک کو یاد کرتی رہی۔ پر عبداللہ کو نہ پوچھ سکی۔ وہی اس کا بیری تھا، جو لبوں تک نہ آ سکا۔ حویلی کے پیچھے پڑی ہوئی جھگیوں کے مکینوں کے بارے میں پوچھتی رہی۔ کہاں ہیں اور کب یہاں سے کہاں گئے؟ کبھی کبھی کچھ ایسے ناموں کا ذکر آیا جن سے کئی یادیں وابستہ تھیں۔ کبھی وہ دکھی ہو جاتی، کبھی ہنسنے لگتی۔ اوپر، نیچے، حویلی سے باہر، اندر ایک ایک کونے کھدرے کو خوب اچھی طرح دیکھ چکی تھی۔ خالی خالی بڑے بڑے دالانوں کو دیکھ کر وہ دن یاد آتے۔ اوپر کی منزل پر جا کر وہ گھنٹوں کھڑکی کے پٹ تھامے باہر اسے ڈھونڈتی رہتی، تھک ہار کر بند کر دیتی۔ زینے سے اترتے وقت اسے یوں لگتا، کوئی بلا رہا ہے، وہ ہوا کے تیز چلنے کو بھی ایک سریلی آواز سمجھ کر دھوکا کھاتی۔ چند دن تک وہ حویلی کے ماحول میں اسیر رہی۔ اپنی یادوں کے طلسم سے جب باہر آئی تو کالے آکاش پر تارے دور تک بکھرے پڑے تھے۔ وہ کھڑکی کے پٹ سے اندھیرے میں باہر دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں انتظار کی جوت جاگ رہی تھی۔ پھر نہ جانے کن پاتالوں میں اتر کر گم ہو گئی۔ دل کی دھڑکن آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ گزری ساعتوں کا بندھن پاؤں تلے کسمسا رہا تھا۔ دور دریا میں

بانسری کی سریلی آواز تو تھی۔ پر وہ نہیں کہ جان سے وہ خالی ہو جائے۔ ہواؤں میں مون سون کے پیغام تو تھے، لیکن ایسے نہیں کہ من میں جلترنگ بکھر دیں۔ دور برستی ہوئی بدلیاں چمکتی ہوئی تتلی، ملاحوں کے وہ گیت جن میں محبوب کی خاطر سمندر کا سینہ چیرتے ہوئے آ ملنے کی صدا تو تھی، لیکن وہ بے قراری نہیں کہ وہ تڑپ کر دریا میں کود کے ڈالنے نکل جائے۔ سب کچھ تو تھا پر من ہی خالی خالی نہ چاند ستارے نہ من شانت۔ اندھیری رات کی کالی مانگ تسی بھکارن کی طرح اس کے سامنے پھیلی پڑی تھی۔ اور وہ خالی ہاتھ نہ جگنو نہ گجرا نہ پیا کی آس، بس دل بجھا بجھا، جلا جلا، آنکھوں کے سامنے گزرے لمحوں کا میلہ بکھرا پڑا تھا۔ بس دل اچاٹ ہو گیا۔ من کی دھرتی پر برکھا نہ برسے تو من جل جاتا ہے۔

"جی کنول جی! تم بھی جل گئیں، نہ شوخ و شنگ ہوا کے دوش سنبل کے ساتھ جھولے نہ اماں، ابا کے برکھا رت کے وہ ناز اور نہ وہ جو من بھائے اور آنکھوں میں سمائے پھر کنول جی یہ بادل آنکھوں میں برس گئے۔ بہت دیر ہو گئی۔ شاید سورج گزر گیا۔ چاند جل گیا اور ستارے وہ سب آنکھوں میں۔" اس نے آنچل سے آنکھوں کو صاف کیا جو تواتر سے برس رہی تھیں۔ وہ دبے قدموں جب زینے سے اتر رہی تھی۔ اس وقت رات کا پچھلا پہر تھا، لیکن پھوپھو جی جو ایک ضعیف دھان پان سی عورت تھیں۔ کس بے نیازی سے جائے نماز پر سر رکھے سو گئی تھیں۔ ان کا دل قرب الٰہی سے معمور تھا اور یاد اللہ میں کس طرح غرق تھیں کہ انھیں سجدے میں نیند آ گئی۔ وہ کتنی دیر تک انھیں محبت بھری نظروں سے دیکھتی رہی۔

"پھوپھو ماہ و سال کی اس دنیا میں اب مہمان ہیں اور کتنے دن یہ زندہ رہیں گی۔ کنول تم نے بہت دیر کر دی۔ اماں تم نے انصاف نہیں کیا۔" دکھ سے پھر ایک بار آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ ان کے قریب تخت پر بیٹھ گئی۔ پیار سے اس نے سفید بالوں میں اپنی انگلیاں پھیریں تو پھوپھو کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"بیٹا! تم جاگ رہی ہو؟" ان کی آواز میں حیرت تھی۔

"میں تو برسوں سے جاگ رہی ہوں پھوپھو جی!" اس نے اپنا سر ان کے پہلو میں یوں رکھا کہ بوجھ نہ محسوس ہو اور لیٹی بھی رہیں۔ کتنی بڑی پناہ گاہ ہے، کیسا راحت رساں احساس چھا رہا ہے۔ دل چاہ رہا ہے کہ برسوں یونہی سر رکھے لیٹی رہوں اور وقت رک جائے۔ لیکن نہیں ایسا کب ہوگا، سے بیتے گا اور میں یہاں سے دور چلی جاؤں گی۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ میں پھوپھو کو ساتھ لے جاؤں۔ وہ اس بڑی

حویلی میں اکیلی جان تنہا کیا کریں گی؟ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ کچھ سوچ رہی ہے، پھر اس نے پھوپھو کا بڑا سا دوپٹہ کھینچ کر اس کے اندر اپنا سر چھپا لیا۔ گویا وہ محفوظ پناہ گاہ میں آ گئی۔ آج اسے آئے ہوئے ہفتہ بیت گیا تھا۔ پھوپھو سے باہر جانے کی اجازت لے چکی تھی۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے غسل کر کے آئی تھی۔ میرون سوٹ میں وہ اسمارٹ نظر آ رہی تھی۔ آئینے میں دیکھ کر اسے بابر کی شوخیاں یاد آ گئیں۔ اسے یہ رنگ بہت پسند تھا۔ ایک اچھا جملہ، کوئی شعر ضرور اس کی شان میں کہتا۔ وہ ہمیشہ ہی اپنی خوشی چھپا جاتی۔ چاہتے ہوئے بھی وہ بابر سے مسکرا کر کچھ نہ کہہ سکی۔ ایک ہی خلش ہونٹوں اور دل میں دبی رہتی تھی اور آج بھی وہ بے کل سی تھی۔ بے قراری چہرے سے عیاں تھی، لیکن وہ کس سے کہتی، کیا کہتی۔ پھوپھو سے کہ وہ آج بھی اپنے بچپن کے اس واہمہ کو دل سے لگائے بیٹھی ہے۔ آج بھی اس کا پریمی، من میں اگنی جلائے ہے۔ کیا کہتی بھلا؟ اس لئے آج وہ گھر سے باہر نکل رہی تھی۔ شاید کسی بھیڑ میں، کسی تالاب کے کنارے کسی درخت کے سائے میں وہ نظر آ جائے اور وہ صرف ایک بار جو بھی اسے دیکھ لے، من کا بھید جان لے کہ وہ کیا ہے خواب یا حقیقت، کوئی تو صورت حال واضح ہو۔ اس نے اپنا کیمرہ اپنے دائیں شانے پر لٹکا لیا اور بڑے سے شاپنگ بیگ کو اٹھاتے ہوئے مخاطب ہوئی تھی۔ پھوپھو نے آیۃ الکرسی پڑھ کر دم کیا۔ وہ اس پیار بھری ادا پر ان کے گلے لگ گئی۔ دل بھر کر اس نے اس نورانی چہرے کو چوما۔ آخری بوسہ اس نے ماتھے پر دیا اور بولی۔

”اچھا بھئی پھوپھو جی اللہ حافظ۔“

”اللہ حافظ۔“ پھوپھو ڈیوڑھی تک چھوڑنے آئیں۔

”ارے پھوپھو جی! آپ جائیں، میں چلی جاؤں گی۔“ لیکن پھوپھو اسے اس وقت تک دیکھتی رہیں جب تک نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔ اس کے بعد وہ بھاری سا دروازہ بند ہو گیا اور وہ دوسری طرف مڑ گئی۔ بہت دور تک وہ پیدل چلتی رہی۔ وہی پگڈنڈیاں، وہ بھیڑ راستے، گندے ندی نالے، غلیظ کپڑوں میں بھاگتے دوڑتے لوگ۔ غریب غریب تر نظر آ رہا تھا سب کچھ وہی ہر اسٹیج پر بس وہ پہلے والا اداکار نہیں تھا۔ اس بھیڑ میں کوئی چہرہ، کوئی شناسا فرد، کوئی اپنا نہیں تھا۔ حتیٰ کہ اب یہ زمین بھی اجنبی بن گئی۔ کون وہ آدم خود عفریت تھے جو ہمیں اپنوں میں اجنبی بنا گئے۔ کبھی یہ لوگ، یہ سبزہ، یہ درخت، یہ ندی نالے، یہ قرب و جوار میں بہنے والے دریا، یہ محنت کش ملاح صرف ایک محبت کا گیت گاتے تھے۔

لیکن بے رحم عفریت نے ہمیں بانٹ دیا اور جدا جدا ہو گئے۔ اس تقسیم کا شکار صرف غریب ہوا۔ جو آج بھی جسم سے ننگا اور پیٹ خالی ہے۔ اس کے سامنے ایک گداگر کا ہاتھ پھیلا ہوا تھا جو کہہ رہا تھا۔

”پربھی! کچھ دے دے۔“ بھیک مانگنے والا بنگالی میں نہیں اردو میں بھیک مانگ رہا تھا۔ اس نے بیگ سے چند روپے اس کے پیالے میں ڈالے اور آگے بڑھ گئی۔ راستے جانے پہچانے تھے، لیکن راستوں پر چلنے والے اجنبی لوگ، لیکن ان کے درمیان ایک ماضی کا رشتہ تھا۔ اسے یاد آیا کہ یہ تو اس کے اسکول کا راستہ ہے، گاڑی اسی پل سے گزرتی تھی۔ وہاں خالی میدان تھا وہ چلتی رہی نامعلوم منزل کی طرف۔ تھوڑی دور جا کر وہ ٹھہر گئی۔ اسکول کے باہر بچے نظر آئے۔

”اس بھیڑ میں کہاں گم ہو گئی ہوں۔ کہاں چلے گئے وہ پل..... وہ رات دن بھاگتے بچوں میں سنبل کہاں ہے۔ کیوں نظر نہیں آ رہی۔ اسی بنچ پر بیٹھ کر وہ ڈرائیور کا انتظار کرتی تھی۔ کیسا لگتا تھا جس دن اماں ساتھ ہوتیں۔ اسی پل پر سے گزر کر میں ہاتھ پکڑے کتنی بار گزر رہی ہوں لیکن یہ ہاتھ اب۔“ اس نے مٹھی کھول کر دیکھی۔ خالی تھی وہ آگے بڑھ گئی۔ وہ چلتی ہوئی قطار در قطار ناریل کے درختوں کے نیچے سے گزری تو پاؤں خود رک گئے۔ اونچے اونچے پرانے درخت گھنے سایہ دار اطراف میں چھوٹی چھوٹی دکانیں کھلے میدان میں آج بھی حجام شیو بنا رہا ہے کھوے سے کھوا چل رہا ہے وہی گھنے درختوں تلے اسی جگہ، اسی دن بیراگیوں کی ایک ٹولی نے اپنا ڈیرہ ڈالا ہوا تھا۔ گیروے رنگ کے کپڑوں میں ملبوس وہ سانولی سی بیراگن ناچ رہی تھی۔ کتنے لوگوں کی بھیڑ تھی اس بھیڑ میں پہلی بار میں نے عبداللہ کی شوخ نظریں اپنے چہرے پر محسوس کی تھیں۔ شعور کا پہلا لمس جاگا تو وہ بس اچھا لگا۔ عبداللہ ان کی حویلی کے پیچھے ہی تو رہتا تھا۔ وہ کسی پاتال میں اتر گئی تھی۔ ساری سدھ بدھ کھو دی تھی، بھکارت کی پہلی پھوہار بنا تن بھیگے، من بھیگے کون جانے، وہ کیسی پیاسی من جلی تھی۔ باہر اجلی اجلی دھوپ اندر صرف پیاس کا سمندر ہتھیلی میں بارش رکی تو وحشی سر سے سرک جاتی۔ ابھی اتنا شعور کہاں کہ رنگوں کی کسی برسات میں اپنے رنگ سے رنگتی۔ وہ تو میں خود پیار رنگ میں رنگ گئی تھی تب ہی تو آنکھوں سے سارے روپ وہ چرا لے گیا تھا اور کنول جی! تم خالی خالی رہتی ہوئی بارش کی پھوہاریں صرف اس لئے بھیگتی رہتیں کہ عبداللہ یہاں سے گزرے گا، سنبل تپ رہی تھی۔

”کنول! جلدی کرو۔ بارش تیز ہو گئی ہے۔“ اور وہ پانی کے تیز ریلے کو پاؤں سے اچھال رہی تھی گویا

اس نے سنبل کی بات ہی نہ سنی ہو۔ وہ بازو پکڑ کر کھینچ رہی تھی۔ وہ دور نظریں جمائے پانی کا اچھال رہی تھی۔ جب دل میں ٹھنڈ پڑ گئی۔ عبداللہ جو نظر آ گیا تھا۔ بس وہ ایک مسکراہٹ، ایک حیات کا آخری پل تھا۔ جو سمیٹ کر وہ اسکول کے اندر چلی گئی۔ ساری کائنات من میں سما گئی۔ کنول پور پور اس سے ڈوب گئی۔ سب یاد ہے ذرا ذرا سورج سر پر چڑھ آیا۔

''بس دل چاہے آنکھ بند کر کے اس تصور جاناں میں کھوئی رہوں اور کچھ نہ سوجھے بارش تیز، ہوا، سیاہ بادل دریا کے شور مچاتے کنارے سب ہم رنگ ہو گئے۔ دھوپ سہانی لگے من کہے کہ یہ سب موسم اپنے ہم رنگ رہیں۔

آنسوؤں سے اس کا چہرہ بھیگ رہا تھا۔ وہ پیدل چلتے چلتے بہت دور نکل آئی تھی بستی کے لوگ سب کچھ بہت دور رہ گیا تھا۔ اس نے کئی تصویریں بنائیں ڈھیروں شاپنگ کی شام ہونے سے پہلے وہ تصویریں ایک فوٹو شاپ پر دے کر گھر لوٹنے لگی پھوپھو انتظار کر رہی ہوں گی۔ رات بھی ہونے لگی ہے۔ وہ تمام یادوں سے آزاد صرف آنے کی جلدی میں تھی۔ جب وہ گھر پہنچی تو واقعی پھوپھو اس کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھیں۔ وہ تھکی ہاری پھوپھو کے ہی پلنگ پر گر گئی۔

''کیا کیا اٹھا لائیں بازار سے؟'' پھوپھو نے ڈھیروں پیکٹس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''بس پھوپھو! کچھ تو میری چیزیں ہیں اور کچھ فرمائش کرنے والوں کی اور ایک آدھ خالہ جان کے لئے بھی میں نے ساڑھیاں خرید لی ہیں۔ انہیں ڈھاکہ کی کاٹن کی ساڑیاں پسند ہیں بس۔'' اس نے ساری ہی چیزوں کی تفصیل بتائی۔

''خیر تم تھوڑا آرام کر لو پھر روٹی کھانا۔'' پھوپھو کافی دیر تک اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہیں۔ وہ بچوں کی طرح لیٹی ناز اٹھواتی رہی۔ وہ بچوں کے انداز میں آج بھی اس انداز میں پھوپھو کے بازو والی چارپائی پر لیٹی رہی۔ پتہ نہیں کب اسے نیند آئی اور کب تک وہ انگلیاں بالوں میں چلاتی رہیں کب نیند آتی اور کب کتنے ماضی کے دریچوں سے وہ باہر آ گئی۔ پھوپھو تو کچھ نہ جان سکیں۔ وہ آنکھیں میچے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی رہی۔

☆☆

حسب معمول پھر وہ سیر کے لئے باہر نکل گئی۔ قدم قدم پر یادیں بکھری پڑی تھیں لیکن اس بھیڑ میں وہ

جسے تلاش کر رہی تھی وہ نہیں ملا تھا۔ وہ عبداللہ کو ہر جگہ پر پوچھ چکی تھی۔ پتا پتا بوٹا بوٹا اس کے حال دل سے واقف تھا لیکن وہ گل کی تلاش میں تھک ہار کر آج بھی گھر لوٹی تو بہت تھک چکی تھی۔ پھوپھو رات کے کھانے پر اس کا انتظار کر رہی تھیں کافی دیر ہو گئی تھی۔ وہ اس وجہ سے شرمندہ تھی لیکن اس نے پیار اور محبت سے پھوپھو کو آج بھی رام کر لیا۔

''دراصل پھوپھو! پھر نہ جانے کب آنا ہو۔ اس لئے میں ایک ایک جگہ گھوم رہی ہوں۔'' اس نے پھوپھو کے ہاتھ سے لقمہ منہ میں رکھ لیا۔ پھوپھو ہنس دیں لیکن انہوں نے گہری نظروں سے دیکھا تو کنول کو اپنے من کا چور چھپانا مشکل ہو گیا۔ کانپ گئی لیکن وہ نظریں جھکائے لقمے چباتی رہی۔ جب رات آئی تو وہ بہت بے چین سی کروٹیں بدل رہی تھی گزری زندگی کے وہ جملے جو اماں ابا سے کہتی تھیں یاد آ رہے تھے۔

میں تو ایک نڈر لڑکی تھی پھر یہ آج کیا ہوا کیوں ان دالانوں سے خوف آنے لگا؟'' دل زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ پھوپھو نے اٹھ کر روشنی کر دی۔ پھوپھو تہجد پڑھ رہی تھیں۔ وہ خاموش بستر پر لیٹی پسینہ میں شرابور ہو رہی تھی۔

میں تمام نگر بستی بستی قریہ قریہ عبداللہ کو ڈھونڈ چکی یقیناً عبداللہ کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ جو کچھ اماں نے کہا تھا وہی ٹھیک تھا۔ میری نظر کا دھوکا اماں کا خیال تھا۔ بس اب لوٹ جانا چاہئے لیکن اس بار میں اکیلی نہیں جاؤں گی۔ پھوپھو ہمارے ساتھ ہوں گی ان کی زندگی ہی اب کتنی ہے۔ کس قدر کمزور ہو گئی ہیں ان کو ہماری ضرورت ہے۔'' اس کا بس چلتا تو وہ ابھی اور اسی وقت اٹھ کر اس سناٹے سے کہیں دور بھاگ جاتی۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا لیکن وہ اس اندھیرے میں کہاں جائے کس طرح جائے؟ وہ خاموش لیٹی رہی۔ ہوا کی آہٹ سے آج اسے خوف آ رہا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی نیند کوسوں دور تھی۔ ہر سانس پر اسے خوف کا احساس ہو رہا تھا۔ شکر کہ سورج کی کرن نکلی اور چڑیوں کی پہلی چہکار پر کود کر بستر چھوڑ کر باتھ روم میں گھس گئی۔ کتنی دیر تک وہ شاور لیتی رہی لیکن اندر کا ڈر باہر نہ آیا۔ جیسے تیسے اس نے ناشتہ کیا۔

''بس پھوپھو! مجھے کچھ لینا ہے۔'' وہ جلدی جلدی تیار ہو رہی تھی۔

''اتنی صبح تو کوئی دکان بھی نہیں کھلی ملے گی۔''

''ٹھیک ہے، میں تھوڑا ادھر ادھر گھوم لوں گی۔'' وہ جلدی جلدی برش کر رہی تھی۔ آج بارش کے شدید

آثار تھے۔ اس نے چھتری اور کیمرا جلدی سے بیگ میں ڈالا اور پھپھو کو خدا حافظ کہہ کر نکل گئی۔
پھوپھو حیران پریشان دیکھتی رہ گئیں۔

☆☆

"آج یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ نڈر اور خوف و خطر سے کھیلنے والی کنول اتنی بزدل کیوں ہو گئی ہے؟" اس کے قدموں کی رفتار تیز تھی۔ کچھ دور تک وہ یونہی چلتی رہی۔ بے مقصد وہ گھومتی رہی۔ گلیوں اور سڑکوں پر سناٹا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انسانوں کے آتے جاتے ہجوم میں خود کو بہتر محسوس کر رہی تھی۔ فٹ پاتھ پر بکنے والی چیزوں کو وہ یونہی دیکھتی رہی بلا مقصد چیزوں کو دیکھتی اور چلتی رہی۔ کئی جگہ پر رک کر اس نے کچھ چیزیں بھی خریدیں۔ دیکھتے دیکھتے بارش تیز ہو گئی۔ سامنے ہی ایک سرخ اینٹوں کا بنا ولیج ٹائپ ریسٹورنٹ تھا۔ وہ چھتری کو بند کر کے اس میں داخل ہو گئی۔ سامنے خالی ٹیبل پر وہ بیٹھ گئی۔ سارے چہرے اجنبی تھے۔ صرف ایک مانوس کافی اور چائے کی مہک تھی۔ کبھی وہ یہاں آتی تھی لیکن آج وہ تنہا بیٹھی تھی۔ سامنے شیشے سے اس نے باہر دیکھا بہت تیز موسلا دھار بارش گر رہی تھی۔ درد کے بھیگتے لمحوں کی تلاش میں یہاں تک آ گئی کاش وہ لمحہ جو بیت گیا ہے واپس آ جائے۔ آنسو تواتر سے بہہ رہے تھے۔

پھوپھو کے گھر سے بھی آج آخر فرار چاہ رہی ہوں زندگی کے کتنے لمحوں کا حسن چوری ہو گیا۔ باقی جو رہ گیا وہ راکھ ہے۔ دل کی تہوں میں کنول حسن جھانکو پاتال کی نگری میں اترو تو تم خود اپنا راز آپ بن جاؤ گی۔ یہ عشق یہ جستجو نہیں تھی۔ عبداللہ نام ہے صرف اسی انا کا جو تمہارے وجود کے اندر ہے نہ یہ محبت ہے اور نہ ہی کوئی سر چڑھا عشق بس تم خود کسی انا کے خول میں بند ہو۔ محبت اگر عبداللہ سے ہوتی تو بابر کے نام پر دل کے سارے تار جلترنگ کی طرح نہ بج اٹھتے یہ کہو کہ خوف اور انا نے اس عشق کو زندہ رکھنے میں مدد کی ہے۔ جو چیز صاف نظر نہ آئے اسی کی کوئی صورت بنا لینا دانش مندی نہیں۔ تم صرف ایک خیال، ایک سائے کے لئے بابر کی محبت کو جھٹلاتی رہیں۔ تم نے اپنے آپ کو اس نام کے ساتھ صرف اس لئے جوڑ لیا کہ اپنے کردار کی بلندی ثابت نہ کر سکو۔ بابر کے احساسات کو رد کرنا صرف خودداری تھی۔ انا پرستی، زندگی سے فرار کا نام ہی شاید عبداللہ تھا اور کسی سے رشتہ نہ جوڑنا بابر کی نسبت کا اقرار ہے جو تم کل نہ کر سکیں اور شاید کبھی نہ کر سکو۔ اب بہت دیر ہو گئی کنول اٹھو اور گھر لوٹ جاؤ تو ہار گئی۔ کاش عبداللہ کی بات اتنی دور تک نہ پھیلی ہوتی۔ کاش میں اتنی میچور ہوتی کہ اس سایہ کی حقیقت کو پہچان لیتی

یا پھر اتنی بہادر ہوتی کہ کہہ سکتی کہ وہ تو صرف ایک بھول، ایک لرزش کے سوا کچھ نہ تھا لیکن نہیں وقت کے ساتھ ساتھ میں اس سائے کو ایک روپ دے کر اسے امر کرنے چلی تھی۔" سامنے میز پر کافی رکھے رکھے ٹھنڈی ہو گئی بارش تھوڑی رک گئی تھی۔ فرار کا وقت بھی اب اس کے پاس باقی نہیں تھا۔ سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ وہ ناچار اٹھی۔ حویلی کے کچھ ہی فاصلے پر اس نے رکشہ کو رکوا دیا جب وہ گھر کے سامنے آئی تو دل دھک سے ہو گیا۔ گھر کے سامنے لوگوں کا جم غفیر تھا۔ پرس ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔

"یا اللہ خیر شاید پھوپھو کا انتقال ہو گیا۔" دل زور سے لرزا وہ آہستہ آہستہ لوگوں کے درمیان چلی آئی۔
گھر کے اندر سے پھوپھو کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"آج میں اسے چھوڑوں گی نہیں آج تھک گئی ہوں۔" ان کی آواز غصے سے لرز رہی تھی۔ وہ کسی چیز پر ڈنڈے مار رہی تھیں۔ وہ تھوڑا آگے اور بڑھی آوازیں ابھی تک آ رہی تھیں اندر سے دروازہ بند تھا۔ ہر شخص کی نظر بند دروازے پر لگی تھی۔ وہ بھی بھیڑ میں کھڑی اسی طرف دیکھ رہی تھی۔

"یہ پھوپھو کو کیا ہو گیا ہے؟" وہ نروس تھی۔ یک بارگی لکڑی کے بھاری دروازے کے باہر کی بھاری زنجیر ہلی اور آواز کے ساتھ دروازہ کھلا۔ دروازے کے کھلتے ہی ایک سنہرا بالکل سونے کے رنگ کا پرندہ اندر سے باہر نکلا ہر شخص نے اسے تکتے دیکھا اور سروں سے صرف دو فٹ کے بعد ہی وہ غائب ہو گیا۔ ہر شخص حیران دم بخود کھڑا رہ گیا۔ جتنے منہ اتنی باتیں وہ بھی حیران سی کھڑی تھی۔ بھیڑ کم ہوتی گئی وہ تنہا کھڑی رہ گئی۔ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں جائے۔ پاؤں من من بھاری ہو رہے تھے۔ خوف سے وہ منجمد لگ رہی تھی۔ اندر جاؤں یا لوٹ جاؤں کس سمت جاؤں یہ سب کیا ہے یہ کیوں ہوا؟ سنہرا پرندہ کہاں گیا۔ کیوں آنکھوں سے ایک پل میں اوجھل ہو گیا۔ آخر وہ دو فٹ کے بعد کہاں گیا؟ اور اب پھوپھو کی آوازیں کیوں بند ہو گئیں؟" مٹی کے بت میں ساری آوازیں گونجتی رہیں لیکن جواب کا کوئی در نہیں تھا۔ پاؤں زمین میں دھنس گئے تھے۔ خوف اور مایوسی نے اپنے آپ سے جدا کر دیا تھا۔ کسی نے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ لرز گئی۔

"کیوں بیٹی باہر کھڑی ہو؟" ہاجرہ نے جھک کر زمین سے بیگ اٹھایا۔ اس نے خاموش نظروں سے دیکھا ہاجرہ 85 سال کی تھی، رنگ سیاہ، دانت سفید تھے سر کے بالوں کا جوڑا اور سفید رنگ کی ساڑھی میں وہ اسے ایک پراسرار سایہ لگی۔ دو قدم وہ خوف سے پیچھے ہٹی لیکن جلد ہی وہ پہچان گئی کہ یہ تو گھر میں کام

کرنے والی ملازمہ ہاجرہ جو دن کی چھٹی میں باہر گئی تھی۔ ہاجرہ نے پھر سوال کیا تھا۔

"کیا ہوا کیوں چپ ہو؟" اس نے ادھ کھلے دروازے کی طرف دیکھا اور ہاتھ پکڑ کر اندر داخل ہوئی وہ مرے قدموں سے چل تو دی تھی لیکن جسم و جاں سے خالی خالی ذہن ماؤف تھا۔ آنکھوں کے سامنے وہ سنہرا پرندہ ناچ رہا تھا لوگوں کی آوازیں پتھر کے بت کی طرح وہ چلتی ہوئی ہاجرہ کے سہارے بڑے کمرے سے گزر کر پھوپھو کے کمرے میں آئی۔ پھوپھو نڈھال سی پلنگ پر گری پڑی تھیں اسے دیکھ کر اٹھ بیٹھیں اس سے پہلے کہ ہاجرہ منہ کھولے وہ نیم مردہ سی کنول سے مخاطب تھیں۔

"آج تھک گئی تھی۔ بات کسی سے کروں نپ بیچ میں یہ بولنے لگتا۔ دھیان تمہاری طرف تھا سوچ میں رہتی تھی جواب یہ دے رہا تھا۔ بس آج صبر کا آخری دن تھا۔ میں نے کہا تھا ناں کہ جس دن یہ اٹھ گیا اس دن آخری دن ہوگا۔" انہوں نے پاس رکھے ہوئے ڈنڈے کی طرف دیکھا۔ پھوپھو کی آواز پر وہ جاگ گئی۔

"پھوپھو!" اس کی آواز آہستہ سے نکلی وہ سسک پڑی۔

"یہ سب کیا ہے پھوپھو؟" اس کی آنکھوں سے تواتر سے آنسو بہہ نکلے۔ پھوپھو نے پیار سے اسے اپنے قریب کرلیا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ آگ میں جل رہی ہو۔ آج پھوپھو کے قرب کی ٹھنڈک سے خوف آرہا تھا۔ پھوپھو کی انگلیاں اس کے بالوں میں تھیں اور وہ محبت کی بجائے تپش محسوس کررہی تھی پھوپھو کی آواز پھر سماعت سے ٹکرائی۔

"بس آج جو کچھ ہوا، وہ میرے بس میں نہیں تھا لیکن آج مجبور ہوگئی تھی، جھک گئی تھی، ہار گئی تھی۔ میں تمہارے خیال میں ہلکان ہورہی تھی اور وہ جواب دے رہا تھا۔ پٹ سے بیچ میں بول پڑا تو صبر کا پیالہ چھلک پڑا۔" پیار سے انگلیاں رک گئیں۔

"گویا پھوپھو آپ کے علاوہ بھی کوئی اور رہتا اس گھر میں؟" وہ تڑپ کر ان کے پہلو سے الگ ہوگئی۔

"پھوپھو! تھا ناں کوئی اور؟" اس کی سانس یہ کہتے ہوئے رکنے لگی۔ پھوپھو ٹال رہی تھیں۔

"پھوپھو بولیں۔" اصرار بڑھ رہا تھا۔

"اور، پھوپھو، وہ!" کنول لرز گئی۔ پھوپھو اپنے انکشاف پر شرمندہ تھیں۔

"اتنا بڑا گھاؤ کس کھاتے میں ڈالوں کہ تن، داغ داغ لٹا دیا اور ہاتھ، ہی دیمک بھری چھاؤں نہ اماں نہ

ابا اور بابر، وہ میری انا کی تپسیا میں جل گیا۔" زبان خشک ہورہی تھی وہ ساکت تھی۔ ہر لمحہ کوئی اسے بلا رہا تھا۔ مدھر گیتوں کی آواز بانسری کی سریلی دھن پر اس کے وجود کے اندر ماہ و سال رقص کررہے تھے ہاجرہ نے اسے پانی پلایا تو وہ ہوش میں آئی لیکن اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوجائے پانی کا آخری گھونٹ پی کر وہ بے بسی سے بے اختیار رونے لگی۔ یہ سب کیا ہے، خواب یا حقیقت یقین اور بے یقینی کی سمت کا تعین کرنا اب اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ پھوپھو نے ڈھیروں دلاسے دیئے لیکن بس وہ روئے جارہی تھی۔ ماحول میں کیسا ملگجا اندھیرا چھا گیا تھا اور چاروں سمت ہو کا عالم ہاجرہ جاچکی تھی اور وہ پھوپھو کے ساتھ کمرے میں ایک خوف زدہ لڑکی کی طرح سہمی بیٹھی تھی کس سمت چلی جائے عقل سے یہ بات خارج تھی دوسرے ہی دن صبح اس نے اچانک جانے کا فیصلہ کرلیا پھوپھو کا دل دھک سے ہوا، وہ کپڑے اٹیچی میں واپس رکھ رہی تھی۔ وہ پھوپھو کو آتا دیکھ کر بول پڑی۔

"بس پھوپھو میں اب جانا چاہتی ہوں۔" اس نے اٹیچی بند کرلی تھی۔

"کیوں؟ ابھی تو تمہاری چھٹیاں باقی ہیں۔" پھوپھو نے دکھی لہجے میں کہا تو اس نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا جو ہزاروں زاویوں سے صرف ایک زاویہ پر مرکوز تھا اور وہ تنہائی تھی۔

"محبت میں انسان خود غرض ہوجاتا ہے اور اگر وہی نہ ہاتھ آئے تو سب کچھ خاک ہوجاتا ہے۔ تم سب کچھ خاک کرکے صرف اس لئے جارہی ہو کہ تمہارے اندر ایک خوف غالب آگیا اور میری طرف دیکھو میں نے کتنے اندیشوں کو دل میں دفن کررکھا ہے۔" پھوپھو کے ساتھ اس کے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا بلکہ چور سی بن کر اٹیچی کو کھولنے لگی۔ پھوپھو پھر مخاطب تھیں۔

"میں نے تمام محبتوں کو سلا دیا تھا تم آئیں تو یہ دل میں انکھوے کی طرح پھوٹ پڑیں۔" آنکھیں بھر آئیں تو انہوں نے دوپٹے کے آنچل سے آنکھیں صاف کیں لیکن ان کے نمکین پانی سے پورا چہرہ تر تھا۔ کنول کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی۔

"کیا انسان خوف سے خود غرض ہوجاتا ہے۔ میں کیا بزدل ہوں یا اتنی کمزور کہ ایک نظر پھوپھو سے ملا بھی نہ سکوں۔" اس نے ایک نظر اس ممتا بھری سسکتی پھوپھو کی طرف کیا دیکھا کنول کی آنکھوں کے سارے آبگینے ٹوٹ گئے۔ وہ پھوپھو سے ایک بار پھر لپٹ گئی۔

"پھوپھو جی! میں آپ کو اس طرح یہاں اکیلے چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ آپ ساتھ چلیں میں اتنی خود

غرض نہیں کہ آپ کو تنہا چھوڑ کر چلی جاؤں آپ کے بغیر جو وقت گزر گیا وہ اللہ تعالیٰ کی مصلحت تھی لیکن اب ایسا ممکن نہیں اور نہ ہی ہماری تہذیب میں ہے کہ آپ کو دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ آپ تو ہمارے خاندان کا آخری قیمتی سرمایہ ہیں نہ ابا ہوتے تو آپ کبھی کی ساتھ ہوتیں۔'' اس نے ہچکیوں میں بات مکمل کی تو پھوپھو نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس نے جلدی سے پھوپھو کے ہونٹوں پر نمکین پانی کو اپنے ہونٹوں سے چن لیا۔ تو یہ سب بھول بھلیاں کا ایک ہی منظر تھا۔ صرف نام الگ تن کے سارے رنگ اسی رنگ میں انگ انگ کے پور تک بھیگتے رہے اور من بے خبر رہا منتروں بھری پٹاری کے وہ علم و ہنر کہاں گئے کنول جی! یہ کیا نہ صبح نہ شام سب ماٹی کے کھیل میں یہاں تک چلی آئی کیسی من تپسیا تھی کہ میں شعور اور آگہی میں تن جلا بیٹھی بھلا بتاؤ کوئی یوں جلے ہے کہ تن خاک ہو نہ راکھ بس پیا ملن کی آس میں سدھ بدھ کھو بیٹھے۔ سے بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ من اندر سے ڈوب گیا۔

''کون سے کا رنگ سب جلے جلے روپ ہیں؟ تو آج میں یہاں پر رکواں کل کی آپ سدھ بدھ میں یہاں چلی آئی میں تو پہلے ہی دن جان گئی تھی کہ کنول جی یوں پھوپھو کے لئے دوڑی چلی آئیں گی۔ چلو اچھا ہوا سب ہی تن خالی ہو جائیں پھر کون بھرے رنگ بڑا مان لے کر چلی ہے تاں میں نے کہلا بھیجا ہے کہ ایک بار آ کر وہ مل جائے جس کے درشن یہاں تک لے آئے ہیں۔ ایسا تیرا روپ رو دے گا کنول کہ من بھر آئے گا سارے عشق روشن ہو جائیں گے صرف ایک نظر اگر عبداللہ کو دیکھ لے۔'' پھوپھو نے آج اس کے من کے دریچے سے پردہ گرا دیا۔ وہ دھک سے رہ گئی۔

''ہائے پھوپھو تو من کے بھید تک لے آتی ہیں یہ اسی کے سب رنگ ہیں جس رنگ میں پھوپھو پور پور بھیگ گئیں جو ابھی ابھی ایک پل میں سب کے سامنے اوجھل ہو گیا۔'' اسے پھوپھو کی ذات پر یقین تھا ہر چند کہ آج کے ہونے والے واقعہ سے وہ خاصی خوفزدہ تھی لیکن من تک سرشاری اتر گئی تو پھوپھو نے اسے بلا بھیجا ہے وہ آئے گا، جلترنگ بج اٹھے سارے پھر جاگ پڑے من بھی کھل گیا روپ کے سارے رنگ جاگ پڑے برسوں سے سوئی ہوئی شہزادی شہزادے کی ایک جھلک سے جاگ اٹھے گی۔ ایسی چھب ہار کرے گی کہ وہ سارے باسی پھول پھر مہک مہک اٹھیں گے اور شہزادی وہ مسکرائی اس نے آنسو پونچھ لئے من جاگ گیا تھا اور خوف ڈھل سا گیا۔ کسی پل بھی وہ آئے گا پھوپھو نے اسے بلا بھیجا ہے۔ من دھیرے سے مسکایا کہیں پھوپھو کو خبر نہ ہو جائے لیکن پھوپھو، اس نے چور نظروں سے ان کی طرف

دیکھا عشا کی نماز میں مشغول ہو چکی تھیں۔ وہ آہستہ سے اٹھی اس نے کپڑے بھی نہ تبدیل کئے عجیب سرور چھا رہا تھا وہ یونہی بستر پر لیٹ گئی ایک پل کا خوف برسوں کی دھوپ چھاؤں میں لے آیا آج جو ہوا کاش وہ کل ہو جاتا میں پھوپھو سے ہی پوچھ لیتی۔ اس نے بایاں بازو آنکھوں پر رکھ لیا یوں لگا وہ سو رہی ہے لیکن ایسا بھلا کب تھا وہ تو چپکے سے گزرے سمے پھر چپکے سے اماں کی آنکھ بچا کر اس جھروکے میں جا کھڑی ہوئی تھی جو آج مقفل تھا۔ جہاں اندھیرا اور سناٹا تھا۔ مدھم مدھم دیئے کی روشنی میں ہرے بھرے ناریل کے ڈھیر کے قریب عبداللہ کا سایہ دور تک نظر آ رہا تھا چراغ کی روشنی میں ذہن کے نقش نظر آ رہے تھے وہ کسی بات پر اپنی ماں سے کچھ کہہ رہا تھا ماں سے بات کا انداز دہنے کا انداز نجانے کیا بات تھی سانولی رنگت کا روپ کیا روپ تھا؟ کتنا اجالا بڑھ گیا تھا پر جب اس نے ایک نظر چوری سے اوپر جھروکے پر ڈالی تھی ساری دیوالی تو منڈیروں پر جل اٹھی یوں لگا رانگنی گا رہا ہے اور سارے جھرنے اس کے ہم آواز ہیں ہر طرف دیپ ہی دیپ صرف ایک نظر عبداللہ کی اٹھی کہ دل کھل اٹھا۔ اس نے ہاتھ ہٹا کر دیکھا ابھی تک ہاجرہ کھانا لگانے نہیں آئی تھی۔ آج دیر ہو گئی تھی لیکن یوں لگ رہا تھا کہ ابھی ابھی سورج دھرتی کے اس پار گیا ہے پھر کہاں دیر ہو گئی؟ پھوپھو کی عادت تھی کہ بات کو وقفہ وقفہ سے دہراتی رہتیں۔ پھر یہی ہوا پھوپھو کی آواز سے اس کے وجود کا سناٹا ٹوٹ گیا۔

''کنول!'' وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسی سمت دیکھنے لگی کہ اب پھوپھو کیا حکم دیتی ہیں۔

''جی پھوپھو۔'' آلکسی سے اٹھ بیٹھی۔

''تم بھی آس میں جی چھوڑ چکی ہو میں برسوں سے جان رہی ہوں۔ ایک دو دن میں وہ آئے گا میں نے کہلا بھیجا ہے بہت ممکن ہے کہ وہ کل ہی آ جائے۔'' پھوپھو یہ کہتی ہوئی تخت سے اٹھنے لگیں۔

''ہائے کیسی پھوپھو جی ہیں کہ سب من کے راز تن جلے کی خبر کیسے ہوئی کون سا ایسا رنگ تھا کہ چہرہ پر آیا تو میری حیات کے سارے پل بکھیر گیا کیا میں اتنی نادان تھی یا پھر پھوپھو ہماری عقل سے بالاتر یا پھر کسی ایسی قوت کی مالک کہ من کا راز جانیں اور آنکھیں رکھیں بند میں بھی کیا ہوں کیا کہوں کیا بولوں کچھ بھی نہ سوجھے بس دل وہ تو ابھی سے دھڑک رہا ہے نجانے درشن کی صورت کیا ہوگی؟ گلاب آئیں گے یا پلکوں پہ دیپ جلیں گے۔ سماعت پہ کان دھروں گی کہ بصیرت کے موتی چنوں گی اللہ جانے کون سے رنگ میں اتر جاؤں کہیں تن من دونوں ہی نہ میں کھو دوں بس یہ آگئی یہ دھوپ جس میں کنول پور پور جلی

پرندرا کھ بنی نہ کہلا۔ اب کندن کے روپ کون جانے کیا ہوں یہ سہانا خواب ٹوٹ جائے یا بکھر جائے پر دید کا موسم آئے ضرور میں تن من دونوں تج دوں گی۔ لیکن پیا ملن کی آس میں دل دھڑ دھڑ ہونے لگا۔ کھانا کھا کر جب وہ دوبارہ بیڈ پر گئی تو لمحہ بھر کو لرز گئی۔

''کہیں اماں کی حقیقت اور سنبل کا خوف تو نہیں کہیں پھوپھو جی والا۔'' سارا بدن ٹھنڈا پڑ گیا۔ من اگنی بجھ سی گئی وہ پسینے میں شرابور ہو گئی۔

''لیکن پھوپھو تو سب کچھ جانتی ہیں پر کیا بھروسا۔'' وہ پھر بے یقین ہو گئی کب سوئی کب جاگی جسم میں خوف کا پہرہ رہا آنکھوں میں خواب دھرے جلتے رہے۔ آج دوسرا دن تھا۔ ابھی ابھی پھوپھو نے خبر دی تھی کہ وہ کسی پل آنے کا دل کے سارے تار بج اٹھے۔ وہ بیگانی سی بن گئی جیسے کوئی خاص بات نہیں۔ وہ اپنے لمبے لمبے بالوں کو کھولنے لگی۔ اسے آس تھی کہ وہ آج آئے گا مو آئے گا پھوپھو کہہ کر جا چکی تھیں لیکن ابھی تک اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ وہی عبداللہ جو بچپن سے آج تک اس کے حواسوں پر چھایا آ رہا ہے وہی عبداللہ جس کے لیے اس کی بیراگن بنی یہاں تک آ پہنچی۔ آخری دہلیز پر اس کے ہاتھوں میں آج دیا کیوں لرز رہا ہے۔ یہ رات اور دن کا سنگم جس کے لیے وہ جاگتی رہی آج گلے مل رہے ہیں تو اس کا تن خود ہی مہک رہا ہے۔ بس ابھی دیا جلا تو وہ آئے گا میرے خوابوں کا شہزادہ جو سدا آنکھوں میں رہا ہاتھ بڑھایا تو خالی آنکھوں میں موٹا موٹا کاجل پھیل گیا تھا۔ وہ بہانے سے آئینے کے سامنے سے گزری کہیں پھوپھو یہ بات بھی نہ پڑھ لیں۔ اس کے ہر روپ میں وہی بیراگن بانسری کی دھن پر ناچ رہی تھی۔ جس سے اس کے زمین پر پاؤں جل گئے تھے۔ وہی سے آج ملنے آ رہا تھا۔ پیا ملن کی ستاروں بھری راہ انتظار وصل شب سب کچھ آج ختم ہو جاتا بس ایک دید کا موسم۔'' اس کے ہونٹ مسکرائے وہ ایک پل کو آئینہ کے سامنے ٹھہر گئی۔ سب کچھ وہی تھا کچھ بھی تو نہیں گیا تھا۔ سے ٹھہر گیا تھا۔ عبداللہ کے روبرو جا رہی تھی۔ پاؤں دہلیز پر رکے جا رہے تھے لیکن مستی بھری وہ آوازیں اس کی سماعت میں گونج رہی تھیں اسے نکالے جانا تھا۔ پھوپھو کے ساتھ وہ جب کمرے میں داخل ہوئی تو تن من دونوں جل گئے۔ عبداللہ اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ بھاری جسم عبداللہ سیاہ رنگت کے باوجود چہرے پر چھلے ہوئے غربت کے نشان لئے ہوئے تھا اس کے ہاتھوں میں خاکی رنگ کا ایک تھیلا تھا جو اس نے ہنستے ہوئے کنول کی طرف بڑھایا۔

''ریسٹ ہاؤس پر سوکھے میوے کا ٹھیلا لگتا ہے یہ خاص طور پر تمہارے لئے لے کر آیا ہے۔'' اس کے ہاتھ گرے کے گرے رہ گئے۔ تن جل گیا۔ پھوپھو بول رہی تھیں۔

''ماشاءاللہ چھ بچوں کا باپ ہے۔ بڑی مشکل سے وقت نکال کر آیا ہے۔'' عبداللہ پھوپھو سے بنگالی میں کنول کے بارے میں ہی پوچھ رہا تھا۔ نظریں اس کی بھی جھکی ہوئی تھیں لیکن کنول تو مٹی کی بنی اس عبداللہ کو دیکھ رہی تھیں۔ جو اس کا مذاق بنا سامنے کھڑا تھا جس سے وہ یہ بھی نہ کہہ سکی کہ تم بیٹھ جاؤ۔ ایک دھماکہ سا ہوا سب کچھ ایک پل میں جل گیا اسے چکر آیا وہ وہیں بیٹھ گئی کب عبداللہ گیا کب وہ اٹھی اسے کچھ یاد نہیں تھا بس وہ خالی خالی ذہن لئے خوف کھائے بیٹھی تھی سامنے خاکی تھیلا رکھا ہوا تھا۔ جو عبداللہ بطور خاص اس کے لئے لایا تھا۔

''پھوپھو!'' وہ بچوں کی طرح بلک اٹھی۔

''کہہ دیں یہ جھوٹ ہے۔'' آنسوؤں پر اختیار نہیں رہا تھا۔

''کیسے کہہ دوں میری جان یہی عبداللہ تھا۔ جس کے لئے تم پوری حیات جلا بیٹھیں۔''

''نہیں پھوپھو پلیز یہ بھی کوئی نظر کا دھوکہ ہے۔''

''نہیں میری جان یہ دھوکہ نہیں یہی وہ روگ تھا جس کو تم لگا بیٹھی تھیں۔ تمہارے جانے کے بعد عبداللہ کئی بار آیا تھا تب کچھ میں بات آ گئی تھی بار بار تمہیں پوچھنے آتا ایک دن میں نے اس کی پشتوں کو ادھیڑ کر رکھ دیا۔ تب شکل نظر نہ آئی۔ پھر برسوں بیت گئے تم ادھر ہم ادھر والے سب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ تاہم ذات اللہ کی اس نے بچھڑوں کو پھر ملا دیا۔ تم یوں دوڑی چلی آئیں لیکن سے اوجھل تھوڑی ہوا تھا۔ یوں لگا تم کبھی ہوگی وہی بھاوجوں کی تیتری ہو جو ہواؤں کی زد سے بچنے کے لئے چھپر تلے آ گئی اور وہ چھپر ہی کیا جو پناہ نہ دے۔ سو آج دکھ دور ہو گئے من شانت کر لے یہی روگ انسانی سرشت سے کاتب تقدیر نے لکھا ہے۔'' وہ اس کے قریب بیٹھ گئیں لیکن وہ بے جان سی لرز رہی تھی اپنی حماقتوں پر اپنی نادانی کے ان خوابوں پر جن کو وہ حقیقت سمجھ بیٹھی تھی۔

''کیسے یقین کر لوں؟ منزل کی تلاش لاحاصل۔''

''یہ سب آگہی کے راستوں کے پیچ و خم ہیں جن پر کوئی نکل گیا کوئی گر گیا۔ لاحاصل کیا معنی سب بے کار جیون جو ہے وہی کاتب تقدیر ہے کھوج ہمیشہ بے صدا سایہ کی طرح جو در پہ آئے وہی دستک سنائی دیتی

ہے۔ خوابوں کے سہارے نہ جیون بھلا نہ کوئی سکھ بس اب اٹھ جا۔" لیکن نہیں وہ تو بے جان سی گری رہتی۔

"یہ سب کیا ہو گیا۔ خالی خالی سنسناہٹیں کنول جی اتنی بڑی کھائی جو پاتال تک پہنچی جائے نہ اپنی خبر لائے اور جو لوٹ کر آئے تو میری بصیرت سے دیکھے میں آج نابینا ہو گئی ہوں نہ صرف بصیرت بلکہ گویائی سے بھی محروم ہوں۔ یہ کیسے درد کی صلیب ہے جو میں نے اپنے ہاتھوں پہن لی جیون کوئی ادتار نہیں کہ میں دوبارہ لے آؤں گی۔ سب کچھ ہار گئی کاش جیت جاتی۔ اس ہار میں انا کی شکست ہے یا میرے خوابوں کی موت؟ کون جانے کون مر گیا؟ مجھے خوف کیوں ہے شکست کا انا کا یا اس عشق کا جو مجھ سے روٹھ گیا۔ اب میں دوبارہ عبداللہ کا تصور بھی نہیں کرنا چاہتی۔ وہ کس قدر تبدیل ہو گیا ہے یہی وہ غم عشق تھا جسے میں دل کے اندر سمائے رہی۔ کتنا تکلیف دہ لمحہ تھا۔ اپنے وجود کے ٹوٹ جانے کا عمل کسی کائنات کے ٹوٹ جانے کے عمل سے کم تو نہیں سورج، ستارے، دریا، سمندر سب کچھ تو اس دل ناداں کے اندر آباد ہوتا ہے اور اچانک قیامت وقوع پذیر ہو جائے تو من نہ جلے تن جلے تو پھر بھلا کیا جئے۔ عبداللہ کے وجود سے خوف کیوں آ رہا ہے میں تو بچپن میں چھم چھم کرتی ہوئی اناری چاند آتی تھی اماں چیختی رہتیں لیکن کوئی جن نہ سایہ پر آج عبداللہ سے خوف کیوں تھا تو اسے وہ روپ نہ ملا جو جوگ بنتا۔ واہ کنول جی من کی تپسیا ایک پل کی دھول جو گرے تو تن خاک یہی تھا۔ بیراگن کا وہ گیت جو وہ اس دن گا رہی تھی۔ آج تن پر دھول گری تو تن خاک کیا من جل گیا۔ سب عشق دھواں، دھواں چل لوٹ جا اب کوئی من کی چوکھٹ پر دیپ نہیں جلے گا کہ بھور ہو گئی چار دن اور اندھیرا کنول جو سب رنگ جل گئے من کی اگنی نہ اب روپ نہ اب رنگ، سب تن خاک۔"

چل کنول جی پھر؟

آنکھ پھولی یا مٹی کا گھروندہ

یا پھر چلتے ہیں پار ندی کے

برگد کی چھاؤں تلے

کھیلیں گے کھیل پرانا

تم چھپنا میں ڈھونڈوں گی

دیر سے پھر گھر لاؤں گی

اس کے آنسو تواتر سے بہہ رہے تھے

اسے خود بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ پھوپھو ساتھ چلنے پر اتنی آسانی سے رضا مند ہو جائیں گی۔ وہ ہفتہ عشرہ کے لئے اور رک گئی تا کہ پھوپھو کو ساتھ لے جا سکے۔ کئی دنوں سے موسلادھار بارش برس رہی تھی۔ اندھیروں میں پانی کے شور سے اسے خوف آنے لگا تھا اس دن بھی بہت تیز ہوا تھی کہ رات دو بجے سب کی آنکھ کھل گئی۔ دروازے پر کوئی زور زور سے بھاری زنجیر پیٹ رہا تھا۔

"پھوپھو!" اس کی آواز کہیں گھاٹیوں میں اتر گئی۔ پھوپھو بھی اس ناگہانی آواز پر اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔ ہاجرہ دوسرے دالان سے نکل کر سامنے آ گئی تھی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ آواز مسلسل آ رہی تھی پھر تھوڑی دیر میں کچھ لوگوں کے بولنے کی آواز بھی سنی گئی جیسے دو آدمی باتیں کر رہے ہوں۔ بارش مسلسل ہو رہی تھی۔ ہواؤں کے شور میں یوں لگ رہا تھا گویا کوئی دروازہ زمین سے اکھاڑ رہا تھا کنول نے پھوپھو کا آنچل پکڑ لیا تھا اس کا تو مارے ڈر کے سانس رکنے لگا۔ ہاجرہ ہاتھ میں لالٹین لئے بڑے سے دالان سے گزرتی ہوئی بڑے بردھے میں داخل ہو گئی تھی جہاں پر بھاری دروازے کی زنجیر مسلسل بج رہی تھی۔

کون؟ کون؟ کی آوازیں شاید باہر نہ جا سکیں اس نے تھوڑا سا دروازے سے اندھیرے میں جھانکا کوئی اجنبی کنول کو پوچھ رہا تھا۔ وہ بہت تیزی سے پلٹی۔

"بی بی کوئی آپ کا نام لے رہا ہے۔" یہ سن کر تو اس کی جان ہی نکل گئی۔

"مجھے؟" اس نے تھوک نگل کر پھوپھو کی جانب دیکھا۔

"پھوپھو! وہ تو نہیں۔" اس کی سانس ابھی تک رکی ہوئی تھی۔

"آ میرے ساتھ آ....." انہوں نے کنول کو ہاتھ سے گھسیٹا تو وہ بے جان سی ہو کر وہیں پر جھول گئی۔ ہاجرہ دوبارہ جا چکی تھی۔ اجنبی بھاری قدموں سے بردھے سے نکل کر صحن میں آ چکا تھا۔ بغیر اجازت لئے وہ صحن سے گزر کر دالان میں آ گیا تھا۔ اس کے بھیگے کپڑوں سے پانی ٹپک رہا تھا بری طرح پانی میں شرابور تھا۔ اس نے اٹیچی زمین پر رکھ کر بے یقینی کی کیفیت سے کنول کو دیکھا وہ بے جان سی لرز رہی تھی۔ اجنبی نے اپنے ماتھے سے پانی کے قطروں کو بھیگی آستین سے صاف کیا اور پھر بھاری آواز میں

مخاطب ہوا۔

''کنول!'' یوں لگ رہا تھا وہ اپنے نام سے بھی ناواقف ہے۔ اسے اپنی بصیرت پر نہ یقین تھا اور نہ اس سماعت پر وہ اس کے لب کپکپا رہے تھے۔ چند سیکنڈ وہ اسی کیفیت میں لرزتی رہی۔ اجنبی نے پھر ایک بار اسے آواز دی۔ تب وہ نجانے کس طرح کہہ سکی۔

''بابر تم!'' وہ لڑکھڑا گئی۔ پھوپھو بھی حیران سی رہ گئیں یہ سب ایک پل کی کہانی تھی چند سیکنڈ میں سب کچھ ہو گیا تھا۔

''کمال ہے آخر ہوا کیا ہے؟'' بابر اس سے مخاطب تھا وہ بھلا کیسے کہتی۔

''اتنی دیر تو گھر تلاش کرنے میں لگی جتنی دیر میں نے دروازے پر مشق کی ہے۔'' اس نے گیلی آستینوں کے کف کو کھولتے ہوئے شکوہ کیا۔ کنول کی تو جان میں جان آئی لیکن پھوپھو حیران ابھی تک کھڑی تھیں۔ وہ خود ہی بول پڑا۔

''کمال ہے آپ لوگ یوں حیران اور پریشان کھڑے ہیں گویا بابر علی نہ ہوا کوئی دوسری مخلوق یعنی کہ جن......'' اس نے مسکرا کر کنول کی طرف دیکھا لیکن وہاں تو ابھی تک خوف کے ڈیرے تھے۔ کنول سوچ رہی تھی۔ پھوپھو جی نے کہا تھا کہ نجانے وہ تمہیں کس روپ میں ملے۔

اسے جھرجھری سی آئی۔ بابر اس کے پاس ہی گھٹنوں کے بل جھک کر بیٹھ گیا اس کی مضبوط انگلیاں کنول کی کلائی پر تھیں۔

''تم ٹھیک تو ہو آخر تمہیں ہوا کیا ہے؟'' اس نے پوری گرمجوشی سے اس کا ہاتھ دبایا۔ وہ نجانے کہاں تھی چونک گئی بمشکل کہہ سکی۔

''ٹھیک ہوں۔'' زبان خشک ہو رہی تھی۔

''نہ خوشی نہ دکھ کا اظہار یہ کیسا موسم کا مزاج ہے۔'' اس نے ٹپ ٹپ اپنے بالوں سے گرتے ہوئے پانی کو دیکھتے ہوئے کہا تو وہ ہنس پڑی۔ ننھی ننھی سیپیاں ہونٹوں پر اس طرح آ کر رکیں کہ آنکھیں بھیگ گئیں۔

''کنول!'' اس نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

''آخر کیا بات ہے؟ یہ موسلا دھار بارش!'' اس نے اس کی آنکھوں سے موتیوں کو اپنی بھیگی انگلی میں اٹھایا۔

''وہ پھوپھو۔'' اس نے جلدی سے ہاتھ پرے کر دیا۔

''پھوپھو یہ بابر!'' اس نے جلدی سے تعارف کرایا۔

''ہاں میں پہچان گئی ہوں۔'' پھوپھو نے پہچان کی نشاندہی کر دی۔ پھر بابر پھوپھو کے سامنے جھک گیا۔ انہوں نے ڈھیروں دعائیں دیں۔ پھوپھو دیر تک دعائیں دیتی رہیں۔ کیسی ڈھارس بندھی تھی بابر کے آنے سے وہ لمحوں میں پرسکون ہو گئی۔ دیر تک یونہی ذکر پرانی یادوں کا ہوتا رہا۔ بابر نے اکثر چھٹیاں اسی علاقے میں گزاری تھیں۔ وہ تمام راستوں سے واقف تھا۔ ایک ایک کر کے تمام لوگ یاد آتے گئے۔ اس دوران وہ دو بار کافی بنا چکی تھی۔ پھوپھو تو کب کی سو چکی تھیں۔ بارش کا شور ہواؤں کی سرسراہٹ گئے موسموں کے تمام حال کہہ رہی تھی۔ وہ گزرے موسموں کے رنگ بدلتے چہرے سب زندہ ہو گئے تھے ساری محبتیں دبے پاؤں چلی آئی تھیں کب لگ رہا تھا کہ ڈھیر سارا وقت گزر گیا بس یوں لگ رہا تھا کہ بابر خالہ کے ساتھ چھٹیاں گزارنے دبے پاؤں آیا اور ابھی ابھی پھر چلا جائے گا اور پھر وہ انتظار کرے گی۔ بچپن کے لمحوں کی یادیں بارش بھرے آنگن میں آج بھی ناچ رہی تھیں وہ دوڑ رہی تھی اردگرد کی ساری ہریالی اس کے سنگ ناچ رہی تھی چکر آیا دھرتی تھم گئی۔ وہ کتنی دیر تک پرانی باتوں کو یاد دلاتی رہی تمام یادوں کے پرت جوں کے توں کھلے پڑے تھے وہ کتاب عشق جس کا اب کوئی شعر بھی سچا نہیں تھا۔ اس کا قصہ اس نے بابر کو سنا ہی دیا جو اس پر گزری تھی سب کچھ کہہ کر وہ شانت ہو گئی من بیراگی لوٹ آیا چاروں طرف یوں لگا اندھیرا ہے سب کچھ بہت پیچھے رہ گیا۔ کچھ ہاتھ نہیں آیا لیکن ایک پل میں سارے جگنو اس من میں آ گرے۔

''تو گویا جن بابر علی خان سے ہار گیا۔ بابر اپنے عشق میں سچا تھا جیت گیا۔'' اس نے ایک قہقہہ لگایا۔

''بابر!'' اس نے غور کر دیکھا لیکن بابر تو کہیں اور تھا۔ وہ بہت سنجیدگی سے باہر اندھیرے میں دیکھ رہا تھا۔ نجانے کیوں وہ چپ سی ہو گئی۔

''بابر کیا سوچے گا میں کتنی خود غرض ہوں اب جب وہ عشق ہی ذہن سے روٹھ گیا جس کی آڑ میں اپنی ذات کے پجاری کو صاف انکار بھی نہ کر سکی تھی من کے اندھیروں میں انا کا دیپ کتنی دیر جل سکتا تھا۔ آندھی کا ایک جھونکا تھا وہ سایہ جو ابھی ابھی ہاتھ چھڑا کر چلا گیا۔ بابر آج بھی اور کل بھی حقیقت تھا لیکن خود ایک سنہرے جال میں پھنسی وہ مکڑی جس نے بچپن سے جال میں خود پھانس رکھا تھا اور اب سارا دکھ خود

ہی بابر کو سنایا! آخر تھک گئی ناں تنہائی کا بوجھ زیست پر بھاری ہوتا ہے کون اٹھائے یہ بوجھ جس کا ایک ایک سانس کے اوپر بھاری ہے۔ شاید یہی لذت غم تھی جس کو تو نے اتنی بار محسوس کیا کہ تو پھوپھو کی تنہائی پر چیخ اٹھی لیکن یہ کیا ہوا کہ آج تمام لمحوں کا عذاب میں نے بابر کے سامنے بکھیر دیا میں ایک لڑکی نہیں کالج کی ذمہ دار لیکچرار ہوں۔"

"بابر!" اس کی آواز میں شکست تھی۔ وہ بھاری قدموں سے پلٹا تو یوں لگا کنول کو جیسے بابر نے سارے گزرے ہوئے لمحوں پر اپنے بھاری پاؤں رکھ دیے ہوں اور وہ بھی ایک معمولی ذرہ ہو۔ اس نے سر اٹھا کر بابر کی آنکھوں میں دیکھا۔

"کنول!" اس کی مدھم آواز کنول کے پاس گونجی۔

"کوئی کسی کے پاس یوں چل کر نہیں جاتا۔" یوں لگ رہا تھا کہ برسوں کی مسافت اسے تھکا دے گی۔ وہ ٹھہر گیا۔ وہ لرز گئی کبھی یوں بابر نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ کبھی وہ سنجیدہ بھی نہیں ہوا تھا۔ پھر اسے آج کیا ہو گیا؟ وہ کیوں ٹھہر گیا؟ آج جب کوئی سایہ نہیں تو روشنی مدھم کیوں ہو رہی ہے؟ حلق بھی خشک ہے۔ بابر نجانے کیا کہے اور میں کیا جواب دوں؟ کبھی ایسا مقام تو نہیں آیا اور نہ ہی میں کبھی اتنی کمزور تھی لیکن آج میں کمزور لگ رہی ہوں کل تک اجنبی دیس کی ایک آس نے ڈھارس دی تھی اور آج اسی دھرتی میں کنول موم کی طرح کیوں بہہ گئی۔ ان کے سامنے ایک موٹی سی شمع جل رہی تھی جو کافی دیر سے پگھل پگھل کر رو تی رہی اس کے گرم گرم آنسو کنول انگلیوں میں لیتی اور زمین پر گرا دیتی بابر کے مضبوط ہاتھ میں تھمی شمع لرزتی رہی۔ انگلی کا آخری سرا تپش میں جل گیا لیکن خبر نہ ہوئی۔ ہم آج کیوں ایک جلتی ہوئی شمع کے سامنے منجمد ہو گئے۔ آنکھوں کے شفاف پانی میں ایسا کیا گھل گیا تھا کہ وہ شمع رات بھر جلتی رہی آنسو گرتے رہے آستین کے کف بھیگ گئے ایک طویل رات کا سفر لمحوں میں گم ہو گیا موسم کے تمام رنگ اتر آئے لیکن شمع کے آنسو گرتے ہی رہے نہ ختم ہونے والا سلسلہ چاہتوں کے سارے بند توڑ کر اسی کے کشادہ سینے میں دفن ہو گیا لیکن رات نہ ختم ہوئی اور نہ سورج جاگا سب کچھ اس کی سنہری آنکھوں میں بس گیا۔ تمام رنگ تمام چاہتوں کے وہ دکھ جو کتنے طویل تھے آشنا ہو گئے کوئی ریزہ بھی نہ بچا۔ وہ ایک موتی کی طرح سیپ میں سما گئی۔ وہ محبتوں کا سمندر تھا۔ پھر اتنا برسا پانی کہ سب دکھ بہہ گئے۔ محبتوں کے اسی رنگ سے وہ نا آشنا تھی۔ اس کی زندگی میں ایسا کوئی پل کب آیا تھا کہ بابر کی بانہوں میں سما جائے اور ہونٹ صرف مسکرا کر رہ جائیں۔

"کل عید ہے اور تم نے ہاتھوں میں چوڑیاں بھی نہیں پہنیں۔" وہ چراغ رکھ رہی تھی کہ ممانی جان کی نظر اس کی سونی کلائیوں پر پڑی۔

"بس ممانی جان سب دن ایک سے لگتے ہیں۔" اس نے چراغ کو روشن کر دیا۔

"آج صبح سے وہ یاد آ رہا ہے۔" ممانی جذباتی سی ہو رہی تھیں۔

"آج صبح سے دل گواہی دے رہا ہے کہ وہ آئے گا اس وقت بھی میرے شہر کے گلی کوچوں میں اس کی چاپ کی آہٹ سنائی دے رہی ہے۔" کوئی چیز صحن میں بلی نے گرائی تھی۔

"ممانی، بلی ہے۔" باہر کا اس نے جائزہ لے کر اندازہ لگایا۔

"یوں لگ رہا ہے کوئی دروازے پر ہے۔" ممانی کی توجہ باہر کی طرف تھی۔

"نہیں ممانی! جو بھی ہو گا، وہ بیل بجائے گا۔ آپ اب آرام کریجیے۔" وہ اپنے بیڈ پر جا کر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر میں ممانی بھی آ کر لیٹ گئیں لیکن اس کی آنکھوں سے آج نیند کوسوں دور تھی۔ نیند تو وہ برسوں سے چرا کر لے گیا تھا لیکن آج پوری شدت سے ممانی نے اس کی یاد کو ہر طرف پھیلا دیا تھا۔ صبح سے لے کر شام تک کئی بار وہ حماد کو یاد کر کے رو چکی تھیں۔ کمرے میں مدھم مدھم دیے کی روشنی تھی۔ دیے کے عکس میں ہزاروں یادوں کے دیے جل رہے تھے۔ دیے کا گول دائرہ اسے اپنے حصار میں قید کر رہا تھا۔ بالکل حماد کی طرح۔

"اماں! حماد آئے ہیں۔" وہ دروازہ کھلا چھوڑ کر اپنے کمرے میں چھپ گئی۔

"امی نے یہ پھول اور گجرے بھیجے ہیں پھوپھو۔" حماد نے ایک پیکٹ امی کے پہلو میں رکھ دیا۔ یہ پہلی عیدی تھی جو حماد لے کر ان کے گھر آیا تھا۔

''بس ابھی تھوڑی ہی دیر میں ہم لوگ تمہاری طرف جا رہے ہیں۔'' امی نے بکھرے ہوئے پاندان میں ایک ایک چیز کو اس کی جگہ پر رکھ کر پاندان بند کر دیا۔

''پھوپھو! رمشا کہاں ہے؟'' اس نے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔

''اپنے کمرے میں ہوگی۔''

''میں یہ پھول اور گجرے خود اسے دے دوں؟'' وہ آرام سے بولا۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔'' انہیں ہنسی آ گئی۔

''رمشا، رمشا!'' وہ اس کے قریب پہنچ گیا۔

''بھئی، اماں نے تمہارے لئے یہ پھول بھیجے ہیں۔'' اس نے جلدی سے ہاتھوں کے کنگن نکالے۔

''تم انہیں یوں باندھ لو۔'' اس نے کہنے سننے کا موقع ہی نہ دیا اور اس کی نازک سی کلائی پر پھولوں کا کنگن باندھ دیا۔

''رمشا!'' وہ اس کی کلائی تھامے کھڑا تھا۔

''جی۔'' اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہو رہا تھا۔

''تم کئی دنوں سے نظر نہیں آ رہی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ تم آئی ہو لیکن میرے دیر سے گھر آنے کی بنا پر ملاقات نہ ہو سکی ہو۔ دراصل یہ تم سے ملنے کا بہانا تھا۔ پھول تو میں نے راستے میں خریدے ہیں۔ سوچا کہ تمہیں اس عید پر پھولوں کا تحفہ دوں۔ تمہیں پھول بہت پسند ہیں ناں۔'' وہ اس کی شرم سے جھکی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

''اور اگر یہ جھوٹ پکڑا گیا تو؟''

''جھوٹ تو جھوٹ ہوتا ہے۔ میں چاند رات کو پھر تم سے کیسے ملنے آتا اور اگر سب کے ساتھ آتا تو تم فوراً پردے میں چلی جاتیں۔ اس سے تو ہم نکاح سے پہلے ہی بھلے تھے۔'' اس نے گلابوں بھری کلائی پر اپنی گرفت سخت کر دی۔

''پلیز آپ یہاں سے چلے جائیں۔'' وہ شرم سے نروس ہو رہی تھی۔

''اور یہ رہی تمہاری عیدی۔'' اس نے جیب سے ایک نازک سی، انگوٹھی نکال کر اس کی انگلی میں

پہنا دی۔

''یہ خفیہ ہے کسی کو بتانا نہیں۔'' وہ بہت رازداری کے انداز میں بولا۔

''اب چلتا ہوں۔'' اس کی شوخ نظریں اسے اور نروس کر رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ گرم ہاتھ سے رمشا کا ہاتھ آزاد ہوا تو اس کی ہتھیلی بھیگ رہی تھی۔ وہ کوئی شوخ سی دھن گنگناتا ہوا پھوپھو کو سلام کر کے باہر نکل گیا۔

''کمال ہے تمہاری ممانی تو ایک جوڑا بھی نہ بھیج سکیں۔ صرف بھیا ہی نہیں اور تو خیر سے سب کچھ ہے۔'' امی صرف پھولوں کے گجرے دیکھ کر شکایت بھرے لہجے میں گویا ہوئی تھیں۔ وہ چپ رہی۔ اسے حماد کی شرارت کی پوری خبر تھی لیکن انجان بنی رہی۔

''دوپٹہ کتنا باقی ہے؟'' امی نے ساجدہ کا دوپٹا اسے کرن لگانے کے لئے دیا تھا۔

''فرحت کے ٹوکرے کے ساتھ یہ جوڑا اور چوڑیاں وغیرہ بڑی قلعی والی سینی میں رکھ کر اوپر سے یہ سرخ کپڑا ڈال دینا۔'' امی نے بڑا سا سرخ رومال اس کی طرف بڑھایا۔

''جی امی!'' وہ سعادت مندی سے لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''مصطفیٰ آ جائے تو سب چیزیں گاڑی میں رکھوا دو تاکہ جلدی ہی گھر آ جائیں۔ ابھی تک میں نے شیر خورمہ کا میوہ بھی نہیں بھگویا بس اسی میں لگی رہی۔'' انہوں نے دوپٹے کے ساتھ بہت خوبصورتی سے جوڑا سجایا۔ ساجدہ کی عیدی لے کر وہ اپنی محلے کی دوستوں کے ساتھ گئی تھیں۔ کیسی گہما گہمی تھی۔ ممانی نے بھی کئی لڑکیوں کو بلا رکھا تھا۔ ساجدہ سب کے گھیرے میں بیٹھی تھی۔ عباس بھائی اگرچہ موجود نہیں تھے لیکن رسم و رواج تو اپنی جگہ تھے۔ ممانی امی کی سلیقہ مندی پر بہت خوش تھیں۔

''بس ہم بھی تھوڑی دیر میں آنے والے تھے لیکن تم لوگ ہی پہلے آ گئے میں حماد کا انتظار کر رہی ہوں۔'' ممانی نے خوش دلی سے مہمانوں کا استقبال کیا تھا۔

''کیا کہہ رہی ہیں تائی اماں؟'' غزالہ اور سارہ نے ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھا اور وہ تو چور بن گئی۔

''کیا ہوا؟'' ساجدہ پوچھنے لگی۔

''وہ حماد بھائی تو آج شام ہی رمشا باجی کو پھولوں کے گجرے باندھ کر آئے ہیں۔'' سارہ ہنس کر بولی۔ تھوڑی دیر میں سب کو حماد کی شرارت کی خبر ہوگئی۔ ممانی بھی ہنسنے لگیں۔ امی نے ہنسی ضبط کرلی اور وہ کتنی روہانسی سی ہورہی تھی۔ ہر کوئی تنگ کررہا تھا اور وہ تیمور بھائی کے ساتھ کھڑا ہنس رہا تھا۔ اپنی شرارتوں پر بڑا ناز تھا۔

''تو یہ برخوردار عیدی لے کر پہنچے تھے۔'' چھوٹے ماموں حماد کا کان پکڑ کر امی کے روبرو لائے۔

''چھوٹے چچا! کان تو چھوڑیں۔'' وہ ہنس ہنس کر سرخ ہوگیا۔

''چھوٹے چچا! یہ تیمور بھائی، احمر اور مصطفیٰ کی سازش تھی انہوں نے شرط لگائی تھی کہ رمشا کے ہاتھوں میں گجرے باندھ کر دکھاؤ۔'' آنکھ سے ایک موتی ٹوٹ کر گرا اس نے اپنی سونی کلائیوں کی طرف دیکھا۔

''ساون، جھولے، گجرے موتی کیسے بھروں میں مانگ اپنی۔

برہا جگنی نے رکھے ہیں تن من دونوں اوجھا۔ جگن

برکھا موسم کی رت ساری آگ بھرے من مورے

کوکے ڈالی ڈالی کوئل سدھ بدھ کھوئے جاگے جگنی

من تن، دونوں رکھے ہیں ساجن سنگ ادھار

بول بول میں تھک جاؤں وے نا برہا کو وہ پکار

شب روز روز آپ جلے میری آنکھ کا کاجل پھیلے

پریتم آس نہ ٹوٹے میں جلتے دیئے دیکھوں بار بار

ہر آہٹ پر دل کہتا ہے مورے ساجن گھر آئے ہیں۔

مورے من میں برکھا برسے موری آنکھ میں بادل گھر آئے ہیں

یہ تیمور بھائی، احمر، مصطفیٰ اور سارہ غزالہ سب خاموش کیوں ہوگئے ہیں چھوٹے ماموں بھی پہلے جیسے نہیں رہے۔ دیئے کی لو مدھم ہوگئی۔ ممانی جان بھی سوگئیں۔ اس نے ایک نظر دیئے کی طرف دیکھا اور

چپکے سے اٹھ کر اس میں تیل بھر دیا۔ بجھتا دیا پھر سے روشن ہوگیا۔ پھر آہستہ سے اس نے ممانی جان کے اوپر کمبل ڈالا اور بالکونی میں چلی آئی۔ دور تک سیاہ اندھیرا تھا لیکن باہر خوب رونق تھی لوگ آجارہے تھے۔ گاڑیاں اس وقت بھی بھاگ دوڑ رہی تھیں لیکن اگر من اداس ہو تو باہر کی دنیا بہت ویران لگتی ہے۔ وہ غور سے نیچے جھک کر دیکھنے لگی۔

کیسی رونق ہوا کرتی تھی۔ انہی گلیوں میں وہ سائیکل چلایا کرتی تھی۔ منٹ منٹ میں بھاگ کر امی کے لئے ہری مرچ لینے بھاگتی ایک روپے میں مرچ، دھنیا اور ٹماٹر لے کر آجاتی تھی۔ ابھی امی ہنڈیا بھی نہ چڑھا پاتیں کہ وہ فوراً ہی چیزیں لے کر آجاتی۔ عباس بھائی ڈانٹتے لیکن وہ دن میں کئی کئی بار دکانوں کا چکر لگاتی امی نے ذرا کہا اور وہ بھاگی۔ دور سے امی حنیف پوسٹ مین کو دیکھتیں تو آواز دیتیں۔

''عباس کا خط آیا ہے کیا؟'' عباس بھائی امریکہ جو جا بسے تھے۔ حنیف وہیں سے سر سے ہاں یا نہیں کا جواب دیتا۔

''بیٹا! ذرا دھیان سے عباس کا خط لایا کر اور ہاں یہ لے پانچ کا نوٹ۔'' امی فوراً ہاتھ میں روپے تھما دیتیں۔

''گڈی! اماں کے خط میں لکھنا کہ عباس بھائی جلدی جلدی خط لکھا کریں۔'' پوسٹ مین بھولے نہ بھولتا۔

''دیکھنا ابا نے مسجد میں بہت دیر کردی۔'' اس نے ٹیرس سے نظر دوڑائی۔

''وہ رہے ابا'' دور سے ابا نظر آگئے۔

''امی! ممانی اور ساجدہ آرہی ہیں۔'' وہ بھاگ کر اطلاع دیتی۔

''امی! عباس بھائی کا دوست حماد کے ساتھ آج بائیک پر جارہا تھا۔'' ذرا سی دیر میں وہ پورے محلے کی خبر امی کو دے دیتی۔ کہاں گئے وہ لوگ؟ حنیف پوسٹ مین اب ہماری طرف نہیں آتا۔ ساجدہ آتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ حماد ان گلیوں میں عباس کے دوست کے ساتھ نظر نہیں آتا۔ امی بھی اب ابا کا انتظار نہیں کرتیں اور نہ ہی میں اب کسی کا انتظار کرتی ہوں۔ ابا نہ رہے تو انتظار ہی ختم ہوگیا۔ امی نے

مسجد والی گلی کی طرف دیکھنا چھوڑ دیا۔ سر شام کھڑکی بند ہو جاتی ہے لیکن آج میں باہر کیوں آ گئی؟ اس نے دور تک نظر ڈالی۔ ہاں ان ہی گلیوں سے گزر کر ساجدہ اور ممانی آتی تھیں۔ ان ہی سڑکوں پر حماد بائیک دوڑاتا تھا۔

''امی! امی حماد بھائی آ رہے ہیں۔'' وہ دوڑ کر ماں کے پاس پہنچی۔

''سو بار کہا ہے کہ اب حماد بھائی نہ بولا کر۔'' امی نے ڈانٹ دیا۔

''امی! امی! عباس بھائی نے لکھا ہے کہ وہ آ رہے ہیں۔'' وہ خوشی سے اچھل رہی تھی۔

''رمشا ہنسے جا رہی ہے، ذرا آرام سے خط پڑھ۔''

''اچھا اچھا۔ امی دوبارہ پڑھ دوں گی لکھا ہے کہ ابا کی موت ابھی تک پریشان رکھتی ہے۔ امی کا دھیان رکھا کرو۔''

''ہائے میرا بچہ پردیس میں پھوٹ پھوٹ کر روتا ہوگا۔'' امی عباس بھائی کے ذکر سے اداس ہو گئیں۔

''عباس بھائی آ رہے ہیں۔'' اس نے جلدی سے ممانی جان کو اطلاع دی تھی۔

''اچھا امی سے کہنا رات میں ہم چکر لگائیں گے۔'' ممانی تھوڑے ہی فاصلے پر رہتی تھیں۔

''آپا! کوئی اچھا سا رشتہ ساجدہ کے لئے بتاؤ۔'' ممانی نے امی کے کان میں بات ڈالی۔

''ہاں کیوں نہیں۔ کوئی ہوگا تو بتائیں گے، ویسے پڑوس میں ایک دو سے بات کی ہے۔''

''آؤ چلتے ہیں بالکونی میں۔'' ساجدہ ہاتھ پکڑ کر باہر لے آئی۔

''اور کیا لکھا ہے عباس بھائی نے؟''

''بس آنے کی اطلاع دی ہے۔''

''آ کب رہے ہیں؟''

''بس کسی دن وہ فون پر اطلاع دیں گے۔''

''تم تو ایئرپورٹ جاؤ گی؟''

''پتہ نہیں۔''

''کیوں ہم حماد کے ساتھ جائیں گے۔ وہ کسی کی کار لے کر آئے گا۔ تم ساتھ چلنا۔''

''مجھے حماد بھائی سے ڈر لگتا ہے۔''

''پگلی! وہ تو تیرا دیوانہ ہے۔'' ساجدہ نے ہنس کر کہا۔

ہائے کیا خوشی تھی۔ عباس بھائی آ گئے رات رات بھر وہ اپنے دوستوں اور حماد کے ساتھ محفلیں جماتے۔ امی شادی کا ذکر کرتیں تو وہ ہمیشہ ٹال جاتے۔ امی انہیں شک بھری نظروں سے دیکھتی تھیں تو وہ نظریں چرا لیتے۔

''آپا! جب اپنے ہی دھیان نہیں رکھیں گے تو غیروں سے امید کیا؟'' ایک دن ممانی جان امی کے سامنے بول ہی پڑیں۔

''آخر ہم نے بھی تو رمشا کی ہے۔ عباس کے لئے ساجدہ کیسی رہے گی؟'' امی تھوڑی دیر تک چپ رہیں۔

''عباس کچھ بول کر ہی نہیں دیتا شادی کے نام پر تو جواب ہی نہیں ملتا۔'' امی نے سچ سچ بتا دیا۔

''کوئی نہیں آپا بچے خود منہ سے نہیں بولیں گے۔ وہ تو آپ اسے اچھی طرح جانتی ہیں۔'' ممانی نے امی کے پیروں پر دونوں ہاتھ رکھ دیئے۔ امی لرز کر رہ گئیں۔

''بھابھی! آپ شرمندہ نہ کریں میں عباس سے بات کروں گی۔'' امی نے وعدہ کر لیا۔ عباس بھائی راضی ہی نہ تھے۔ امی نے اس کے رشتے کے حوالے سے، ابا کی جدائی کی داستان اپنی تنہائی اور مجبوریاں اتنی رو رو کر بیان کیں کہ عباس بھائی راضی ہو گئے۔ بس ایک دن اچانک بڑوں کے فیصلے کے مطابق ساجدہ عباس بھائی کے اور رمشا حماد کے نکاح میں دے دی گئی۔ عباس بھائی ساجدہ سے نکاح کے دوسرے ہی دن امریکہ واپس چلے گئے۔ امی نے ممانی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ دو سال کے بعد رخصتی کرائیں گی لیکن ممانی کو بہت جلدی تھی۔ ابھی چھ ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ تقاضا شروع ہو گیا۔

''کب آئے گا عباس؟'' انہیں دل کی تکلیف ہو گئی تھی۔ بار بار امی کو یاد دلانے آتیں۔ حماد سے اس کا پردہ ہو گیا۔ پھر بھی وہ کبھی کبھار چکر لگاتا وہ جہاں ہوتی، وہ وہیں آ جاتا۔

''پھوپھو جان! رمشا سے ملے بغیر تو میں جا ہی نہیں سکتا۔'' وہ جوتا اتار کر چادر تان کر امی کے بستر پر

لیٹ جاتا۔ امی ہار جاتیں، وہ ہر بار ستا کر ہنسا کر چلا جاتا۔ ممانی جان عباس بھائی کا ایڈریس لے کر گئی تھیں۔ انہوں نے عباس بھائی کی کسی کے ذریعے انکوائری کروائی، عباس بھائی نے وہاں شادی کر رکھی تھی، وہ دو بچوں کے باپ تھے۔ امی کو اطلاع ملی تو انہوں نے وہاں سے تصدیق کر دی۔ ممانی اور ساجدہ سخت ناراض تھیں۔ حماد کو قسمیں دے کر ممانی نے گھر آنے سے روک دیا تھا۔ ابھی سال بھی نہ گزرا تھا کہ ممانی نے سختی سے امی سے مطالبہ کر دیا کہ وہ ساجدہ کی شادی کہیں اور کریں گی۔ عباس طلاق لکھ کر بھیج دے۔

''جس دن عباس طلاق دے گا، اسی دن حماد بھی۔'' چھوٹی ممانی خبر لے کر آئی تھیں۔ امی کو اس خبر سے سکتہ سا ہو گیا۔ وہ دل تھام کر بیٹھ گئیں۔ چھوٹے ماموں اور ممانی یہ خبر دے کر چلے گئے۔ کتنی اذیت ناک رات تھی۔ بائیک کی آواز پر اس کا دل لرز گیا۔ حماد نے ہارن دیا تھا۔

''امی! حماد آئے ہیں۔'' وہ کانپ رہی تھی۔

''نہیں نہیں دروازہ مت کھولنا، وہ موت کا پیغام لے کر آیا ہوگا۔'' امی ڈر رہی تھیں۔

''لیکن امی!'' ہارن برابر ہو رہا تھا۔ پھر گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے جا کر دروازہ کھول دیا اور وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا امی کے کمرے تک آ گیا۔ وہ وہیں رک گئی۔ وہ اندر چلا گیا۔ وہ کسی موت کی خبر کی منتظر تھی۔ لیکن نہیں۔

''پھوپھو جان یہ ناممکن ہے۔ اماں کو سمجھائیں میں ایسا نہیں کر سکتا۔ آپ کسی قیمت پر عباس بھائی کو بھی ایسا نہیں کرنے دیں گی۔ آج نہیں تو کل عباس بھائی آئیں گے اور ساجدہ باجی وہاں جائیں گی پلیز پھوپھو جان۔'' وہ امی کی گود میں سر رکھے بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ امی یونہی سکتے کے عالم میں بیٹھی تھیں۔ کہاں گئیں وہ محبتیں جو حاصل تھیں۔ گھر میں تنہائی سما گئی۔ وہ بی اے فائنل کر چکی تھی۔ برس بیت گیا۔ گھر میں تنہائی ہنوز باقی تھی دوسری طرف ممانی جان کا مطالبہ کہ ساجدہ کا کہیں اور بیاہ کریں گی۔ یہ راستے، ان پر وہ چل کر آخری بار آیا تھا۔ کیسی موسلا دھار بارش تھی۔ وہی آہٹ وہی دستک تھی۔

''امی! حماد آئے ہیں نا۔'' وہ غیر ارادی طور پر بڑھتی چلی گئی اور جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ وہ بارش میں بھیگ گیا تھا۔ ننھے ننھے قطرے بالوں سے گر رہے تھے، وہ گیٹ سے اندر آ کر زینے پر رک گیا۔

''رمشا!'' اس کا بھاری ہاتھ اس کے شانے پر تھا۔ آواز بھی بہت مدھم تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کوئی بری خبر سنانے جا رہا ہے۔

''رمشا! میں بھی امریکہ جا رہا ہوں۔ تمہاری اور ساجدہ کی خوشی کی خاطر میں عباس بھائی کو لے کر آؤں گا۔ میرا انتظار کرنا۔'' اس کی آواز نجانے کہاں سے آ رہی تھی۔

''تم اتنی نروس کیوں ہو؟'' اس نے رمشا کے کانپتے ہونٹ دیکھ لئے تھے۔

''تم اپنا اور پھوپھو جان کا دھیان رکھنا۔ میں آؤں گا۔ یہ یقین رکھنا اگر دیر ہو جائے تو بھول مت جانا۔'' اس کی شوخ آنکھیں اداس تھیں اور پھر وہ امی سے ملا اور اسی رات وہ یہ شہر، یہ گلیاں چھوڑ گیا ہمیشہ کے لئے۔ پھر کوئی خبر ہی نہ ملی کہ حماد کہاں ہے البتہ ممانی جان نے براہ راست عباس بھائی سے بات کی اور اس طرح علیحدگی ہو گئی لیکن حماد کہیں گم ہو گیا۔ کہنے والے کہتے تھے کہ عباس سے اسے حالات کا علم ہوا تو وہ دوسرے شہر چلا گیا پھر کوئی خبر نہ ملی۔ ایک برس بیتا پھر دو برس بیت گئے امی نے عباس بھائی سے بار بار کریدا تو اتنا معلوم ہوا کہ وہ وہاں آخری بار کسی اسپتال میں داخل ہوا تھا۔ اس کے بعد کچھ نہیں معلوم کہ وہ کہاں گیا۔ وہ شہر اور گھر سب ہی عباس بھائی نے چھان مارا۔ پھر کہیں سے اطلاع ملی کہ کسی شہر میں حماد کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ شاید وہ وہیں کسی حادثہ میں جاں بحق ہو گیا۔ کیسی قیامت تھی۔ جو بجلی بن کر گری امی تو اس خبر سے ہی اس دنیا کو چھوڑ گئیں۔ ممانی جان کو موت کا یقین ہی نہیں آیا۔ وہ سکتے کے عالم میں گویائی سے محروم ہو گئیں۔ پھر سب کچھ نارمل ہو گیا۔ اس نے خود کو ایک بیوہ سمجھ کر ہر چیز خود سے دور کر لی لیکن دل گواہی نہ دیتا تھا۔ ہر بار لگتا کہ حماد آئیں گے اور پھر کوئی شرارت، کوئی مذاق ضرور ہوگا لیکن ایسا نہ ہوا۔ جو سب سے اہم موڑ زندگی میں آیا وہ یہ تھا کہ ممانی جان نے ساجدہ کی شادی ایک ایسے شخص سے کر دی جو لالچی تھا۔ اس کی نظر ممانی کے مکان پر تھی۔ کہاں گئے ساجدہ کے ساتھ کھیلے ہوئے وہ لمحے؟ کون چرا لے گیا طاقوں سے گڑیاں، نہ سکھیاں نہ بابل، تنہا گھرانہ میں۔ پھر ایک دن ساجدہ کا شوہر وہ گھر بیچ کر اپنے بچے اور ساجدہ کو لے کر لاہور چلا گیا۔ ممانی جان نے جانے سے انکار کر دیا۔ ممانی جان اپنی چوکھٹ سے ٹیک لگائے روتی رہتیں۔

آنے والوں نے ہاتھ پکڑ کر باہر کیا اور گھر میں تالا ڈال دیا۔ ممانی ایدھی سینٹر جانے والی تھیں کہ چھوٹے ماموں انہیں ہاتھ پکڑ کر یہاں لے آئے۔

''رمشا! آج سے یہ ممانی نہیں تمہاری ماں ہیں۔ ہم سب کو تمہارے صبر اور حوصلہ پر ناز ہے۔ جس طرح تم نے خود کو سنبھالا ہے خدا ہر بیٹی کو اتنا ہی حوصلہ دے۔'' ماموں جی ہاتھ پکڑ کر بڑی ممانی کو اندر لے آئے تھے۔

''تو میری رمشا ہے۔'' ممانی کو پرانی محبت نے بے چین کر دیا۔ وہ حماد کا نام لے کر رونے لگیں۔ اپنی غلطیوں کا انہیں احساس تھا۔ ذرا سی آہٹ پر ممانی جان چونک پڑتی تھیں۔ انہیں آج بھی حماد کا انتظار تھا۔ پھر تسبیح کے ایک ایک دانے پر انہوں نے ہزاروں وظیفے پڑھ ڈالے لیکن آج ان کی آس کی آخری لو بجھ رہی تھی۔ اس نے اندر نظر ڈالی طاق پر رکھا دیا پھر مدھم ہو رہا تھا۔

''رمشا!'' ممانی جاگ گئی تھیں۔

''جی ممانی جان۔'' وہ دھڑکتے دل کے ساتھ داخل ہوئی۔

''صبح ہونے کو ہے بس تھوڑا سا تیل طاق میں رکھے چراغ میں ڈال دے۔'' وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

''جی ممانی!'' وہ جلدی سے چراغ میں تیل ڈالنے لگی، وہ زبان سے نفی کرتی تھی لیکن دل چاہتا تھا کہ یہ آس کا دیا جلتا رہے۔ یہ چراغ یونہی جلتا رہے۔ اس کی ہر لو میں وہ اسے دیکھتی رہے جو کھو گیا ہے۔ ابھی آسمان پر ستارے نکلے ہوئے تھے۔ ہر سو اندھیرا تھا چرند پرند کی کوئی آواز تو نہ تھی پر شہر کی گلیاں جاگ رہی تھیں۔ کسی نے دستک دی۔ اس کے ہاتھ رک گئے۔ یہ آہٹ یہ دستک؟ وہ بے خودی کے انداز میں کھڑکی پر آ گئی۔

''یہ آہٹ، یہ چاپ حماد کی ہے۔'' ممانی نے خاموشی توڑ دی۔

''باہر کتا بھونکا ہے ممانی۔ میں دیکھتی ہوں۔'' وہ تیزی سے بڑھی اس نے بغیر کچھ کہے دروازہ کھول دیا گرل سے باہر وہی تھا۔

''حماد!'' وہ بے ساختہ پکاری۔ وہ گرل تھامے کھڑا تھا۔

''ممانی جان! ممانی جان!'' وہ تیزی سے دوڑتی ہوئی پلٹ آئی۔

''ممانی جان حماد!'' اس کا سانس اٹک رہا تھا۔ وہ چابی کا گچھا اٹھا کر باہر کی طرف دوڑی اور ایک منٹ میں زینہ طے کرتے ہوئے پہنچ گئی۔ جونہی اس نے گرل کا لاک کھولا وہ اندر آ گیا۔

''رمشا۔'' پہلی بار بولا۔

''حماد!'' اس کا سانس پھول رہا تھا۔ وہ دیوار سے ٹک کر کھڑا ہو گیا۔ عجیب وحشت سی چہرے پر برس رہی تھی۔

''رمشا! میرا گھر کیا ہوا؟'' اس کی آنکھوں میں حد درجہ ویرانی چھا رہی تھی۔

''تم اوپر آؤ حماد۔'' اس نے آج خود ہی اس پردیسی کا ہاتھ تھام لیا۔ اس دکھی انسان پر رحم آ گیا۔

''رمشا! جواب دو میرا گھر کہاں گیا؟ وہاں پہ بہت بڑی عمارت قائم ہے میں بار بار وہاں گیا۔ کوئی کچھ نہیں بتاتا۔ بولو میرا گھر کہاں گیا؟''

''کھو گیا حماد! ان ہی راستوں میں کہیں۔''

''اور ساجدہ میری بہن؟''

''وہ اسی گھر کو بیچ کر چلی گئی۔''

''کہاں گئی ساجدہ؟''

''اپنے شوہر کے ساتھ پنجاب۔''

''اور۔'' وہ رک گیا۔

''اور رمشا پھوپھو جان؟''

''وہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلی گئیں۔''

''اوہ نو۔'' وہ سکتے کے عالم میں ایک زینہ اوپر چڑھا۔

''رمشا۔'' اس نے رمشا کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

''اور اماں؟'' اس کا دل دھڑکا۔

''وہ ہمارے پاس ہیں۔''

''کیا؟''

''ہاں ہمارے پاس ہیں ممانی جان۔ تم اوپر آؤ۔'' اس نے بازو تھام رکھا تھا یوں لگتا تھا وہ کسی طلسم کدے میں داخل ہو رہا ہے۔

''رمشا! یہ آہٹ، یہ چاپ حماد کی ہے۔ بس تھوڑا تیل چراغ میں ڈال دے صبح سے پہلے یہ بجھ نہ جائے۔''

''جی ممانی!'' وہ اس کا بازو تھامے داخل ہوئی۔

''دیکھیں تو سہی آج سچ مچ حماد آ گئے۔'' وہ بیڈ کے قریب آ گئی۔

''اماں!'' وہ ان کے قدموں پر جھک گیا اور صرف اماں ہی کہہ سکا آنسوؤں نے اس کا پورا چہرہ تر کر دیا۔ رمشا کھڑی آنسو پونچھ رہی تھی۔

''میں نہ کہتی تھی آج حماد آئے گا۔ صبح سے پہلے لوٹے گا۔ دل نے گواہی دی تھی۔'' ممانی خود رونے لگیں۔ ماں کے بازو پر سر رکھ کر کیا رویا۔ تھوڑا حوصلہ اور صبر آ گیا۔ اس نے کھڑے ہو کر اپنی ٹائی کی ناٹ کو ڈھیلا کیا اپر کوٹ کو اتار کر ایک لمبی سانس لی اور اس چراغ کو دیکھا جو آہستہ آہستہ جل رہا تھا۔ قریب کھڑی ہوئی رمشا اسے پہلی بار نظر آئی۔

''رمشا'' وہ بہت قریب آ گیا۔ رمشا کو لگا جیسے طلسم ٹوٹ گیا ہے۔ وہی آواز وہی مٹھاس تھی۔

''کیسی ہو تم؟ میں تمہارا مجرم ہوں۔ گناہ گار ہوں۔ میں نے تمہیں پانے کے لئے خود جلاوطنی کاٹی ہے۔'' اس کی آنکھیں خود ہی بھیگ گئیں۔

''میں ساری رات ان گلیوں میں چکر لگاتا رہا ہوں۔ بار بار اپنے گھر جاتا تھا کہ کہیں میں راستہ تو نہیں بھول گیا۔ جب یقین ہو گیا کہ میں اس جگہ کھڑا ہوں جہاں میرا گھر تھا تو مایوس ہو کر ادھر آیا ہوں۔ مجھے معاف کر دو رمشا! میں آج بھی تمہارا ہوں۔ تمہیں چاہنے کے باوجود اس دل سے نہیں نکال سکا۔ سو آ گیا ہوں۔ اب جو چاہے سزا سنا دو میں پھر بھی اپنی جگہ قائم ہوں۔'' اس کی شوخ آنکھیں آج سرخ ہو رہی تھیں۔

''مت کریں ایسی باتیں مجھے آپ کے دکھوں کا اندازہ ہے۔'' وہ رونے لگی۔

''آپ ہی نے تو انتظار کے لئے کہا تھا سو آج بھی میں اس جگہ ہوں۔'' اس نے وہ وعدہ شب یاد

دلایا۔

''اماں! مجھے معاف کر دیں۔'' وہ دوبارہ ماں کے پاس بیٹھ گیا۔

''نہیں چاند! معافی تو مجھے اپنی ضد کی مانگنی چاہئے۔ جو میں نے تیری زندگی کے دس سال گنوا دیئے۔''

''نہیں اماں! ایسا مت کہیں۔'' اس نے ان کے ہاتھوں کو چوم لیا۔

''ایک نظر اس اجڑی ہوئی رمشا پر تو ڈال کہ اس نے خود کو کیسا بنا لیا ہے؟'' اس کی نظر اٹھی تو اس نے جلدی سے دونوں ہاتھ چھپا لئے۔

''کیا ہوا رمشا تمہارے ہاتھوں کو'' وہ جلدی سے اٹھ کر آیا اور اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

''کچھ بھی نہیں۔'' وہ ممانی کے سامنے نروس ہو گئی۔

''میں چھوٹے ماموں کو فون کر کے بتا دوں۔'' وہ جلدی سے ہاتھ چھڑا کر نمبر ڈائل کرنے لگی۔

''چھوٹے ماموں! عید مبارک۔'' وہ آواز سنتے ہی بولی۔

''جی بیٹے! میں فوراً ہی تمہیں لینے آ جاتا ہوں۔'' ہمیشہ ماموں اسے صبح پک کر کے گھر لے جاتے تھے۔

''ماموں! وہ حماد۔'' اس نے ریسیور حماد کو تھما دیا۔

''چھوٹے چچا! آداب میں حماد بول رہا ہوں۔''

''تم حماد کب کیسے اور کیوں؟'' ہزاروں سوال کر ڈالے۔ اس نے ریسیور دوبارہ اسے تھما دیا۔

''جی چھوٹے ماموں۔''

''میں بس ابھی آتا ہوں۔ حماد کی جرأت کیسے ہوئی کہ وہ دس سال کے بعد منہ اٹھائے وہاں پہنچ گیا؟'' ریسیور رکھ کر وہ آنے والے طوفان کا انتظار کر رہی تھی۔ کچھ یہی حال حماد کا بھی تھا۔ بڑی ممانی خود بھی نروس لگ رہی تھیں۔ پندرہ بیس منٹ میں چھوٹے ماموں آ گئے۔

''کہاں ہیں آپ کے برخوردار؟'' انہوں نے بڑی بھابھی کو دور سے دیکھ کر کہا۔

''تو دس سال گزار کر صاحب زادے آپ اس گھر کی چوکھٹ پر دستک دینے آئے ہیں کیا سمجھا ہے تم

نے؟ یہ زندگی کے دس سال ہم لوگ فراموش کر کے تمہیں پھر سے گلے لگا لیں گے؟ کیا خوب، واپسی کا دن مقرر کیا ہے؟'' نہ دعا نہ گلے لگایا الٹا حماد پر برس پڑے۔ وہ سر جھکائے کھڑا رہا۔

''ارے محبت و وفا، صبر و تحمل سیکھنا ہے تو میری بیٹی سے سیکھو۔'' انہوں نے رمشا کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

''یہ وہی ہے جس کو ساجدہ کے لئے سولی پر چڑھایا گیا۔ دیکھو غور سے دیکھو۔'' انہوں نے اس کا چہرہ حماد کی طرف کر دیا۔

''ماموں جی، پرانی باتیں جانے دیں۔'' وہ آہستہ سے بولی تھی۔

''نہیں۔ پرانی ہی باتوں کا تو آج حساب ہوگا۔ ارے میاں کیا سمجھا تھا کہ اتنا آسان ہے دس سال گزار کر آنا نہ خط نہ کوئی اطلاع۔ اس جرم کی سزا تو میں تمہیں ایسی دوں گا۔'' ان کے منہ میں پان کی، پیک بھر آئی۔ اس نے جلدی سے اگال دان سامنے کیا۔

''جیتی رہو۔'' وہ پھر بولے۔

''اور ہاں میاں! ذرا ساجدہ کے حال احوال بھی تو اماں سے پوچھو، جس ساجدہ کے لئے انہوں نے ہماری بیٹی کو ریزہ ریزہ کیا۔ ہماری بہن دکھ نہ سہہ سکی۔ اس ساجدہ نے کیا دیا۔ بولیں ناں بھابھی جان! ساجدہ تمہارے بعد گھر بیچ کر لاہور چلی گئی اور یہ فٹ پاتھ سے اٹھ کر ایدھی ہوم جا رہی تھیں۔ سو میاں ہم کو دعا دو کہ ہمیں مل گئیں۔ میری بیٹی رمشا نے اپنی ممانی سے کوئی گلہ نہیں کیا۔'' ان کی آنکھ بھر آئی۔

''اس صبر کے پیکر نے انہیں ماں سمجھ کر دل سے لگا لیا۔ کیوں بھابھی جان! بولئے یہی سچ ہے ناں؟''

رمشا حیران اس ماموں کو دیکھ رہی تھی جو ہر وقت حماد کی واپسی کی دعا کرتے نہ تھکتے۔ آج پتہ نہیں انہیں کیا ہو گیا تھا۔ سب اپنی جگہ خاموش کھڑے تھے صرف آج چھوٹے ماموں بول رہے تھے۔

''بیٹی رمشا! تمہیں ابھی اور اسی وقت ہمارے ساتھ چلنا ہے۔''

''جی ماموں جی۔'' اس کی نظریں خود ہی جھک گئیں۔

''دیکھا آپ نے یہ بھی ہماری تہذیب کا ایک حصہ ہے کہ بڑوں کے آگے سر جھکا دیتے ہیں۔'' وہ بھابھی بیگم کے پاس بیٹھ گئے۔

''بھابھی بیگم آپ کو اور آپ کے صاحبزادے کو تو میں ایسی سزا دوں گا کہ اپنی ڈیوڑھی پر گھٹنے نہ ٹکوا دیے تو اظہر میرا نام نہیں۔ اگر آپ میری بیٹی کا ہاتھ چاہتی ہیں تو آج ٹھیک آٹھ بجے صاحبزادے کو لے کر آئیں ہم استقبال کریں گے اور سارے خاندان کی موجودگی میں رمشا اس نالائق کے ساتھ آئے گی ورنہ دو چار برس بعد بات کریں گے۔'' ان کا مصنوعی غصہ پھٹ پڑا اور وہ حماد کو گلے لگانے کے لئے اٹھے۔

''نالائق کہیں کے کہاں کہاں نہ تلاش کیا۔ دعاؤں میں بھی اب تو اثر نہ رہا تھا۔ کیا گزری ہم سب پہ۔ کوئی اس طرح باہر جا کر گم ہوتے ہیں؟'' انہوں نے گلے لگا لیا۔

''چھوٹے چچا! معاف کر دیں۔'' حماد کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ انہوں نے پیار سے پیٹھ پر دو چار دھپ لگا دیے۔

''اچھا بھابھی بیگم اجازت ہے۔ نماز نہ نکل جائے۔ رمشا بیٹی جلدی کرو۔''

''نہیں چھوٹے چچا! ایک بار اور'' وہ ان کے گلے لگ گیا۔

''رمشا باجی کے ہاتھوں میں مہندی تو میں لگاؤں گی۔''

''چوڑیاں میں پہناؤں گی۔'' سارہ اور غزالہ بحث کرنے لگیں۔

''اور میں یہ لے آئی۔'' تیمور کی بیوی اپنی بری کے جوڑے میں سے ایک بھاری سلمے دبکے کے کام کا غرارہ اٹھا لائی۔

''میں یہ نہیں پہنوں گی۔'' وہ شرمائی۔

''کیوں اپنی باری آئی تو میں نہیں پہنوں گی اور ہمارے ہاں بری میں جو فرشی غرارے سلوا کر لے گئی تھیں وہ کیا تھے؟''

''وہ تو آپ ہماری بھابھی تھیں۔''

''اور آپ ہماری پیاری پیاری نند جی۔'' تیمور کی بیوی بہت ملنسار تھی۔ اس نے منا لیا۔ اظہر الدین جونہی کمرے میں آئے سب ادھر ادھر ہو گئیں۔

''بس جو ہے۔ وہ ٹھیک ہے۔ زیادہ دھوم دھڑکے کی ضرورت نہیں حماد بہت تھکا ہوا اور پریشان ہے۔

اسی لئے میں اپنی بیٹی کو یہاں لے آیا ہوں۔ کچھ دیر وہ آرام کر لے گی۔ یہ بہت ضروری تھا۔ زیادہ اسے تنگ مت کرنا۔" وہ تیمور کی بیوی کو ہدایت دے کر چلے گئے۔

گھر میں عید کے دن صرف ایک ذکر تھا۔ حماد بھائی آ گئے۔ ہر کوئی بار بار ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بال ٹھیک کرتا۔ ہر کزن کو اس کا انتظار تھا۔

"تیمور بتا رہے تھے کہ حماد بڑے ہینڈسم تھے۔" تیمور کی بیوی چھیڑنے لگی۔

"تھے کیا مطلب، ہیں، ماموں جان بتا رہے تھے کہ اور خوبصورت ہو گئے ہیں۔" خالہ زاد بہن سارہ اترائی۔

"کیوں بنو!" تیمور کی بیوی نے چٹکی کاٹی۔

"بھابھی!" وہ شرما گئی۔

دن بننے سنورنے اور مہمان داری میں گزر گیا رات آٹھ بجے سارے خاندان کے افراد عید ڈنر پر اظہر الدین کی رہائش گاہ پر موجود تھے۔ خاصا اہتمام کیا گیا تھا۔ وہ اپنی ماں کا بازو تھامے چل رہا تھا۔

"تیمور بھائی دیکھ لیں آپ حماد بھائی کیسے گریس فل لگ رہے ہیں اور آپ۔" سارہ نے ان کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا اور بھاگ گئی۔ واقعی حماد بہت ہینڈسم لگ رہا تھا۔ بلیک سوٹ میں اس کی رنگت اور نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ دس سال کے ماہ و سال پیچھے رہ گئے تھے۔ وہ ایک ایک سے گلے لگ کر مسکرا رہا تھا تب ہی وہ چچی کی طرف چل دیا۔ چاروں طرف سے سوالات تھے۔

"ہم کون ہیں؟ یہ ہی آپ کی سزا ہے اور یہ سزا ابا جی نے رکھی ہے۔" اظہر کی چھوٹی بیٹی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"جلدی بتائیں ہم کون ہیں؟" پاس کھڑی بھابھی ہنسیں۔

"آپ!" وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ "آپ تیمور کی بیوی ہیں۔"

"کریکٹ۔" جویریہ ہنسی۔

"کیسے جانا تم نے؟" تیمور کی بیوی پوچھنے لگی۔

"اماں تمام راستے آپ کی تعریف کرتی آئی ہیں کہ تیمور کی بیوی بہت اچھی ہے۔" وہ سر جھکا کر بولا۔

ہر فرد کی خواہش تھی کہ وہ حماد سے بات کرے وہ ایک ایک چہرے کو پہچان رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ میں ان چہروں ان محبتوں کو چھوڑ کر کیوں گیا؟

"بس بس بہت ہو گئی حماد بھائی! ادھر آ جائیں۔" احمر ہاتھ پکڑ کر لے گیا۔

"ہاں بھابھی جان ابا جی کہہ رہے ہیں کوئی رسمیں نہیں ہوں گی۔ حماد بھائی تھکے ہوئے ہیں۔ ڈنر کے بعد رخصتی کر دیجئے۔" وہ پلٹ کر بھابھی کے پاس آیا تھا۔

"لو یہ کیا بات ہوئی؟" ساری لڑکیاں منہ بنانے لگیں۔

"جسٹس اظہر الدین کا آرڈر ہے، آگے آپ کی مرضی۔" وہ حماد کو بازو سے لگا کر لے گیا۔

"یہ لیجئے جھگڑے میاں۔" تیمور کی بیوی دلہن کا ہاتھ تھامے بولی۔ اسے حماد کے برابر میں لا کر بٹھا دیا گیا۔

"ادھر نہیں حماد بھائی ادھر دیکھیں۔" سارے کزن نثار ہو رہے تھے۔ حماد کی ایک شوخ نظر رمشا پر پڑی تو وہ اور سمٹ گئی۔ تب ہی بڑی ممانی پھولوں کے گجنے کی ٹرے اٹھائے اسی طرف آ گئیں۔

"یہ لو بچو! میری چاندی بیٹی کو یہ گہنے پہنا۔" انہوں نے ٹرے کسی کے ہاتھ میں تھما دی۔

"یاد ہے حماد بھائی! آپ پہلی عیدی پر رمشا کے لئے کیا لائے تھے؟" غزالہ نے یاد دلایا۔

"حماد بھائی یہ لیں گجرے۔" سارہ نے پھولوں کو ایک دوسرے سے جدا کر کے دھاگے سے پکڑ کر حماد کے ہاتھ میں تھما دیئے۔

"باندھ دیں ہماری رمشا کے ہاتھوں میں گجرے۔" بھابھی ہنس کر بولیں۔۔

"شیور شیور وائی ناٹ۔" حماد نے گجرے تھام لئے اور اس کی کلائی پر پھول مہک اٹھے اس کی شوخ نظروں کا تصادم تھا کہ

گوری کرت سنگھار

اس قدر پیار سے اے جانِ جہاں رکھا ہے
دل کے رخسار پہ اس وقت تیری یاد نے ہات
یوں گماں ہوتا ہے گرچہ ہے ابھی صبح فراق!
ڈھل گیا ہجر کا دن آ بھی گئی وصل کی رات
وشتِ تنہائی میں اے جانِ جہاں لرزاں ہیں
تری آواز کے سائے، تیرے ہونٹوں کے سراب

غزل کب کی ختم ہو چکی تھی لیکن وہ ابھی تک کھڑکی کا پٹ تھامے باہر دیکھ رہی تھی۔ دور تک اودے اور گلابی آرکڈس نظر آ رہے تھے۔ ایسے رنگین موسم میں جب کلیاں کھلنے کے خواب دیکھ رہی تھیں، اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ سارے مناظر دھندلا گئے۔ تواتر سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو آمنہ حسن نے اپنے آنچل میں جذب کر لیا لیکن بہت آہستہ سے پھول اور خوشبو کی نرم ہوا کا جھونکا سرگوشی کر گیا۔

"آئی لو یو امی۔" اس نے گھبرا کر بیڈ پر پڑے ہوئے آج کے اخبار کی طرف دیکھا لیکن نہیں، وہ تو بے جان صفحہ تھا۔ سرگوشی تو پھول اور خوشبو کا کوئی لمحہ کر گیا تھا۔

اسٹریٹ ٹائمز کا پہلا صفحہ آمنہ حسن کے سامنے کھلا پڑا تھا۔ دل پہ لکھا ہوا پہلا نام سرمد علی۔ انٹرنیشنل یونیورسٹی آف سنگاپور میں ہونے والی ڈاکٹرز کی کانفرنس جس میں چالیس ممالک شرکت کر رہے تھے۔ ان شرکا میں سرمد علی کا نام بھی شامل تھا۔ باوجود ضبط کے آج آمنہ حسن کے آنسو نکلے آ رہے تھے۔ تھم تھم کر برسنے والی آنکھیں آج بے اختیار ہو گئی تھیں۔ آنکھوں کی تہوں سے وقت کی ریت جھڑ رہی تھی۔ کیا ہوا؟ آمنہ حسن! کیا آج سارے زخموں کے ٹانکے ٹوٹ گئے ہیں؟ یا حوصلوں کا پل ٹوٹ گیا؟ کیوں آنکھوں میں برسات بھر گئی ہے؟ کچھ تو ہے۔ آج پھر احساسات کا دریا تمہیں عبور کرنا ہے۔ آج پھر حوصلوں کے پل پر سے گزرنا ہوگا۔

ہاں سرمد علی۔ یہ آنکھیں تو اس دن بھی بے اختیار ہو گئی تھیں جب پہلی بار تمہارے دکھ پر چھلک پڑی تھیں۔ کیا بتاؤں کہ اس دن کیوں دل بھر آیا تھا اور آج تک برس رہا ہے بن موسم ہمیشہ دل میں برسات رہی۔ لمحہ جو آنچل سے اٹکا ہے۔ دل کی کتاب پر لکھا ہوا کہانی کا ایک ایک صفحہ اسی طرح یاد ہے۔ بڑی پھوپھو بڑی نفاست پسند تھیں۔ ہر کام کرنے کے بعد ہاتھوں کو پاک کرنا، دن میں تین بار غسل کرنا، نوکروں کے ہاتھ کا کوئی کام انہیں گوارا نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ یہ نفاست پسندی وہم میں بدلنے لگی تھی۔ پتہ نہیں کیا دکھ تھا کہ پھوپھو رات بھر جاگتی رہتیں۔ بڑی پھوپھو کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ وہ صرف اپنے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھاتی تھیں۔ بس یہی ایک قصور تھا اس مظلوم عورت کا جو وہ کانٹوں بھری ردا میں لپیٹ کر سو گئی۔ اپنی محبتوں سے دستبردار ہو کر، اپنی خواہشوں سے منہ موڑ کر۔ مجھے کچھ ہوش نہیں، کب اور کیسے ہوا؟ بس ایک اطلاع ملی کہ اسد انکل نے ایک بیوہ عورت سے نکاح کر لیا ہے۔ سرمد بہت ناراض ہے اور پھر وہ بیوہ عورت اپنے بچوں کے ساتھ بالائی حویلی کے حصے میں آباد ہو گئی۔ بڑی پھوپھو بالکل لاتعلق سی ہو کر رہ گئیں۔ سرمد سارا سارا دن گھر سے غائب رہنے لگا۔ چھوٹی ماں نے آتے ہی بڑی پھوپھو کو پاگل کا خطاب دے ڈالا۔ ہر وقت پاگل کے الفاظ کی گونج نے آخر بڑی پھوپھو کو بالکل ہی توڑ کر رکھ دیا اور وہ واقعی پاگل ہو گئیں۔ پھوپھو کا پاگل پن سرمد علی کے ہونٹوں سے ہنسی چھین کر لے گیا۔ وقت سے پہلے وہ سنجیدہ ہو گیا۔ ہونٹوں کی ہنسی جو اس کے چہرے کی شناخت تھی، خاموشیوں میں ڈوب گئی۔ بڑی پھوپھو سرمد سے لاتعلق کچھ نہ کچھ بڑبڑاتی رہتیں۔ لوگ تو یہی کہتے تھے کہ اسد انکل نے ایک دکھ دے کر انہیں پاگل بنا دیا ہے۔ ابا نے کئی بار کوشش کی کہ پھوپھو کو گھر لے آئیں لیکن پھوپھو تو کسی کے گھر کا پانی بھی نہیں پی سکتی تھیں۔ آخر ابا ہار گئے لیکن وہ ان کی طرف سے غافل کبھی نہیں ہوئے تھے اور پھر اچانک اتنا بڑا فیصلہ کہ خاموشی سے پھوپھو کو انکل نے پاگل خانے میں داخل کرا دیا۔ سرمد اب اس گھر میں تنہا رہ گیا۔ انکل نے بہت کوشش کی کہ سرمد چھوٹی ماں کے پاس آ جائے لیکن سرمد کو تو چھوٹی ماں بہت خوفناک سی لگتی تھیں۔ جس دن پھوپھو کو پاگل خانے بھیجا گیا تھا، میں سرمد کے ساتھ جی بھر کر روئی تھی۔ جب سے بڑی پھوپھو پاگل خانے میں بھیج دی گئی تھیں۔ سرمد نے چھوٹی ماں کے گھر کا کھانا پسند نہیں کیا تھا۔ شروع شروع میں اسد انکل نے کوشش کی لیکن وہ سرمد کو مجبور نہ کر سکے تو یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔

"آخر کو ہے کس ماں کا بیٹا؟" چھوٹی ماں نے بھی پاگل ماں کا طعنہ دے ڈالا۔

"پاگلوں کی ابتدائی حالت ایسی ہی ہوتی ہے۔" چھوٹی ماں نے اسد کو مناتے ہوئے دیکھا تو جل کر کہا۔ سرمد اتنی سی عمر میں یوں خود سری سے گھومتا جیسے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ بس ایک ابا تھے جو سرمد کی ہر طرح سے دیکھ بھال کرتے۔ اماں بھی اس کا خیال رکھتی تھیں لیکن ابا زیادہ ہی چاہنے لگے تھے اور میں بھی تو اس کے لئے دل میں ایک ہمدردی محسوس کرتی۔ اگر وہ نظر نہ آتا، تو ڈھونڈتی۔ وہ بالکل اپنوں جیسا لگتا اتنا قریب کہ بعض اوقات وہ پوچھ بیٹھتا۔

"اے ایمی..... بھلا یہ تو بتاؤ ماموں حسن تو مجھے اس لئے پیار کرتے ہیں کہ میں ان کی عزیز بہن کا اکلوتا لاوارث بیٹا ہوں لیکن تم......؟"

"میں اس لئے کہ تم ابا کو بہت عزیز ہو۔"

"بس اتنی سی بات؟"

"تو اور نہیں تو کیا؟"

"اچھا آپ یہاں سے فوراً چلی جایئے۔ اب تھوڑا سا پڑھوں گا۔" وہ بہت پیار سے آنکھیں دکھاتا تو ساری کہانی ادھوری چھوڑ کر میں چلی آتی۔ چھوٹی ماں کی چھوٹی چھوٹی باتیں جو میں نے سنی ہوتیں وہ بغیر سنائے چلی آتی۔ پھر ایک دن ابا کے پاس اسد انکل آئے تھے۔ پھوپھو پاگل خانے میں سخت بیمار تھیں۔ ہوا کیا تھا، پھوپھو نے وہاں بھی بھوک ہڑتال کر رکھی تھی۔ وہ تو صرف اپنے ہاتھ کا کھانا کھانا پسند کرتی تھیں۔ ابا جب پہنچے تو پھوپھو اسپتال میں داخل تھیں۔ فاقہ ہستی نے نہ صرف دماغ بلکہ جسم کو بھی لاغر کر دیا تھا۔ گئیں تو تھیں پھوپھو چیختی ہوئی، ابا انہیں بالکل خاموش لے کر آئے تھے۔ تمام دنیا کے رشتوں سے بے خبر۔ دکھوں سے آزاد اپنی ان کہی باتوں سے بے نیاز۔ سفرِ آخر کی تیاریوں میں اور پھر پھوپھو چلی گئیں ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے نجات حاصل کر گئیں۔ سرمد بالکل خاموش انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ مجھے روتا دیکھ کر میرے پاس چلا آیا۔

"ایمی....." میں نے اپنی آنکھیں صاف کیں اور نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ بالکل نارمل تھا۔ بس اس کی آنکھوں کا سکوت بتاتا تھا کہ اس نے اپنا دکھ کہیں چھپا رکھا ہے۔

"وہ وقت زیادہ اذیت ناک تھا کہ اماں پاگل خانے میں تھیں۔ یہ موت بہت خوبصورت لگی۔ آج

دیکھا ماں کتنی پرسکون لگ رہی تھیں نا۔" وہ اپنے ہونٹوں پر زمانے بھر کی تلخ مسکراہٹ لئے کھڑا تھا۔ اور میں نے بھی آنکھوں سے آنسو پونچھ ڈالے۔ شروع شروع میں انکل نے بہت خیال رکھا مگر پھر وہی لاتعلقی قائم ہو گئی۔ سرمد سارا سارا دن گھر سے غائب رہتا۔ پوچھو تو بس ایک جواب تھا۔

"کیوں کیا بتانا ضروری ہے کہ میں کہاں رہا؟"

"ارے تم کو ابا کی بھی فکر نہیں۔ آج تم کھانے پر نہیں آئے تو ابا نے بھی نہیں کھایا۔" وہ ارنے کہہ کر مجھ سے پہلے ابا کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اس نے اپنی محرومیوں کو ابا کی محبت میں چھپا لیا تھا۔ تمام محبتیں جو وہ نہ پا سکا تھا۔ وہ ابا نے اسے دے ڈالی تھیں۔ یوں تو چھوٹی پھوپھو بھی تھیں لیکن وہ ابا کے بہت قریب تھا۔ ہاں کبھی کبھی وہ اور میں چھوٹی پھوپھو کے پاس جاتے تو چھوٹی پھوپھو از حد محبت سے پیش آتیں۔ بس چھوٹی پھوپھو اور ایک ابا دو ہی تو اس کے اپنے تھے اور میں تو تھی ہی اس کے لئے۔ ایک پل دیکھنے میں دیر ہو جائے تو بس دل اداس رہتا تھا۔ سارا سارا دن اس کی وہ سرخ سرخ آنکھیں پیچھا کرتیں۔ نجانے اس دن وہ کون سا لمحہ تھا کہ سرمد علی دل میں اتر گیا تھا۔ تب شاید میں کسی جذبے سے اتنی سرشار نہیں تھی۔ میرے شعور کا وہ پہلا لمحہ جو ان کے کشکول میں چاند بن کر اترا تھا، وہ لمحہ جو چاند سے ہاتھ چھڑا کر مجھے تھامنے کے لئے زمین پر اترا تھا۔ روشن روشن اجلا اجلا پن جو دل میں ہر وقت مدھر مدھر گیت الاپتا جو ایک پل سرمد کے بغیر سونا سونا لگتا اور سرمد بھی یوں دیکھتا کہ بس اس کی ذات کا آدھا حصہ میں ہوں، نہ ختم ہونے والی کہانی کا ایک حصہ، ساری، ساری رات میں اس کے بارے میں سوچتی رہتی۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں گھر چلا آتا تھا۔ کبھی کھانا کھانے، کبھی مجھے اپنا کوئی کام دینے، کبھی ابا سے کوئی کام ہوتا۔ گھنٹوں وہ بیٹھا ابا سے باتیں کرتا اور میں ابا کے پیچھے بیٹھی بس دیکھتی رہتی۔ وقت نے سرمد کو سنجیدہ اور سمجھدار بنا دیا تھا۔ انکل اسد بالکل ہی لاتعلق سے تھے۔ وہ خود بھی ان لوگوں سے دور رہتا اوپر والی منزل جس میں بڑی پھوپھو رہتی تھیں، اب وہاں چھوٹی ماں کے بڑے بیٹوں کا راج تھا۔ سرمد صرف ایک کمرے میں رہتا تھا۔ صرف رات کو جاتا سارا دن چھوٹی پھوپھو کے گھر یا پھر ابا کے پاس رہتا۔ اوپر والی منزل میں رات دن ایک ہنگامہ رہتا۔ کبھی ہما تو کبھی جنید اور زبیر رہتے تھے۔ سرمد کی اسٹڈی ٹھیک طرح نہیں ہو رہی تھی۔ تب ہی تو ابا نے اس سے کہا تھا۔

"سرمد، یہ سال تمہارے لئے بہت اہم ہے۔ تم اپنی تعلیم کی طرف توجہ دو۔" اور اسی لئے سرمد اپنی چند

کتابیں اٹھا کر ہمارے گھر کے اوپر والے حصے میں فاروق کے کمرے میں آ گیا۔ فاروق بھائی سرمد کے دوست بھی تھے اور پھر سرمد نے ابا کی مدد سے امتحانات کی تیاریاں شروع کر دیں۔ سرمد نہ صرف محنتی تھا بلکہ ایک ذہین انسان بھی تھا رات بھر چھت پر ٹہل ٹہل کر پڑھتا۔ میں ان دنوں میٹرک کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ ابھی ابھی میں نے سرمد کو چائے لا کر دی تھی۔ اس کی آنکھیں تھکن سے بند ہو رہی تھیں۔

''سرمد...... اب سو بھی جاؤ۔ رات کے دو بجنے والے ہیں۔ فاروق بھائی تو سو بھی گئے ہیں۔''

''میں جاگتا ہی رہنا چاہتا ہوں۔ سونے کے لئے تو عمر پڑی ہے۔ آمنہ تمہارے پرچے کیسے ہو رہے ہیں؟''

''بہت ہی شاندار۔'' سرمد نے مسکرا کر دیکھا تو میں سچ کہے بنا نہ رہ سکی۔

''سرمد...... ایک بات بتاؤں؟''

''ایک تمہیں ایمی بہت ساری ڈھیر ساری بلکہ اتنی ساری۔'' اس نے ستاروں کی طرف دیکھ کر کہا۔

''سرمد...... تمہاری اسی محنت اور ذہانت نے اس قدر امپریس کیا ہے کہ اب تو میں بھی جاگتی ہی رہنا چاہتی ہوں۔'' میری اس بات پر سرمد ہنس پڑا۔

''نہیں ایمی، تم خود بھی ایک ذہین اور اچھی لڑکی ہو۔'' وہ میرے سر پر چپت لگا کر ہلکے سے مسکرا دیا۔

سرمد کی مقناطیسی شخصیت نے ذہن کو کندن بنا دیا تھا۔ میٹرک میں تیسری پوزیشن۔ وہ بھی آمنہ کی۔ ہر طرف آمنہ حسن، آمنہ حسن اور جب اس خوشی کے موقع پر سرمد نے اماں کی نظر بچا کر کہا۔

''آئی لو یو ایمی......'' تب اسی لمحے دل کے دشت میں پھول ہی پھول کھل اٹھے۔ اودے، نیلے، پیلے، سرخ اور سفید پھول۔ تب ان دنوں دھوپ بھی حسین لگتی تھی۔ چاند تارے تو آنچل میں اٹکے لگتے۔ جسم پر ہر وقت خوشبوؤں کی ہوائیں سرسراتیں اور قدموں پہ محبتوں کی پازیب بجتی ہوئی لگتی تھی۔ ایک لمحہ محبت کا ساعت میں ٹھہرا رہتا۔

''آئی لو یو ایمی۔'' لفظوں کی بازگشت سماعتوں میں رس گھولتی رہتی۔ وقت لمحوں میں گزر رہا تھا۔ اماں، ابا اور فاروق کی محبتیں تھیں۔ زندگی کے لمبے سفر پر سرمد علی کا تصور۔ نئے خوابوں کی آس کے پنکھ تیتری کی طرح ہواؤں پہ اڑ رہے تھے۔ ایک دن سارے لوگ خوش تھے لیکن اس خوشی میں سرمد اخبار ہاتھ

میں لئے ابا سے لپٹا ہوا سسک رہا تھا۔ شاید بے تحاشا خوشی میں خود پر قابو نہ رکھ سکا تھا۔

''اے میرے اچھے کزن! اتنی بڑی کامیابی پر یہ آنسو؟'' بھائی فاروق نے اس کے بہتے ہوئے آنسوؤں کو اپنی انگلیوں کی پوروں میں لیتے ہوئے کہا۔ ایک ننھا سا سفید قطرہ فاروق بھائی کی انگلی پر ایک لمحے کو لرزا اور زمین پر گر گیا۔ ساتھ ہی سرمد اور فاروق بھائی کی ہنسی کی بازگشت سے سب کے اداس چہروں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اماں نے ڈھیروں دعائیں دیں۔ چھوٹی پھوپھو نے سرمد کے ماتھے پر بوسہ دیا تو وہ شرما سا گیا اور میں اس وقت اخبار میں پوزیشن لینے والوں کے نام پڑھ رہی تھی۔ سب سے پہلی پوزیشن سرمد علی ہی کی تھی۔

''کیا حفظ کرنے کا ارادہ ہے؟'' فاروق بھائی نے اخبار چھین لیا۔ اتنی بڑی خبر ظاہر ہے انکل کو بھی مل گئی تھی مگر وہ نہ آئے تھے۔ یوں بھی وہ اب ہم لوگوں سے تعلق توڑ بیٹھے تھے۔ وجہ سرمد ہی تھا۔ اتنی بڑی خوشی میں سرمد اور فاروق بھائی کے دوست ساری رات اکٹھے رہے۔ سارے محلے والوں کو خبر تھی کہ اس بار ٹاپ کرنے والا لڑکا ہماری ہی گلی کا ہے۔ سب سرمد کی خوشی میں خوش تھے۔ صرف انکل اسد اور چھوٹی ماں نہیں آئے تھے۔ چھوٹی پھوپھو نے سرمد کو خود ہی بلا کر کہا تھا کہ وہ انکل سے خود ہی ملنے چلا جائے۔

''وہ خود نہیں آ سکتے تھے۔''

''سرمد...... وہ تمہارے باپ ہیں۔'' ابا نے بھی یہی کہا تھا لیکن ضدی سرمد کب بھلا کسی کی بات جلدی سنتا تھا۔ وہ ڈھیر سارے ہنگامے چھوڑ کر تھوڑی دیر کے لئے چلا گیا تھا۔ رات بھر سب نے خوب شور کیا۔ باری باری سب نے کوک، آئسکریم منگوا کر اڑائی۔ سرمد نے صاف کہہ دیا تھا۔

''بھئی محنت میں نے کی، کھلانے کی زحمت آپ کیجئے۔'' تھوڑی دیر میں میرے قریب آ کر کہنے لگا۔

''ہائے ایمی، تم کتنی کنجوس ہو، تم نے تو مبارکباد تک نہیں دی ہے حالانکہ میں نے تمہیں گفٹ دیا تھا۔'' وہ جھکا ہوا کہہ رہا تھا۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں، یہ بھی دے گی۔'' اماں نے جو کسی کام سے اس طرف چلی آئی تھیں کہہ رہی تھیں۔

''ہائے سرمد، اتنا بڑا جھوٹ، تم نے کب تحفہ دیا تھا؟'' میں نے جب اس کی طرف دیکھا تو وہ شرارت

سے مسکرا رہا تھا۔ اماں کے جاتے ہی وہ پھر کہنے لگا تھا۔

''کیوں، میں نے بے تحاشا خوش دیکھ کر تمہیں دل تحفے میں نہیں دے ڈالا تھا۔ تب ہی کہا تھا آئی لو یو ایمی۔ اور جناب، سرمد علی ہر ایک کو دل یوں تھوڑی بانٹتا پھرتا ہے۔'' وہ آنکھوں میں جھانک کر جواب مانگ رہا تھا۔

''ارے یار، چھوڑ، یہ بھلا کنجوس کیا دے گی؟'' فاروق بھائی نے کہا تو سرمد جلدی سے پلٹ گیا اور میں بھی گھبرا کر ہٹ گئی تھی لیکن سرمد علی آنکھوں سے میرا پیچھا کرتا رہا تھا اور میں بے انتہا نروس تھی۔ سرمد کی اس کامیابی نے اسے ڈھیروں خوشیاں دینی تھیں لیکن وہ پہلے سے زیادہ سنجیدہ اور بردبار نظر آنے لگا تھا۔ وقت نے تو وقت سے پہلے ہی اسے اتنا حساس اور سنجیدہ بنا دیا اور اب ذہانت نے اس کے حسن کو نکھار دیا تھا۔ ہاں سرمد علی اس دن تم ڈارک براؤن پینٹ لائٹ براؤن قمیض میں بے انتہا اچھے لگ رہے تھے۔ زندگی رنگ، موسم، پھول اور خوشبو بن کر رہ گئی تھی۔ میری ہر سہیلی تمہیں جانتی تھی۔ تمہارا وہ میڈیکل کا تیسرا سال تھا تم بے انتہا توجہ سے اسٹڈی میں مشغول تھے کہ دھپ دھپ کرتی ہوئی چھوٹی ماں اسد انکل کے ساتھ اوپر والی منزل پر آ گئیں۔ میں یوں اتنے سالوں کے بعد انہیں اپنے گھر میں دیکھ کر حیران تھی کہ ایک پل میں یہ کیا ہو گیا۔ چھوٹی ماں کہہ رہی تھیں۔

''کوئی اپنوں سے کب تک دور رہ سکتا ہے؟'' انکل اسد گھر واپس چلنے کو کہہ رہے تھے اور تم خود کبھی انہیں اور کبھی ہم لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔ تب ہی ابا نے کہا۔

''جاؤ بیٹا، کیا سوچ رہے ہو؟''

''جی.....'' اور تمہاری یہ آواز بہت گہرائی سے آتی ہوئی سنائی دی۔ شاید تم سوچ رہے تھے کہ سرمد علی جوان کے لئے مر گیا تھا آج کیسے انہیں یاد آیا۔ ان کی ڈھیروں محبتوں نے آخر تم کو مجبور کر دیا۔ اتنے برسوں کی رفاقتوں کو تم چھوڑ کر جا رہے تھے لیکن کتنے اداس، کتنے مجبور سے، تم نے آخری بار جب اسی جگہ کو جہاں ہم، تم اور فاروق بھائی اکٹھا پڑھتے تھے، مڑ کر دیکھا تو نہ جانے کیوں دل میں دراڑیں سی پڑتی محسوس ہوئیں۔ تم نے اپنی نظریں نیچی کی ہوئی تھیں۔ شاید تم ہم سب کی محبتوں سے شرمندہ ہو رہے تھے لیکن ابا تو تمہیں اس وقت پیار کر رہے تھے۔

''بیٹے.....ایک گلی کا فرق ہے۔ تم تو آج بھی اتنے ہی عزیز ہو جتنے کل تھے۔'' لیکن کوئی مجھ سے

پوچھتا کہ کتنا بڑا فاصلہ ہمارے درمیان حائل ہو گیا تھا۔ تمہارے جانے کے بعد اب صرف سناٹے اور خاموشی رہ گئی تھی۔ فاروق بھائی بھی گھر سے باہر رہنے لگے اور میں سارا وقت اپنے بی ایس سی کے آخری سال کو دے رہی تھی۔ تم آتے ضرور تھے لیکن بس تھوڑی سی دیر کے لئے۔ تمہارے سر پر چھوٹی ماں کا بلاوا حاضر ہو جاتا۔

''اماں بلا رہی ہیں۔'' تمہارا کوئی نہ کوئی بہن یا بھائی حاضر ہو جاتا اور تم جلدی جلدی چائے کے سپ لیتے ہوئے ہم سب کو خدا حافظ کہتے۔ ابا تم سے باتیں کرنے کو ترس گئے تھے۔ بعض اوقات میں پیالی ہاتھ میں لئے کھڑی رہ جاتی اور تم مجبوراً چلے جاتے۔ فاصلہ ضرور تھا لیکن محبتوں کے فاصلے اور قریب آ گئے تھے۔ وقت دبے پاؤں گزر رہا تھا۔ تم نے ایک دن کہا تھا۔

''ایمی.....محبتیں تو ایک لازوال خزانہ ہوتی ہیں اور جو چیز دل کے اندر ہو بھلا اسے کون چرا سکتا ہے؟''

''وقت بھی نہیں؟'' میں نے تھوڑی دیر کے بعد پوچھا۔

''نہیں، وقت بھی نہیں میں نے کہا ناں کہ محبتیں لازوال خزانوں کی طرح ہیں۔'' تم نے اپنی آنکھوں میں اس سے تمام محبتوں کے خزانے کو چھپایا ہوا تھا۔ تب ہی تو میری آنکھیں جھک گئی تھیں۔

''ایمی ڈیئر جب کوئی فیصلہ کر لو ناں تو دل کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔''

''اور اگر ان بند دروازوں پر کسی اور نے دستک دی تو؟'' میں نے سوال کیا تو تم بہت پراؤڈ سے ہو کر مسکرا رہے تھے۔

''ناکامی ہی ہو گی مائی ڈیئر۔''

''اگر میں نے دی تو؟''

''تو.....'' تم نے بڑے غور سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''ارے سارے کے سارے خزانے لٹا دوں گا تب تو، تہی دامن ہو جاؤں گا، کبھی آزما لینا ایمی۔''

''سوچ لو سرمد۔''

''نو ڈاؤٹ ایمی.....نو ڈاؤٹ'' تم پر یقین لہجے میں بولے اور پھر ایک دن سنا کہ تم گھر چھوڑ کر پھر کہیں چلے گئے۔ ہمارا آخری سال تھا۔ ابا پھر پریشان ہو گئے۔ تم چھوٹی پھوپھو کے گھر میں شفٹ

ہو گئے تھے۔ جب تم ملے تو کہہ رہے تھے۔

’’جھوٹی محبتیں کر کے ابو اور چھوٹی امی مجھ سے جینے کا حق چھیننا چاہتے ہیں۔ چھوٹی ماں اور ابو چاہتے ہیں کہ میں ہما سے منسوب ہو جاؤں۔ امپاسیبل، میں کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتا۔‘‘ تم نے دونوں ہاتھوں کو غصے میں رگڑتے ہوئے کہا تھا۔ تب پہلی بار میرا دل بھی دھک سے رہ گیا تھا۔ کوئی چیز ٹوٹ گئی تھی۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ آمنہ حسن، میرا دل چپکے چپکے کہہ رہا تھا۔ تمام مخالفتوں کے باوجود چھوٹی پھوپھو نے تمہیں اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ ہما دانش جس کو تم اپنی بہن کی طرح چاہتے تھے، جسے چھوٹی ماں اپنے ساتھ لائی تھیں، آج ہمارے درمیان حائل ہو گئی تھی اور پھر کیسی کیسی خبریں سننے کو ملتی تھیں کہ ابا اور اماں نے تمہیں جان بوجھ کر ان لوگوں سے دور کر دیا ہے اور تمہارے مستقبل کی طرف ان کی نظر ہے۔ گھر میں جوان بیٹی کے لئے ڈورے ڈالے جا رہے ہیں تم نے گھر میں آنا چھوڑ دیا تھا۔ چھوٹی ماں نے ہمیں پورے خاندان میں بدنام کر دیا۔ میں اماں کے سامنے شرمندہ رہتی کہ میری وجہ سے انہیں یہ دکھ جھیلنے پڑ رہے ہیں اور جب میں نے ایک دن کہا۔

’’سرمد ناراض ہو جو گھر نہیں آتے؟‘‘

’’مجھے تم دنیا کے ہر رشتے سے عزیز ہو میں یہ بات ہرگز نہیں برداشت کر سکتا کہ چھوٹی ماں تمہیں کچھ کہیں اور تمہیں دکھ پہنچے۔‘‘

’’لیکن سرمد، ابا یاد کرتے ہیں اور بیمار ہیں۔‘‘ تم ابا کی بیماری کی خبر سن کر تڑپ اٹھے تھے لیکن پھر بھی نہیں آئے تھے بس فون پر ابا سے بات کی۔ پھر وقت ہمیں مایوسیوں کی بھیڑ میں گھسیٹتا ہی چلا گیا اور ہم تماشائی بن کر رہ گئے۔ ہم سے پیارے ابا روٹھ گئے اچانک بالکل اچانک ہارٹ اٹیک ابا کو لے گیا تمہیں ابا سے نہ ملنے کا بہت دکھ تھا۔ گھر میں اب مستقل سناٹے رہ گئے تھے۔ میں امتحان سے فارغ ہوئی تھی کہ فاروق بھائی امریکہ چلے گئے۔ خالی وقت اماں اور میں ابا کی باتیں کرتے دل اداس ہوتا تو پھوپھو کو بلا لیتے، ہمیں تمہاری طرح پھوپھو بھی بہت عزیز تھیں۔ میں امتحان سے فارغ ہو چکی تھی۔ رزلٹ کا انتظار تھا۔ اماں کا خیال تھا کہ بس میں اب اپنی تعلیم ختم کر دوں۔ اسی لئے وہ کسی اچھے سے رشتے کی دیکھ بھال کر رہی تھیں۔ پھر ایک دن پھوپھو تمہارے لئے مجھے مانگنے آ گئیں۔ اماں تو تمہارا نام سن کر یوں پیچھے ہٹ گئیں جیسے چھوٹی پھوپھو بہت بری خبر لائی ہوں۔

’’جس کا بیٹا ہے وہ لوگ خود کہیں اور میں اپنی بیٹی دے دوں۔ کیا پہلے ہی بدنامی کم ہوئی ہے جو تم اسے اور بدنام کروانا چاہتی ہو۔‘‘ اماں نے مجھے دیکھ کر کہا۔ چھوٹی پھوپھو کو اماں نے بری طرح رد کیا۔ پھوپھو مایوس چلی گئیں۔ اکثر اماں سے خوشامد کرتیں لیکن اماں کو ضد سی ہو گئی تھی کہ انکل اور وہ خود آ کر کہیں اور تمہیں ضد تھی کہ اسد انکل کو تم نہیں کہو گے کہ وہ مجھے مانگ لیں۔ کیا خوب تھی ہماری قسمت اماں اور تمہاری ضد پر آمنہ حسن پھانسی کے تختے پر لٹک رہی تھی۔ وقت کس قدر آہستہ ہو گیا تھا۔ گزارے نہیں گزر رہا تھا۔ چھوٹی ماں نے اتنی رسوائیاں پھیلائیں کہ دم گھٹنے لگتا۔ کبھی منگنی، کبھی افیئر، کسی نہ کسی سے منسوب کرتی رہیں۔ چھوٹی ماں اپنی فطرت سے مجبور تھیں۔ اماں بے چاری صبر کر لیتیں اور میں نے تو کان ہی بند کر لئے تھے یا پھر اماں خوفزدہ ہو کر کہتیں۔

’’بس امی، یہ لڑکا تو مجھے بہت ہی پسند ہے۔ ہاں کر دے۔‘‘

’’اماں۔‘‘ میں نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

’’مجھے ابھی پڑھنا ہے۔‘‘

’’کب تک بیٹی؟ کیا پی ایچ ڈی کرے گی؟‘‘

’’ارادہ تو یہی ہے اماں، آگے اللہ کی مرضی۔‘‘ اماں بار بار کے انکار سے چپ ہو کر بیٹھ گئیں۔ ضد کی رسہ کشی اب بھی چل رہی تھی۔ چھوٹی پھوپھو نے اب تو اماں کو کہنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ ہم ایک شہر میں رہتے ہوئے بھی اجنبی بن گئے تھے۔ اماں نے چھوٹی پھوپھو کے گھر جانے سے منع کر دیا تھا۔ چھوٹی پھوپھو نے فون پر بتایا کہ سرمد مزید تعلیم کے لئے امریکہ جا رہا ہے۔ اماں کے سامنے پھر ایک بار پھوپھو نے میرے لئے دامن پھیلایا لیکن اماں کی ضد اپنی جگہ پر قائم تھی اور سرمد اپنی انا کے خول میں بند ہو کر رہ گیا تھا۔ چھوٹی پھوپھو نے مجھے بلایا تھا۔ ہاں کل سرمد جا رہا ہے شاید اس لئے۔

’’سرمد! کیا وقت سے ہار گئے؟‘‘ وہ اتنی تیزی سے پلٹا زمانے بھر کی تلخی اس کے چہرے سے نمایاں تھی۔

’’تم آخر اپنی ضد چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟‘‘

’’یہ بات تم نے ممانی جان سے کہی ہوتی۔‘‘ وہ بے حد ضدی ہو رہا تھا آج بھی جبکہ جدائیاں منہ کھولے ہمیں نگلنے کو تیار تھیں۔ تمام رات وہ جاگتا رہا۔ صبح کی فلائٹ سے اسے چلے جانا تھا۔ اس ملگجی

صبح چائے کی ٹرے میرے ہاتھوں میں لرز رہی تھی۔ اس نے چائے کا کپ تھامتے ہوئے ایک نظر میری طرف دیکھا۔

''ایمی..... یہ آنسو کس لیے؟'' میرے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ تھی۔

''ایمی..... پلیز! میں کبھی کسی کے لئے اتنا دکھی نہیں ہوا ہوں۔ ایسا کیا دکھ ہے جو تم اس طرح آنسو بہا رہی ہو؟ ایمی! فار گاڈ سیک، مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں اگر جا رہا ہوں تو اپنی بہتری کے لئے۔ ایمی محبتیں کچھ ایسی بھی ہوتی ہیں جو وقت کے ساتھ پیدا ہوتی ہیں اور پھر وقت ہی انہیں ختم کر دیتا ہے۔ کل کی بات تھی اور یہ آج کی حقیقت۔ سچ ایمی بلیومی، دل بالکل خالی ہے صحرا کی طرح، تمہارے ان آنسوؤں کی ایک بوند بھی اس میں پچھلی محبت کو نہیں اگا سکی۔ اس وقت جب اپنوں سے نفرت ملی تو میں نے پناہ تم لوگوں میں ڈھونڈ لی تھی مگر اب میں سب یادیں چھوڑ کر جا رہا ہوں میں کسی کو اپنی محبت میں گرفتار نہیں کرنا چاہتا۔ بس ایمی! ڈیئر، یہ آنسو فضول ہیں۔ بہت بہت شکریہ ایمی..... تم سب کتنے اچھے تھے۔ وقت بھی تم لوگوں کے ساتھ اچھا گزر گیا تھا۔''

''سرمد..... تمہیں کیا ہو گیا ہے۔''

''کچھ نہیں ایمی..... وقت بہت کم رہ گیا۔ سرمد علی ایک خواب تھا۔ ایک پل تھا۔ ہو سکے تو ایمی سرمد علی کو بھول جانا، خدا حافظ۔''

''اف خدایا..... سرمد، تم اپنے پاس اچھی رفاقتوں کے لمحوں کی ایک یاد بھی نہیں رکھنا چاہتے اور تم ایمی، کہاں سے لاؤ گی اتنا حوصلہ جو اسے خدا حافظ کہہ سکو۔'' میں ونڈ اسکرین کے سامنے کھڑی آنسو بہا رہی تھی۔ میں نے سرمد کی طرف اپنی پیٹھ کر لی تاکہ وہ میرے ان آنسوؤں کو نہ دیکھ سکے۔ جن پر میں نے اپنا اختیار کھو دیا تھا اور پھر وہ چلا گیا۔ دل کے اندر سناٹے بھر گئے۔ وقت گزرتا گیا۔ کتنے موسم آئے اور بیت گئے۔ دل کے اندر صرف موسم یاد ٹھہر گیا تھا۔ باہر اور اندر ایک ہی جیسے موسم لگتے۔ اماں اب تھک گئی تھیں۔ گھر کی بیری پر پتھر گرتے رہے لیکن بے آواز وہ تو خود ایک پتھر سی ہو گئی تھی۔ مجھے یونیورسٹی میں جاب مل گئی تھی۔ زندگی اپنی ایک ہی رفتار سے گزر رہی تھی۔ خاموشیوں کا پھیلا ہوا سمندر ہر طرف تھا۔ بس کبھی کبھی دل اداس ہو جاتا تو میں اماں کی خدمت میں لگ جاتی۔ پھر ایک دن اسی خاموش سناٹے میں ایک ایسا پتھر آ کر گرا کہ دل کے سناٹوں میں آوازوں کی بازگشت

شروع ہو گئی۔ چھوٹی ماں زبیر کا رشتہ لے کر آئی تھیں۔ اماں ان کی پذیرائی میں لگ گئیں۔

''سرمد نے وہیں کسی لڑکی سے شادی کر لی ہے۔'' پہلی بار دکھ سے دل بیٹھ گیا تھا۔ میں کہاں کس جگہ ہوں۔ سرمد نے کسی لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ الفاظ سماعت میں ٹھہر گئے تھے۔ سنسان دل کے دشت پر یہ ایک ایسا دھماکا تھا کہ نظروں کے سامنے زمین روئی کے گالوں کی طرح اڑ رہی تھی۔ قدم تھم گئے تھے، سارے خواب دھواں دھواں۔

''آئی لو یو ایمی۔'' کی بازگشت اندر سے مجھے توڑ رہی تھی۔ تو سرمد علی، یہ تم ہو۔ یقین نہیں آتا۔ ضرور وقت نے شاید پھر ایک جھوٹ پر اکسایا ہوگا۔

''آئی لو یو ایمی..... ہاتھ پکڑ کر تم نے مجھ سے کہا اور شادی کسی اور لڑکی سے کر لی۔'' پسینے سے میرے دونوں ہاتھ بھیگ گئے۔ کتنی اذیت دی تھی تم نے؟ اس گھڑی کس قدر توہین کا احساس جاگا تھا۔ ''آئی لو یو ایمی۔'' کی بازگشت میری رگوں میں زہر ٹپکا رہی تھی۔ کیا میں اتنی بے حقیقت تھی کہ کوئی سرِ راہ چلتے ہوئے یوں کہہ جاتا۔ چھوٹی ماں بھی ایک پتھر پھینک کر چلی گئی تھیں۔ انہیں دکھ تھا تو صرف یہ کہ سرمد نے ان کی توہین کی ہے۔ اماں ایک دن کہہ رہی تھیں۔

''میں تیرے دل کے اندر تک جھانک سکتی ہوں۔ اگر ایک بار بھی سرمد آ جائے ناں تو پھر تیری طرف سے تو ہاں ہی ہے۔''

''نہیں..... اماں، کیا آپ کی بیٹی اتنی گری ہوئی ہے کہ آپ اسے گھر سے اٹھا کر پھینک دیں گی۔ ہرگز نہیں اماں، ایسا اب کبھی سوچئے گا بھی نہیں۔'' پہلے اماں دل کی مریض تھیں۔ چند ہفتوں میں دنیا ہی چھوڑ گئیں۔ سرمد کی چیزیں چھوٹی پھوپھو نے سنبھال کر رکھی ہوئی تھیں۔ تو سرمد علی، تم آج بھی لوگوں کے دلوں میں آباد ہو لیکن تم کتنے کٹھور ہو، کتنے لاتعلق سے۔ پھوپھو کو آج بھی انتظار ہے کہ تم پلٹ آؤ گے۔ پہلے تو تم نے کئی خط بھیجے تھے پھوپھو کے نام لیکن اب برسوں سے تمہاری خیریت کے لئے ترس رہی ہیں۔ شاید اس خوبصورت شہر میں تمہیں کوئی یاد نہیں آیا۔ کیا دکھ دنیا ہے اپنوں سے بچھڑنے کا دل بھر کے رونے کے لئے چھوٹی پھوپھو کا دامن ہی تھا۔ پھر میں نے آخر کار وہ شہر ہی چھوڑ دیا۔ وہ حسین بستی جہاں ہمارا پیارا سا گھر تھا۔ جہاں اب صرف سناٹے تھے۔ فاروق بھائی بھی اپنی بیگم کے ساتھ لندن میں تھے۔ اب کہاں تک میں ان تنہائیوں سے لڑتی جہاں قدم قدم پر تمہاری یادیں بکھری

تھیں۔ مگر آج پھر پورے دس سالوں کے بعد تمہارا نام یوں نظر آیا ہے۔ جیسے سنسان وحشت پر چاند اتر آئے اور چھونے کی تمنا میں انسان مٹ جائے اور جب چاند چھو کر چلا جائے تو پور پور جل کر راکھ ہو جائے۔ وجود گیلی لکڑی کی طرح سلگتا رہے۔ محبتوں کی آگ ایسی ہی آگ ہوتی ہے۔ جو نہ بجھتی ہے اور نہ مکمل کر جلتی ہے۔ بس سلگتی رہتی ہے مگر دائیں ہاتھ میں دل کی لکیر کو کاٹ کر گزرنے والی لکیر تو آج بھی اپنی جگہ قائم ہے۔ تبھی تو آج اسٹریٹ ٹائمز کے پہلے صفحے پر اس کا نام دیکھ کر آمنہ حسن بے چین ہو رہی تھی۔ یادوں کا ایک طویل تھکا دینے والا سفر کر کے لوٹ آئی تھی۔ آج پھر اس تنہا اور ویران سی دنیا میں۔

''بہت دیر ہو چکی آمنہ حسن، اب چلنا چاہیے۔'' دماغ نے سمجھایا۔

''خدایا۔ ان تین سالوں میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں اپنا کام ڈھنگ سے نہ کر سکوں۔ آج کیا خاک کر سکوں گی۔ فائل کے سارے صفحے خالی ہیں اور جو کچھ لکھا ہے اس میں بھی سپر وائزر ڈھیروں غلطیاں نکالے گا۔ کس قدر تھک چکی ہوں۔ دن کی رفتار سست ہے یا پھر میں خود آج بہت اداس ہوں۔ آسمان پر سیاہ سرمئی بادلوں کا ڈھیر موسم کو اور بھی رنگین بنا رہا ہے لیکن دل کے اندر کا موسم سوگوار ہے۔ چلو آمنہ وقت بھی ہو گیا اپنی منزل کی طرف۔ گرین کالج کے اندر تمہارا ایک کمرے کا اپارٹمنٹ تمہارے لئے اداس ہوگا۔ وہ بہت مرے ہوئے قدموں سے یونیورسٹی کی باؤنڈری سے باہر آ گئی۔ اس کے سامنے سے بس گزر گئی لیکن اس کے قدموں میں تیزی نہیں آئی تھی۔ وہ چلتی ہوئی بس اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی۔ دائیں ہاتھ کی طرف کار پارکنگ تھی جس کے سامنے سے اس کو گزر کر جانا تھا۔

''آمنہ!'' ایک بازگشت اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ "تو آمنہ بیگم اب بصیرتوں میں رہنے والا تمہاری سماعت میں بھی آ گیا۔ یہ سوچیں بھی کیا چیز ہوتی ہیں کہ کان بجنے لگتے ہیں۔" اس نے قدم اور تیز کر دیئے۔ آواز کی سمت مڑ کر ایک بار دیکھنا ضروری تھا۔ وہ عمل فطری تھا۔

''ایمی.....'' ایک آواز آئی، وہی صدا۔ یہ جاناں جو تمام عمر دل کے صحرا میں پھول بن کر مہکتی رہی اب میرا پیچھا کر رہی ہے۔ اپنی توہین کا احساس اس کی انگلیوں کی پوروں میں پھر سے جاگ رہا تھا۔

وہ ایک لمحے کو رکی تھی کہ وہی صدا یہ جاناں اس کی بصیرتوں کے سامنے آ کر ٹھہر گئی۔ اتنا بڑا جھوٹ کا بصیرتوں کو اس نے آنکھوں کو رگڑ ڈالا۔

''آمنہ.....'' وہ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ پھر ایک پل میں اس کے ہونٹوں کی ہنسی بجھ گئی۔ اس کے ہاتھ سے پرس اور نوٹ بک گر گئی۔ جھک کر اٹھایا۔

''کیسی ہو آمنہ؟'' آواز تھی یا ایک بجلی کی کوند جو اسے ساکت کر گئی۔

''تمہیں گزرتے دیکھ کر تو خود کو بھی یقین نہیں آیا تھا لیکن آواز پر مڑ کر دیکھنے سے کچھ ہمت پڑی، یہ آمنہ ہی ہے۔'' پہلے سے زیادہ سنجیدہ، ہلکی گندمی رنگت پہلے سے زیادہ نکھر آئی۔ خوبصورت چوڑے شانوں پر کوٹ وہ اسی انداز سے ایک ہاتھ سے لٹکائے کھڑا تھا۔ سیاہ بالوں سے وقت کی رفتار جھانک رہی تھی۔ اکا دکا سفید بال اس کی پیشانی پر آئے ہوئے بالوں سے جھانک رہے تھے۔ پہلے سے زیادہ اسمارٹ لگ رہا تھا۔ ہاں وہی سرمد علی جو کبھی اس کا اپنا تھا اور آج وہ اسے بے حد اجنبی لگ رہا تھا۔ ایمی عجیب غضب سے نڈھال لگ رہی تھی۔ کرب سے درد سے لبریز آنکھیں دل کے اندر جھانک رہی تھیں۔ تب ہی تو چند لمحوں کے لئے گویائی سے محروم ہو گئی تھی۔ دل کی دھڑکن دونوں کو مسمار کر گئی تھی۔ کبھی زندگی کا ایک لمحہ زیست کی راہوں میں یوں آ کر مل جاتا ہے کہ تمام عمر کسی کا ہاتھ پکڑ کر چلو تو بھی وہ تسکین نہیں ملتی جو ایک پل میں مل جاتی ہے۔ محبت بے آواز دلوں میں اتر جاتی ہے۔ ٹھہر جاتی ہے۔ دھڑکتے دھڑکتے دل ساکت ہو جاتے ہیں۔ خوشبوؤں سے دل کی رفتار بند ہو جاتی ہے۔ تمام مسافتیں لذت خواب کی طرح مچل اٹھتی ہیں۔ تب اختیار اور بے اختیاری دونوں کا امکان ہوتا ہے۔ ایک دستک سے خوابوں میں اعتبار کھوئی ہوئی راجکماری جاگ اٹھی، اس نے آنکھیں مل کر پھر اپنی بصیرتوں کو ٹٹولا۔

''نہیں..... یہ سرمد علی نہیں ہے۔'' جو اس کے وجود کے قرب و جوار میں آباد تھا مگر پھر بھلا، وہ کس طرح اسے نہ پہچان سکتی جو اس کی دھڑکنوں میں آباد تھا اور ہے۔

''تم کیسے ہو سرمد؟''

''جیسا نظر آ رہا ہوں۔''

''بظاہر تو ٹھیک ٹھاک ہی ہو۔''

''ٹوٹ پھوٹ تو دل کے اندر ہوتی ہے۔ چہرہ تو بس چہرہ ہے۔'' اس نے بہت دکھ سے کہا تو ایمی کو یوں لگا۔ آج بھی وہ دکھی ہے لیکن نہیں مرد ہمیشہ عورت کو ہمدردی سے جیت سکتا ہے۔ عورت کے دکھ

کی لکیر سب سے پہلے چہرے پر نظر آتی ہے۔ مرد تو انا ہے۔ دکھوں کو چہرے پر نہیں لاتا۔ چھپا لیتا ہے۔ سرمد بھی ایک مرد ہے۔ عورت کے دل کے خفیہ خزانوں کو پانے کا راز جانتا ہے۔ پہلے بے کس، معصوم نظر آتا ہے۔ پھر محبتوں میں ہاتھ پکڑ کر آئی لو یو کہتا ہے اور پھر ضرورت وقت کا آئینہ دکھلا کر اپنی سمت موڑ لیتا ہے۔

''آمنہ حسن، اس وقت ایک حقیقت تمہارے سامنے ہے۔ تم کمزور نہیں ہو۔ ہر چند کہ اس قدر بولڈ نیس تمہیں سرمد نے ہی عطا کی تھی۔ تمہاری قوت ارادی کو اسی نے اجاگر کیا تھا۔ اس نے ہی تم سے کہا تھا کہ خود کو اتنا مضبوط اور آہنی بنا لو کہ دنیا تم کو خود تسلیم کر لے بے وزن پیرز مین پر اپنا توازن تو نہیں رکھ سکتے۔ چلو تو یوں کہ زمین پیروں تلے رہے جو لوگ خلا میں اڑتے ہیں وہ گر جاتے ہیں۔ ان کے ہاتھ نہ زمین آتی ہے اور نہ ہی آسمان تو آمنہ حسن آج سرمد علی کے سامنے اسی انداز میں کھڑی تھی۔ مضبوطی سے زمین پر پیر جمائے تب ہی تو وہ پورے اعتماد کے ساتھ بات کر رہی تھی۔ بالکل نروس نہیں تھی۔ نہ ہی اس وقت کوئی احساس محرومی اور نہ توہین کا احساس دامن گیر تھا۔ سر راہ ملنے پر چند لمحوں کے لئے حیرت زدہ ضرور ہوئی تھی۔ پھر وہ اس سے ہنس کر پوچھ رہی تھی۔

''کب آئے؟ کیسے ہو؟ اتنے دن کہاں غائب ہو کر رہ گئے تھے سرمد؟'' وہ بڑی رسانیت سے ہر ایک بات کا یوں جواب دے رہا تھا گویا ابھی ایک پل کی بات ہے پھر اس کی آنکھوں میں ایک نرم سی محبت اتری اور وہ کہہ رہا تھا۔

''آمنہ...... یو بلیوی، آج جب میں یہاں سے ابھی کچھ دیر پہلے گزر رہا تھا تو نہ جانے کیوں اس بھیڑ میں تم یاد آ گئی تھیں۔'' اس کے ہونٹوں پر ایک خاموش مسکراہٹ تھی۔ تمام عمر سجدے کرنے کا صلہ کبھی یوں بھی ملتا ہے کہ کاتب تقدیر جب فیصلے لکھتا ہے اس وقت بس وہی لمحہ مقرر بن جاتا ہے۔ عمر کے سجدے بس ایک نظر عنایت کے محتاج ہوتے ہیں۔ بس اسے بندے کی کسی ایک ادا پر پیار آ جاتا ہے۔ آج سرمد علی کو دعا کے صلے میں عطا کر کے اس نے تمام محبتوں اور سجدوں کو بیچ کر دکھلایا تھا کہ وہ ہر شے پر قادر ہے۔ ہمارے لمحے لمحے کی خبر ہے۔ ہمارے دلوں کا حال جانتا ہے اور محبت میں صبر کرنے والے ہی اسے پیارے ہوتے ہیں۔ ایک خواب آ کر ٹھہر گیا تھا۔ دونوں نے بہت خوبصورتی سے اپنے دلوں کو ڈھانپ رکھا تھا۔

''میں یہاں ڈاکٹرز کی ہونے والی کانفرنس میں شرکت کے لئے آیا تھا۔'' مسکرا کر اس نے ایمی کی طرف دیکھا جو اسے مسکرا کر اپریشئیٹ کر رہی تھی۔

''اور تم سناؤ، مجھے تمہاری شادی کی اطلاع ملی تھی لیکن بس۔''

''لیکن بس کیا سرمد؟''

''یہی کہ آنہ سکا مجبوری تھی۔''

''تو سرمد تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں شادی کر کے اپنی دنیا آباد کر چکی ہوں۔'' ایک ٹھنڈی سی آہ ہونٹوں پر آ کر مسکراہٹ بن گئی۔

''تم بہت خوش نظر آ رہی ہو۔ کچھ لوگوں کے لئے یہی بہت کچھ ہوتا ہے۔''

'ہاں سرمد، ورنہ انسان تو دل کے اندر رہتا ہے۔' وہ بس سوچ کر رہ گئی۔

''دوسروں کے لئے ہمدردی کا جذبہ ابھی سرد نہیں ہوا۔''

''او ایمی، ایک بات کہوں، یوں ہمدردیاں سر راہ مت بانٹا کرو۔ اب ان ہمدردیوں کے مستحق تمہارے بچے اور گھر ہے۔ سمجھیں ڈیئر۔'' وہ بڑے رسان سے بولا۔

''اتنی اچھی اور خوبصورت ملاقات میں سرمد تم میرے بچوں اور گھر کو کیوں لا رہے ہو؟''

''میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔'' اس نے بات درمیان سے کاٹ کر کہا۔

''منہ دیکھے کی باتیں ہیں۔''

''ہاں جیسے تم تو بڑی مہمان نواز ہو۔ ارے بھئی تمہارے شہر میں آیا ہوں۔ یوں کھڑے باتیں کر رہی ہو۔ یہ بھی نہ کہا کہ آؤ سرمد تمہیں ایک اچھی سی چائے گھر چل کر پلاتی ہوں۔''

''لیکن اب چائے میں پہلے جیسا مزہ نہیں رہ گیا۔''

''کیوں، کیا صاحب ذوق نہیں ملا کوئی؟''

''بس مزہ ہی نہیں رہا۔'' اب میں کس طرح بتاؤں کہ میں تو تنہا ہوں سرمد، وہ میرے حال پر افسوس اور دکھ ظاہر کر کے ہمدردی کر کے چلا جائے گا اور وہ اپنا یہ بھرم ہرگز نہیں کھونا چاہتی تھی اس کے چہرے پر شاید اتنی بے چارگی تھی کہ سرمد کو سمجھنے میں بالکل دشواری نہیں ہوئی۔

''میں تو مذاق کر رہا تھا۔ وقت ہی کہاں ہے محترمہ! آپ کی بدمزہ چائے پینے کا۔ بس اب سے آدھے

گھنٹے بعد ہمارا آخری لیکچر ہے۔ پھر سرمد علی تمہارے شہر سے کل کی فلائٹ سے چلا جائے گا ڈیئر!
سوسوری ایمی۔'' وہ یوں چونک گئی گویا کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔

''اور تم سناؤ سرمد، تمہارے خوبصورت گھر میں کون کون ہے؟''

''میرے خوبصورت گھر میں!'' اس نے دل کے پاس ہاتھ رکھ دیا۔

''تمہیں بتاؤں؟''

''ہاں۔'' اس نے مسکرا کر دیکھا۔

''اس کے علاوہ بھلا کون ہو سکتا ہے؟''

''کون؟''

''وہ...... جس نے روٹھ کر چلتے وقت منہ پھیر لیا تھا۔ بات تو کیا اس نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔''

''خیر اب وہ تمہارا انتظار کر رہی ہوگی۔'' ایمی نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں!'' سرمد نے کہا۔

''وہ کیسی ہے؟''

''بہت ذہین، بہت خوبصورت لیکن دل اس نے پتھر کا لگوا لیا ہے۔''

''کیوں، کیا مغرب میں نرم دل والے نہیں ملے؟''

''نرماہٹ اور خوشبو تو تمہارے گھر کے دیسی گلابوں میں ہوتی ہے۔ جس سرزمین کی مٹی گلابوں کی خوشبو نہ پیدا کر سکے۔ بھلا وہ نرم دل کیا؟'' اس نے تلخی سے مسکرا کر ہونٹوں کو جنبش دی اور خود ہی ہنس پڑا۔

''ایمی لوگ کہتے ہیں کہ وقت زخموں کی رفوگری بھی کرتا ہے لیکن یہاں تو زخم روز ادھڑ جاتے ہیں۔''

''تم نے ٹھیک ہی سنا ہے وقت بہت بڑا مرہم ہے۔''

''تم عورت ہو تمہیں رفوگری کا فن معلوم ہے۔'' اس نے ایمی کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔

''اتنی دیر سے تمہاری آنکھوں میں کوئی گزرا ہوا پل ڈھونڈ رہا ہوں لیکن توبہ ہے جو ایک لمحہ بھی زندہ بچا ہو۔ یوں مل رہی ہو گویا ہم اس سے پہلے کبھی ملے ہی نہیں۔''

''مل کر کیا کرنا ہے؟'' وہ مسکرا کر بولی۔ سرمد کا دل جل رہا تھا۔ برسوں پرانے راکھ کے ڈھیر میں دبی

چنگاری سلگ رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ سارے دکھوں کے دروازے آنکھوں کے راستے کھول دے اور آمنہ حسن اتر کے دیکھے کہ کتنے اندھیرے دل کے دشت میں ہیں؟

''اب کیا کرنا ہے؟ ہاں تم ٹھیک ہی کہتی ہو۔'' اس نے اپنے کندھے سے کوٹ کو اس انداز میں جھٹک کر ہاتھ میں لیا گویا اب سب کھیل ختم ہو چکا ہو۔

''کل صبح کی فلائٹ سے جا رہا ہوں ایک بار تو ایئرپورٹ پر آ کر خدا حافظ کہہ دو۔''

''وائی ناٹ...... شیور میں ضرور آؤں گی۔'' ایک قدم پیچھے ہٹ کر اس نے کہا۔

''او کے آئی ول سی یو لیٹر سرمد۔''

''او کے، بائے ایمی۔'' حزن و ملال کے دریا آنکھوں میں اتر آئے۔ لیکن دکھوں سے تپتے ہوئے چہرے اپنے اندر آنسوؤں کو پی رہے تھے کہ لذت غم کی تڑپ تنہا مزا دیتی ہے۔ دوسروں کے کندھوں پر سر رکھ کر رونے والے بزدل ہوتے ہیں۔ محبتوں کو جدائیاں مضبوطی عطا کرتی ہیں۔ وہ محبت ہی کیا کہ انسان ٹوٹ کر دوسروں کے سامنے گر جائے۔ وقت رخصت کتنا تہی دامن دل تھا تب شاید یقین تھا کہ اس دل میں کوئی اور نہیں ہے اور آج یقین کر کے دل کی یادیں بھی اجڑ گئیں۔ آنکھوں دیکھے کا یقین آ گیا کہ آمنہ حسن تم میری دسترس سے بہت دور ہو۔ اسے آمنہ حسن کیا ہوا برسوں کا انتظار کہ ایک بار صرف ایک بار وہ مل جائے تو پوچھوں گی مگر کیا ہوا کچھ بھی نہیں۔'' آنسو بے اختیار بہہ گئے۔ دل بے اختیار ہو گیا۔ چند لمحوں کی رفاقت پھر سے اسے نڈھال کر گئی۔ زمین سے پیر اکھڑنے لگے۔ بے توازن قدموں سے چلی جا رہی تھی۔ تمام رنگین موسم پر اس کے آنسوؤں کی دھند چھا گئی تھی۔ آج آمنہ حسن کا دل رو رہا تھا۔ آج دل کی مسجد آنسوؤں سے بھیگ گئی تھی۔ برسوں پرانا خواب چھلک پڑا تھا۔ تمام محبتوں کے سجدے خدا کے حضور گواہی دے رہے تھے۔ آمنہ حسن نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو پونچھ ڈالا۔ جانے والا جا چکا تھا۔ بھلا تاب ہی کہاں تھی کہ وہ مڑ کر دیکھ لیتی۔ حوصلہ اور اختیار دونوں ہی اس سے ہاتھ چھڑا رہے تھے لیکن وہ تو زمین پر مضبوطی سے قدم جمائے آگے ہی بڑھتی چلی گئی۔ بس آمنہ حسن، دنیا گول ہے ہم کہیں نہ کہیں اس بھیڑ میں ایک دوسرے سے ٹکرا ہی جاتے ہیں۔ گھر آ گیا تھا۔ رات کے سناٹے اتر رہے تھے۔ اندھیری رات میں عشق کا چاند پھر آ گیا تھا۔ آواز کی بازگشت۔ ''آئی لو یو ایمی۔'' دل کے اندر اتر رہی تھی۔

ہاتھ کی مٹھیوں میں نمی بڑھتی گئی۔ احساس کا زہر بند مٹھی میں پھیل گیا تب۔ ''کیا سمجھا تھا سرمد علی تم نے جو آمنہ حسن کا ہاتھ پکڑ کر ''آئی لو یو ایمی۔'' کہہ کر اس بھیڑ میں کھو گئے اور میں تمام عمر خار خار ہوتی رہی اور ملے بھی تو میں اپنی انا کے خول کے اندر بند ہو گئی لیکن نہیں سرمد علی۔ یہ آمنہ حسن کا دل ہے ہر ایرے غیرے کی راہ گزر نہیں۔ کس قدر انجان تھے تم اور کس قدر میں بے وقوف کہ تم سے پوچھ نہ سکی کہ سرمد تمہیں میری زندگی سے کھیلنے کا حق کس نے دیا تھا۔ خیر سرمد میں، صبح تمہیں ملوں گی ضرور۔''

صبح کا موسم رنگین جلوؤں کی طرح جاگ رہا تھا موسلا دھار بارش کا شور دل تک اتر گیا تھا لیکن وہ بے نیاز اس طوفانی موسم میں بارش کے باوجود، ہاتھ میں سرخ رنگ کی چھتری تھامے تیز تیز جا رہی تھی۔ بارش کا شور، بجلی کی چمک آمنہ حسن کے قدموں کو زمین سے بار بار اکھاڑ رہی تھی لیکن آج تمام حوصلوں کی سچائیوں کا آخری لمحے کا وجود دست آیا تھا۔ وہ لمحہ جو فیصلہ کرتا ہے جو ایک نظر میں تمام برسوں کے فیصلوں کو الٹ دیتا ہے۔ وہ لمحہ جو صدیوں انسان کے اندر زندہ رہتا ہے اور پھر کسی آتش فشاں کی طرح بلاسٹ ہو جاتا ہے۔ بس ایک ایسا ہی لمحہ آج آمنہ حسن کے اندر بلاسٹ ہو گیا تھا۔ تب ہی تو سماعت سے محروم ہو گئی تھی۔ دل کی تمام آوازوں کو ایک کاغذ میں بند کر کے آج ہمیشہ کے لئے زیر آب ہو جاتا تھا۔ بس فاصلہ بہت کم رہ گیا تھا۔ تیز تیز چلتی ہوئی وہ چانگی ایئرپورٹ کے اندر داخل ہو گئی۔

''میں تو اب مایوس ہو گیا تھا۔'' سرمد نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے نا امیدی سے کہا۔

''وقت بہت کم رہ گیا ہے۔'' اس نے جھک کر بریف کیس اٹھا لیا۔

''اچھا ایمی، دنیا گول ہے پھر ملیں گے۔''

''شاید آج کے بعد کبھی نہیں سرمد۔'' اس نے اپنا پرس کھولتے ہوئے کہا۔ ہاتھ تھوڑی دیر کے لئے رکا اور پھر۔

''سرمد...... وقت تھا ہی نہیں، یہ ایک خط ہے اسے تم پڑھ لینا۔''

''میرے لئے؟''

''ہاں ہاں تمہارے لئے۔'' اس نے لفافہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ تو سرمد کو آج آمنہ حسن بہت مختلف لگی۔ تب نہ چاہتے ہوئے وہ مڑ گیا، جب آمنہ حسن نے بہت تلخ مسکراہٹ سے کہا۔

''اینڈ ناؤ آئی وانٹ ٹو سے یو گڈ بائے سرمد۔'' تو آمنہ حسن آج تم نے دل کی تہوں سے خدا حافظ کہہ ہی دیا۔ اس دل میں اب خزاں رسیدہ تمنا کو کون جگہ دیتا اور جب دل ساتھ چھوڑ دے تو انسان ایک مٹی کا بت ہے وہ خود سے بول پڑی۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا

درد کی دوا پائی، درد لا دوا پایا

چلو اچھا ہوا ایمی! ختم ہوا کھیل، ایک تمنا جو برسوں سے دل میں پل رہی تھی، آج تم اس کے سپرد کر آئیں اب کنج دل میں آمنہ حسن تنہا رہنے کی حقدار ہے۔ درد کے لمحوں کی آبشار آج تھم گئی ہے۔ اسی لئے تو آنسو خشک ہو گئے ہیں۔ چانگی ایئرپورٹ سے وہ تھکی تھکی باہر آ گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں نظر آنے والا جہاز سیاہ اور کاسنی بادلوں کو پیچھے کر کے خود بادلوں میں چھپ گیا۔ انسان تو کیا اب زمین بھی مسافروں کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ ایک دھماکا ہوا اور جہاز پھٹ گیا دھواں ہی دھواں فضا میں بکھر گیا۔ ہر چیز معلق ہو گئی۔ یہ کیوں ہوا؟ یہ کیسے ہوا؟ ہر سمت اندھیرا ہی اندھیرا۔ سرمد کو ایسا ہی لگا تھا۔ آمنہ حسن کا خط اس کے ہاتھوں میں لرز رہا تھا۔ اور وہ ساکت اپنی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ تمام سناٹے دل کے اندر اتر گئے تھے۔ ٹوٹے ہوئے دل کا غبار اس نیلے کاغذ پر پھیلا ہوا تھا۔ تمام لمحوں کا حساب ریزہ ریزہ ہو کر سوچوں میں بکھر گیا تھا۔ فاصلوں نے بے بسی سے اسے قید کر رکھا تھا۔ ورنہ تو دل چاہ رہا تھا کہ وہ تیز رفتار جہاز سے بھی زیادہ تیز اڑ کر آمنہ کے سامنے پہنچ جائے۔ قید کر لے تمام لمحوں کو جو بیت گئے ہیں اور جو باقی ہیں۔ خود کو پھر اس نے یقین دلانے کے لئے آمنہ کے خط پر نظر ڈالی۔ جو ابھی تک اس کے سامنے کھلا پڑا تھا۔

سرمد!

چند لمحوں کی رفاقت آج مجھے قوت گویائی دے گئی ہے۔ دل میں دستکیں ہوتی ہیں۔ خواہشیں سر ابھارتی ہیں مگر انسان خواہشوں اور خوابوں کے حصار میں رہتا ہے۔ پھر کبھی کبھی سر راہ چلتے ہوئے برسوں کی نیند ٹوٹ جاتی ہے۔ تو تمام عمر کے خوابوں کا بھرم بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح آج دل کے اندر ایک آدرش کا بت ٹوٹ گیا ہے جو کل سر راہ ٹھکرایا گیا تھا۔ آج واقعی تم سے دور جاتے جاتے یہ پوچھنا چاہتی ہوں سرمد کہ کیا سمجھ کر تم نے آمنہ حسن کا ہاتھ پکڑ کر کہا تھا ''آئی لو یو ایمی!'' پتا ہے سرمد

تمہارے ان لفظوں کی بازگشت نے مجھے تمام عمر سنگسار رکھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں کو خود ہی اس جرم کی سزا دی اور تمام خواہشوں کو قید کر کے دل میں قفل ڈال دیا۔ اس بازگشت نے احساسِ توہین کا زندگی میں ہی کفن پہنا دیا کہ آمنہ حسن اتنی معمولی تھی کہ ہر ایرا غیرا ہاتھ پکڑ کر یوں کہہ جائے ''آئی لو یو ایمی!'' سرمد تمہیں یہ جان کر حیرت نہیں ہونی چاہئے کہ آمنہ کل کیسی تھی اور آج کیسی ہے؟ یہ قتل تم نے کیا ہے سرمد! آمنہ حسن کا قتل، ہاتھ پکڑ کر مجھ سے کہا اور آگے بڑھ گئے۔ تم نے سرمد، کیوں کیا یہ مذاق جو بہت بھاری ہے۔ جس کا بوجھ اٹھانے کے لئے آمنہ حسن نے خود کو تھپک تھپک کر سلا دیا کیا کبھی حساب دے سکو گے میری اس زندگی کا جو میں گزار رہی ہوں۔ کیونکہ محبت ایک بار ہوتی ہے۔ دل مسجد ہوتا ہے، مندر نہیں۔ کاش تم جواب دے سکو کہ تم نے کیا سمجھ کر یہ مذاق کیا تھا اور تمہیں یہ جواب دینا ہی ہوگا۔

آمنہ حسن

''نہیں، آمنہ نہیں، یہ مذاق نہیں تھا، یہ تو پھول اور خوشبو کا بندھن تھا، جس کے درمیان غلط فہمیاں آ گئی تھیں جو ہمیں ایک دوسرے سے دور لے گئیں لیکن آمنہ پھول اور خوشبو کا بندھن ہمیں پھر ایک دوسرے سے قریب لے آئے گا۔ میں تمام لمحوں کا عذاب اپنی پلکوں سے چن لوں گا۔ یہ سنگباری کا بوجھ ہماری قسمت تھا ہماری محبت کا یقین ہماری زندگی کا صفحہ جس پر کاتب تقدیر نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کے لئے لکھا تھا۔'' سرمد نے بے بسی سے خط کو کوٹ کی جیب میں رکھا۔ گھڑی پر نظر ڈالی۔ وہ ہزاروں فٹ بلندی پر پرواز کر رہا تھا۔ وقت کس قدر آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ یوں جیسے وہ صدیوں سے سفر کر رہا ہو اور سفر پھیلا جا رہا ہو۔ ہر بار مڑ کر دیکھے تو سفر کے آغاز پہ نظر پڑے۔ آج سفر کس قدر طویل لمحوں پر پھیل گیا تھا۔ ہر لمحہ آمنہ حسن کو جواب کا انتظار رہا۔ یونیورسٹی سے آ کر سب سے پہلے وہ لیٹر بکس کھول کر دیکھتی اس انتظار میں دو ماہ بیت گئے۔ آمنہ حسن اب انتظار کر رہی تھی۔ 'اس کے پاس کہنے کے لئے کیا رکھا ہے۔' اس نے گرین کاٹیج کے اپارٹمنٹ کی بالائی منزل کی کھڑکی کھولتے ہوئے سوچا۔ بے موسم موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ ہر چیز پر دھند چھائی ہوئی تھی۔ دور تک پھیلے ہوئے گارڈن کے درخت ہرے پہاڑوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ کھڑکی کے قریب والے درخت پر جھنڈ سے پرندے شور مچا رہے تھے۔ دن کے پہلے ہی حصے میں وہ آج خوراک سے محروم ہو گئے

تھے لیکن بارش کسی بھوک اور سوچوں سے بے نیاز موسلا دھار برس رہی تھی۔ کال بیل کی آواز پر وہ اوپر سے نیچے آ گئی۔ جونہی دروازے کا لاک گھما کر اس نے کھولا سامنے وہی تو تھا جس کا انتظار تھا اور نہ ہی طلب، جس کے چہرے پر نہ برسوں کی مسافتوں کی تھکن تھی اور نہ کوئی دکھ یا ملال بس وہ دروازے کے عین درمیان میں کھڑا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ پھر ایک پل میں وہ آمنہ حسن کے دونوں ہاتھ پکڑے کہہ رہا تھا۔

''میں جواب دینے کے لئے خود ہی آ گیا ہوں۔ میری زندگی میں بھی کوئی ایسا موڑ نہیں آیا۔ جہاں کوئی دوسرا میرے دکھ اور خوشی شیئر کرتا۔ کل بھی تنہا تھا اور آج بھی ہمارے درمیان یہ فاصلے چھوٹی ماں نے قائم کئے ہیں۔ ورنہ ضدی سرمد کے من کا بت تو اسی دن ٹوٹ گیا تھا جس دن اس نے اپنے وطن کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ گلابوں کی راحت اور ان کی مہک بے کل رکھتی تھی۔ ضد اور انا کے خول سے باہر آ کر میں نے ابو سے رابطہ قائم کر لیا تھا۔ میں اپنے اس پچھتاوے کی تلافی کے لئے گھر لوٹ جانا چاہتا تھا تب ہی تو میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ابو سے تمہاری طلب کر بیٹھا تھا۔ جواب میں چھوٹی ماں نے لکھا تھا کہ ابو شدید بیمار ہیں اور تم کسی اور کی ہو چکی ہو۔ پھر کیا کرتا؟ میں بھی اس شہر طلسم میں کھو گیا۔ تم سب سے بچھڑ کر میرے لئے اب اس جگہ کیا رکھا تھا جہاں میرے خوابوں کے گلاب جل گئے تھے۔ سرمد علی تنہا اس بھیڑ میں گھومتا ہوا تم سے پھر ایک بار آن ملا ہے۔ تم کل بھی میری تھیں اور آج بھی، یو بلیو می ایمی!'' صرف الفاظ نہیں، دکھ کا احساس اس کے انداز میں ایسا تھا کہ ایک بار پھر آمنہ حسن گویائی سے محروم ہو گئی تھی کچھ کہنے کے لئے لب کھولے تو الفاظ ساتھ چھوڑ گئے تھے۔

''سرمد......''

''پلیز ایمی، معاف کر دو۔'' سبزا ور بادلوں بھری گھنیری چھاؤں کے باوجود خطِ مستقیم سے قریب سورج دوبارہ نکل آیا تھا۔ تو اتر سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو آمنہ حسن نے پونچھ ڈالا۔ پھول کی خوشبو کا کوئی لمحہ پھر سرگوشی کر رہا تھا۔

''آئی لو یو ایمی۔''

''آئی لو یو سو مچ ٹو......''

آج کے لمحے کتنے جاذب اور پرکشش ہیں۔ ماحول میں صرف عثمان علی کے وجود کی مہک اور میری سانسوں کی آہٹ مجھے بے خود کئے دے رہی ہے۔ اور میں عثمان کے پورٹریٹ کے قریب پھولوں کا گلدستہ لئے کھڑی ہوں۔ جیسے ان خوبصورت پھولوں کی خوشبو مہک گیت بن کر ابھی ابھی عثمان علی کو چھپا کر میرے لئے لے آئے گی حالانکہ عثمان مجھ سے اس وقت تقریباً ساڑھے چار ہزار میل دور ہے لیکن پھر بھی وہ میری بصیرت اور سماعت کو چھو رہا ہے اور میں ایک ایک گلاب کی پنکھڑی میں عثمان علی کے قرب کو محسوس کر رہی ہوں۔ میں اس گلدستے کے پھولوں میں اپنے خواب جذب کر رہی ہوں۔ جسے ابھی ابھی زرینہ فلاور اسٹور والوں نے عثمان کی طرف سے بھیجا ہے میری شادی کی پہلی سالگرہ ہے۔ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ جس کا مجھے انتظار تھا۔ عثمان ہی کا فون تھا۔ فرط جذبات سے میرے آنسو چھلک پڑے اور ڈھنگ سے بات بھی نہ کر سکی۔ بس دل چاہ رہا تھا وہ بولتا رہے اور میں صرف سنتی رہوں۔ اسے میری آمد کا انتظار تھا۔ میری طرح وہ بھی تنہا تھا۔ حسین اور خوبصورت لمحات میرے منتظر تھے اور وہ مجھے جلد اپنے سے قریب دیکھنا چاہتا تھا۔ بس ایک ہی رٹ۔

"ڈیئر... جس قدر جلد ہو سکے آجاؤ۔"

"ہاں، پھول پسند آئے؟"

"شکریہ عثمان۔"

"ارے پگلی، بھلا میں یہ دن بھی بھول سکتا ہوں۔ سنو، بہت جلد تم [illegible] سے کام ختم ہو چکا ہے اور اب صرف انتظار ہے نوشی۔"

"بہت بہتر حضور۔"

"اور ہاں تمہاری شادی کا تحفہ اتنا سستا تھوڑی ہو سکتا ہے۔"

"واقعی؟"

"تم کو کل ایک اور سرپرائز ملے گا۔ میں نے یہاں سے آرڈر پر تمہارے لئے خاص تحفہ بک کروایا ہے۔ وہ کل مل جائے گا۔" وہ بولے چلا جا رہا تھا اور میں اس محبت کی بارش میں آنسوؤں سے بھیگتی رہی تھی جس کا اسے بھی احساس تھا۔

"لیکن پھر بھی عثمان، اتنا قیمتی!"

"ڈیئر... تمہارے لئے تو میری جان بھی کوئی قیمت نہیں رکھتی تم ان شیشوں کو قیمتی کہہ رہی ہو۔"

"اچھا چلو اتنا ہی قیمتی ہے تو بس یوں سمجھ لو اس میں عثمان کی جان بند ہے۔ بس ایک بار تو ہنس دو۔"

اور میں ہنس پڑی پتا نہیں وہ اور کتنی دیر مجھ سے بات کرتا کہ موسم کی خرابی کے باعث سلسلہ منقطع ہو گیا اور میں ریسیور تھامے اس کے الفاظ چنتی رہ گئی۔ کل کے آنے والے دن کا مجھے شدت سے انتظار تھا جو میرے لئے عثمان کا بھیجا ہوا سرپرائز لائے گا۔ تمام رات ہی حسین تصور اور ان ہی سوچوں میں گم رہی۔ کمرے میں پھیلی ہوئی روشنی تیز ہوتی گئی اور معلوم نہیں میں کب سو گئی تھی۔ صبح انہی چاہتوں کا تصور لئے آئی۔ میں نے اٹھ کر پائیں باغ میں کھلنے والی کھڑکی کھول دی۔ نرم و نازک ہوا کے جھونکے مجھے خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ سامنے ہی میری کوٹھی کے خوبصورت حصے میں رنگین پرندوں کا جھمگٹا لگا ہوا تھا۔ مورنی اپنے پروں کو اٹھائے ناچ رہی تھی۔ مجھے اس وقت بھی عثمان یاد آ گیا۔ رنگین اور ہر قسم کے پرندے پالنا جس کا شوق تھا۔ وہ اتنی دور بیٹھا ہوا یقیناً ان سے غافل نہیں تھا۔ سامنے ہی مالی کیاریوں کی گوڈی میں مصروف تھا۔ سفید سنگ مرمر کے بنے بارہ دری کے دریچوں میں دھوپ اتر رہی تھی۔ جہاں شام کے وقت میں اور عثمان دور کا نظارہ کرتے تھے۔ ملازمہ بیڈ ٹی لے آئی میں نے گرم چائے کا ایک گھونٹ لیا تو یوں محسوس ہوا جیسے سارا جسم تھکا ہوا ہو۔ میں نے برش کر کے بالوں کو پیچھے کیا تو مجھے اپنی آنکھوں میں نیند نہ آنے کی شکایت ملی میں ہولے سے مسکرا دی۔ عثمان کے کسی شرارتی لمحے کا عکس ہونٹوں پر مسکرا رہا تھا۔ دوپہر میں اکثر بوریت کا شکار ہوتی ہوں۔ آج بھی یہی ہوا۔ باوجود انتظار کے حیدر بھائی سرپرائز لے کر نہ آئے۔ ٹیلی فون کرنے پر پتا چلا کہ وہ ابھی ابھی اسی سلسلے میں گھر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ گھر میں نوکروں اور میرے علاوہ کوئی دوسرا نہیں تھا۔ خاموشی سے مجھے ہمیشہ ہی ڈر لگتا ہے۔ پتا نہیں کیوں میں تنہائی سے ڈرتی ہوں۔ میں خود کو مصروف

کرنے کے لیے پھر ایک بار عثمان کی پرائیویٹ دراز کھول کر بیٹھ گئی۔ تجسس میری پرانی عادت ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ جب میں نے ہوش سنبھالا تو اکثر سوچا کرتی کہ اماں نے اس میں کیا رکھا ہے؟ کسی دن کھول کر دیکھوں گی۔ موقع ملتے ہی میں ایک ایک چیز اماں کی کھول کر دیکھتی۔ اسی تلاش میں مجھے اماں کی وہ پازیب کپڑے میں بندھی ہوئی ملی جس کے بارے میں اماں نے بتایا تھا کہ ڈھائی پاؤ کی پازیب اماں جان چھ ماہ پاؤں میں باندھے پھری تھیں اور مارے ڈر کے دادی جان سے کچھ نہ کہہ سکی تھیں۔ جب زخم ہو گیا تو دادی جان نے خود ہی کھول دی۔ یہ قصہ سن کر ہی میرے دل میں تڑپ پیدا ہو گئی تھی کہ وہ پازیب ضرور دیکھوں گی اور پھر ڈھونڈ کر وہ تاریخی پازیب دادی جان کے سامنے میں پاؤں میں باندھ کر چھما چھم گھومی تھی۔ میں نے سرخ ربن سے باندھے ہوئے وہ خطوط نکال لیے جنہیں عثمان نے بہت سنبھال کر رکھا تھا۔ یہ کسی کی یاد تھی جس میں، میں خود بھی شریک تھی۔ سارے خطوط میرے اپنے تھے۔ جنہیں عثمان نے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ بقول عثمان کے تمام خطوط میں وہی وصل جذبے مچل رہے تھے۔ ایک ایک لمحہ قریب تر ہو رہا تھا اور آخر میں پڑھ کر مسکرا دیتی۔ تجربات کی بنا پر کہی ہوئی بات یقیناً بھاری ہوتی ہے۔ میری طرح کبھی عثمان بھی اسی کمرے میں تنہا ہوتا ہوگا تو اس کو بھی یہی وصل جذبے تنہائی میں آ کر جتا دیتے ہوں گے۔ میں آئینے میں خود کو دیکھ کر بہت ہنسی اپنی اسی ہنسی پر دل چاہا کہ کوئی ٹوک دے بالکل امی کی طرح کہ کیا ہے کھی کھی کرے جا رہی ہے۔ پھر بعد میں روئے گی۔ رونے کے ذکر ہی سے میں سہم گئی۔ امی نے ہمیشہ کہا کہ مت ہنس اتنا کہ بعد میں رونا پڑے۔ دل میں یہ وہم چند لمحوں کو آیا پھر میں نے دھیان ہٹا دیا اور پھر مجھے امی اور زریں آپی یاد آ گئیں۔ کتنے دن ہو گئے تھے ان سب سے ملے ہوئے۔ وہ لوگ بھی کیا چیز ہیں۔ مجھے اس دہلیز پر کیوں چھوڑ گئے۔ جیسے کوئی لحد میں اتار کر بے خبر ہو۔ عجیب دقیانوسی لوگ ہیں۔ کل ہی مسز جمال پوچھ رہی تھیں کہ آپ کے والدین سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ ''آج کل ممی ڈیڈی امریکہ گئے ہوئے ہیں۔ عنقریب وہ آنے والے ہیں۔'' میں نے کلب میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ وہاں کوئی ہمارا واقف نہیں تھا ورنہ بھانڈا پھوٹ جاتا۔ محبت میں اختیار صرف دل کو ہوتا ہے اور دل سدا ہی کا بے اختیار ہے۔ چاہتیں مچل اٹھتیں اور سرخ ربن سے بندھے ہوئے خطوط چھوڑ کر دل چاہا ایک بار، صرف ایک بار امی کے گلے لگ کر رو لوں معافی مانگ لوں۔ گڈو اور زریں آپا سے

محبت کے دو بول لے آؤں۔ بے چارہ ڈرائیور پھر صاف گاڑی کو بار بار پونچھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے دروازہ کھول دیا۔ پتہ نہیں اس وقت امی کیا کر رہی ہوں گی زریں آپی تو مشین پر جھکی ہوئی دھاگے کے سرے کو دانتوں سے بار بار توڑ رہی ہوں گی۔ گڈو اپنا ہوم ورک کر رہی ہوگی اور ہمارے ابا یقیناً اس وقت مسجد میں ہوں گے۔ لوگ اپنی امانتیں رکھواتے ہیں۔ کوئی شرعی مسئلہ آئے تو ابا قرآن اور سنت کی روشنی میں حل کرتے ہیں۔ بے چارے ابا سر پر تنگی کا تاج رکھے دل کے کشکول میں مسجد سے آ کر سوکھی روٹی ڈال کر سو جاتے ہیں پھر بھی زندہ رہنے کا حوصلہ ہے ایک وقت کھا کر شکر کرتے ہیں۔ بے اختیاری سب سے پہلے آنکھوں سے چھلکتی ہے۔ میں نے اپنی آنکھیں صاف کیں۔ گھر آ گیا تھا۔ میں بہت زیادہ ایکسائیٹڈ تھی۔ دروازہ کھلا چھوڑ کر تیزی سے قدم اندر کی جانب بڑھا دیئے۔ لمحہ بھر کے توقف کے بعد میں بغیر دستک دیئے گھر کے اندر تھی۔

''ارے...... نوشین کب اور کیسے آ گئیں؟'' زریں آپی نے تیزی سے چلتی ہوئی مشین روک دی۔ گڈو کو بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ گویا میں کچھ بدل گئی ہوں۔ آپی نے اشارے سے بتایا کہ امی جان باورچی خانے میں ہیں۔ میں امی کے پیر پکڑ لینا چاہتی تھی کہ بس امی ایک بار معاف کر دیں لیکن امی نے اس قدر بجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ گویا میں ابھی ابھی گھر کے کسی کونے سے اٹھ کر آ رہی ہوں۔

''چھوٹی آپا، آپ کس قدر خوبصورت لگ رہی ہیں۔'' گڈو نے میرے بالوں کے اسٹائل کو دیکھتے ہوئے کہا۔ زریں آپی بھی مجھے پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ صرف امی سے ہی نظریں نہ ملا سکی جو مسلسل کام میں مصروف تھیں۔ زریں آپی سمجھ گئیں۔

''شکیب تو رات میں آئے گا۔'' یہ کہہ کر زریں آپی میرے لیے چائے بنانے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''ارے رہنے دیں آپی۔''

''بس پانچ منٹ لگیں گے۔ میں لے کر آتی ہوں۔''

''میں خود بناتی ہوں آپی۔''

''تمہارے خوبصورت ہاتھ مٹی کے دھواں پھینکتے ہوئے چولہے کی حفاظت نہ کر سکیں گے نوشی۔'' آپی محبت سے مسکراتی ہوئی چائے بنانے چلی گئیں۔ گڈو میرے ہاتھوں کے کنگنوں کو کبھی چھو کر کبھی اتار کر

دیکھ رہی تھی۔ بہت زیادہ کنفیوز تھی۔ کبھی مجھے کبھی وہ میرے ہاتھوں کو دیکھتی۔

''کیا واقعی یہ سچے ہیں آپا؟''

''ہاں۔''

''اللہ! کتنے خوبصورت لگ رہے ہیں آپا۔''

''میں تمہیں بھی ہوا کر دوں گی۔''

''نہیں، تم ایسا کبھی نہیں کرنا نوشین۔ امی اور ابا سخت ناراض ہوں گے۔'' زریں آپی نے گڈو کو آنکھ کے اشارے سے منع کیا۔ وہ فوراً یوں ہٹ گئی جیسے میں اچھوت ہوں۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ وقت بہت تیزی سے گزر گیا تھا لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے ابھی ابھی آئی ہوں۔ وہ شاندار کوٹھی کا رسب کچھ بھول گئی تھی۔ دل تھا کہ مچل گیا۔ بس یہیں رہ جاؤں۔ جیسے میں کبھی عثمان ولا گئی ہی نہ تھی۔ کچھ بھی تو یاد نہیں رہا تھا۔ بس لمحے سمٹ کر مٹھی میں آ گئے تھے۔ دل کی بے اختیاری دماغ کو سونپ دی تو دل ابا کے آنے کے خوف سے دھڑکنے لگا۔ میں نے گڈو کو پیار کیا اور امی کو خدا حافظ کہنے کے لیے ان کے کمرے میں گئی لیکن دروازے کے سہارے رک گئی۔ امی خود ہی باہر آ رہی تھیں۔ میری نظریں انہیں اور امی کی نظروں سے ٹکرا کر جھک گئیں۔ ایسے لمحے لفظ چھین لیتے ہیں۔ ہونٹ کپکپاتے اور ساون بھادوں سے زیادہ کالی گھٹائیں آنکھوں میں گھر آتی ہیں۔ میں اپنے ہاتھوں سے چہرہ چھپائے مڑ گئی۔ میرا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا۔ گڈو دور ہٹ کر رونے لگی اور زریں آپی نے میرے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے کہا۔

''اس طرح مت رو۔ پشیمانی اور محبتوں کے درمیان خوش رہنا سیکھو نوشی۔''

''آپی..... میری اچھی آپی۔ بس ایک بار ابا اور امی سے کہو میری غلطی معاف کر دیں۔''

''شکیب اور میں پوری کوشش کرتے ہیں کبھی نہ کبھی تو امی اور ابا مان جائیں گے۔ پھر تم آ سکو گی۔ اب تم جاؤ نوشی۔'' دل کے دریچے آنکھوں کے راستے گزر رہے تھے اور میں شکستہ پا لوٹ آئی۔ دل میں گلابوں کے بیچ کانٹا چبھ گیا تھا۔ زیست کھلے سر مجھے پھر اس رنگین دنیا میں لے آئی جہاں دنیا بھر کا عیش و آرام تھا اور تنہائی میں آ کر پرندوں کے بیچ ایسا لگا شاید میں بھی ایک خوش رنگ اڑتی ہوئی تتلی ہوں۔ جسے عثمان نے پکڑ کر قیمتی البم میں چسپاں کر دیا ہے لیکن نہیں آنکھیں صاف تھیں۔ آئینے میں صرف

عثمان علی کی شکل نظر آ رہی تھی۔ میں نے ان کے پورٹریٹ کے سامنے کھڑے ہو کر دیکھا۔ میں اپنے قد سے اونچی دکھائی دے رہی تھی۔ ایک پشیمانی تھی جو سو چاہتوں کے بیچ بھی میرے دل میں پھانس بن کر چبھی تھی۔ پشیمانی، تنہائی اور محبت انسان کو گھلتے سائے کی طرح کر دیتی ہے۔ پہروں دھوپ دل میں اتر آتی ہے۔ آنکھیں بلا برسات میں اللہ آمین یا چاند رات کو تنہا یادوں میں محبتوں کو کھوجتا رہے۔ بالکل میری طرح لیکن سب کچھ تنہا۔ ابھی پشیمانی اور تنہائی نے عثمان علی کے بھیجے ہوئے پھولوں کو بے رنگ نہیں کیا تھا۔ گلابوں کی خوشبو میرے کمرے میں [illegible] رہی تھی۔ بھائی حیدر کا انتظار کرتے ہوئے تیسرا دن تھا۔ حیدر بھائی ہمارے بہت اچھے بزنس پارٹنر ہیں اور عثمان علی کے بہت خاص دوست۔ حیدر بھائی ہمیشہ کہتے ہیں۔

''میں کبھی وقت پر نہیں پہنچ سکتا۔'' اور آج بھی وہ بے وقت ہی آ گئے ویسے بھی میں اب رات کو جاگنے اور دن کو سونے کی عادی ہو گئی تھی۔ یہ عادت میں نے عثمان علی سے سیکھی ہے۔ ان کی تمام عمر مجھے فجر کی نماز پڑھا کر اٹھاتے تھے۔ [illegible] کہتے۔

''صبح جلدی اٹھنا چاہیے۔ سارا دن برکت بن کر ساتھ رہتی ہے۔'' لیکن میں تھی کہ فجر کی نماز کے بعد پھر سو جاتی تھی تو زریں آپی شمشین سے بیدار ہوتی تھیں لیکن یہاں آ کر تو سب کچھ الٹا ہو گیا۔ صبح سوئے تو شام کو جاگے۔ رات بیتتے دن نکل رہا ہوتا اور اسی طرح سے دوسرے دن کا آغاز ہوتا۔ میں نے تحفے پھولوں کا سیٹ رکھتے ہوئے حیدر بھائی سے پوچھا۔

''اس میں کیا ہے حیدر بھائی؟''

''یہ عثمان علی کا سرپرائز ہے۔'' میں نے لفافہ لے لیا۔ میری خوشی کی انتہا تھی۔ جب پتہ چلا کہ میں صرف ایک ہفتے میں عثمان کے پاس جا رہی ہوں۔ حیدر بھائی نے ویزے اور ٹکٹ کا بندوبست کر دیا تھا۔ یقیناً یہ خوشی کی بات تھی۔ حیدر بھائی کافی دیر بیٹھے رہے اور پھر چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی عثمان کا فون آ گیا۔ عثمان کو یہ بات پتہ تھی کہ ابھی ابھی یہاں سے حیدر بھائی گئے ہیں لیکن پھر بھی عثمان نے کنفرم کر لیا۔ عثمان اکثر رات کو فون کرتے اور میرے منع کرنے کے باوجود وہ گھنٹوں باتیں کرتا رہتا۔ وہ مجھے آج بھی فون پر بچوں کی طرح ہدایات دے رہا تھا۔ میرے تنہا سفر کرنے پر وہ خاصا پریشان تھا۔

"ہیلو نوشی میرا بھیجا ہوا سرپرائز پسند آیا؟"

"ریلی عثمان سو بیوٹی فل۔"

"سفر کے دوران بہت کیئرفل رہنا۔"

"او کے عثمان۔ تم فکر مت کرو میں حفاظت کے ساتھ پہنچ ں گی۔"

"نوشی...... دوسری بات یہ کہ تم اپنے ڈریس کا خاص دھیان رکھنا۔ یہاں تمہیں ریسیو کرنے والوں میں میرے دوستوں کی فیملی ایئر پورٹ پر موجود ہوگی۔ تمہارے لباس میں اتنی انفرادیت ہو کہ وہ خالص مشرقی لباس لگے۔ ویسے بھی ڈیئر میں مغربی لباس دیکھتے دیکھتے تنگ آ گیا ہوں۔"

"اس قدر ایکسائیٹڈ ہو عثمان؟"

"بس نوشی، دل یہ چاہ رہا ہے کہ فون رکھوں تو ہفتہ بیت جائے اور سامنے صرف تم ہو۔" کتنی دیر وہ باتیں کرتا رہا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں کبھی تنہا تھی ہی نہیں۔

"او کے نوشی۔"

"خدا حافظ ڈیئر۔" اور میں نے ریسیور رکھ دیا۔ کتنی دیر تک اس کی آواز کانوں میں بار بار گونجتی رہی۔ بار بار ہونٹ مسکرائے۔ پھر ہفتہ بہت جلد بیت گیا۔ میں نے ڈھیروں تحفے عثمان کے لئے خریدے۔ اپنے لئے لباس بوتیک سے ڈیزائن کروائے۔ کچھ چیزیں حیدر علی، عثمان کے لئے لائے تھے جن میں جوتے، براس کے جانور اور چند فرنیچر کے پیس تھے جو کہ عثمان نے ڈرائنگ روم کے لئے منگوائے تھے اور اسی نے مجھ سے بھی ذکر کیا تھا۔ تقریباً دو ڈھائی بجے تک حیدر بھائی میرے سامان کی پیکنگ کرتے رہے۔ صبح کی فلائٹ سے مجھے لندن جانا تھا۔ میں نے تمام تیاری مکمل کر لی تھی۔ اس کے بعد میں نے خود اپنی طرف توجہ دی۔ بالوں کا اسٹائل تو میں نے کل ہی تبدیل کروالیا تھا۔ مسئلہ صرف بہترین ڈریس تھا۔ سو وہ بھی حل ہو گیا۔ میں نے عثمان کی پسند کے رنگ کا سوٹ نکالا جو گلابی رنگ پر وائٹ زری کے کام سے خوبصورت بج رہا تھا۔ ویسے بھی یہ کلر مجھ پر سوٹ کرتا تھا۔ میرے پورے سنگھار سے جذبات کی نکھراں مسحور کن خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔ میں نے تمام ملازمین کو ہدایات دیں اور اپنا سامان ڈرائیور سے اٹھوا کر گاڑی میں رکھوا دیا تھا۔ حیدر بھائی خود گاڑی ڈرائیو کر رہے تھے۔ عثمان علی کی طرح وہ بھی مجھے ایک ایک بات بہت پیار سے سمجھا رہے تھے۔ پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد

میں نے کراچی ایئرپورٹ پر حیدر بھائی کو خدا حافظ کہا اور خود اندر امیگریشن کے لئے چلی گئی۔ پی آئی اے کی فلائٹ 781 کا اناؤنسمنٹ ہوا۔ میں نے اپنا پرس اور بیوٹی بکس سنبھالا اور لوگوں کی لمبی لائن میں شامل ہو گئی یہ میرا پہلا سفر تھا۔ میں کچھ کچھ نروس ہو رہی تھی لیکن عثمان کی جدائی کشاں کشاں مجھے لئے جا رہی تھی۔ تقریباً سات گھنٹے کی پرواز کے بعد جہاز فرینکفرٹ پر لینڈنگ اپروچ بنا رہا تھا۔ کھڑکی سے بلیک فاریسٹ جھنڈ کے جھنڈ نظر آ رہے تھے۔ یہ لمبے لمبے درخت جو ایئرپورٹ پر نظر آتے ہیں، انہیں بلیک فاریسٹ کہتے ہیں۔ کچھ دیر بعد اوپر اٹھتے ہوئے جہاز سے شہری زندگی کی مصروفیات نظر آ رہی تھیں۔ وقت بہت تیزی سے گزر گیا اور پتہ ہی نہ چلا کہ اب پیرس قریب ہے۔ میں نے میگزین بند کیا اورلی کے ایئرپورٹ پر جہاز لینڈ کرنے والا تھا۔ میں اورلی ایئرپورٹ سے دریائے سین کی خوبصورتی دیکھنا چاہتی تھی۔ ایفل ٹاور کے اوپر سے جہاز گزر رہا تھا اور میری منزل مقصود قریب تر ہو رہی تھی۔ دل میں امنگیں جاگ رہی تھیں۔ میں چھ ماہ یا چھ صدیاں کاٹ کر عثمان سے ملنے جا رہی تھی۔ تمام راستے اس کے تصور میں جاگتی رہی۔ اناؤنسمنٹ ہوا کہ ہم اب دریائے ٹیمز اور اس کے پل کے اوپر سے گزر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ہم ہیتھرو (لندن) ایئرپورٹ پر اترنے والے جہاز سے باہر آئے۔ باہر نکل کر میری نظریں عثمان علی کو تلاش کر رہی تھیں لیکن ابھی کسٹم اور امیگریشن کے مرحلے سے گزرنا تھا میں گرین چینل سے باہر نکل آئی۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے قریب کھڑے ہوئے حیدر بھائی کو دیکھا۔ میرے ساتھ ہی انہوں نے سفر کیا تھا لیکن کس قدر رازداری کے ساتھ، وہ ہنسنے لگے۔

"دراصل بھابھی۔" انہوں نے ابھی میرے سوال کا جواب دینا چاہا تھا کہ عثمان علی نظر آ گیا۔ وصل جذبے فراق راتیں چہرے سے جدائی کی خلعت اتار رہے تھے۔ آنکھیں بے قراریوں کے موسم بتا رہی تھیں۔ چاہتوں کے اظہار میں آنکھیں بھیگتی جا رہی تھیں۔ وہ بھلا آج کیوں پیچھے رہتیں۔ عثمان نے مسکراتے ہوئے مجھے فر کا کوٹ اور اونی کیپ دیتے ہوئے کہا۔

"آج ٹھنڈ زیادہ ہے نوشی تم اسے پہن لو۔" میں نے کوٹ پہنا تو عثمان نے سر پر ریڈ کیپ لگا دی اور میں مسکرا دی۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ چاروں طرف کہر چھائی ہوئی تھی۔ ہر چیز شفاف لگ رہی تھی۔ اتنے خوبصورت موسم میں صرف مجھے عثمان علی خوبصورت لگ رہا تھا جو گرے کلر کے سوٹ میں

نہیں تھا۔ اس کے پاس سے بھینی بھینی پرفیوم کی مہک آ رہی تھی۔ جب میں عثمان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھنے لگی تو خیال آیا۔

"ارے عثمان سامان کہاں ہے؟"

"وہ حیدر لے جا چکا ہے تم فکر مت کرو۔ ہم سے پہلے وہ گھر میں موجود ہوگا۔" عثمان گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ باتوں کا سلسلہ تھا کہ رکتا نہیں۔

"یہ دیکھو تو شی اب یہاں سے تھوڑی ہی دیر بعد ہم گھر پہنچ جائیں گے۔" چند لمحوں بعد ہم گھر کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوئے۔ عثمان نے گاڑی پورچ میں کھڑی کی۔ اس وقت بھی ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ سامنے مکانوں کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ سرخ پیلے گلابی پھول پانی کے قطروں کے بوجھ سے جھوم رہے تھے۔ ہم تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ حیدر بھائی واقعی مع سامان کے موجود تھے۔ انہوں نے گرم گرم چائے دیتے ہوئے کہا۔

"تو شی ..... تم اس بات پہ ناراض تو نہیں ہو؟"

"ناراض تو نہیں ہوں حیدر بھائی لیکن حیران ضرور ہوں۔" عثمان نے گویا میرے دل کی بات کہہ دی تھی۔

"ہاں یار اب ایسا بھی کیا کہ تم اچانک سے آئے اور تو شی کو پتہ بھی نہ چلا۔"

"آئی ایم سوری تو شی۔ میں نے تمہارے ساتھ مذاق کیا تھا حالانکہ ایسی بات نہیں اگر وہ ابھی تمہیں کوئی ہوشیاری ہوتی تو میں فوراً تم سے ملتا۔"

"لیکن پھر تو شی نے کیا خوبصورتی سے ترال لئے مجھے چاروں طرف ڈھونڈ رہی تھی۔" عثمان نے جاتے ہوئے آخری سپ لیتے ہوئے کہا۔ حیدر بھائی بھی اس بات پر مسکرا دیئے۔ حیدر بھائی کو ہمارے ساتھ ہی ٹھہرنا تھا اس لئے وہ گیسٹ روم میں چلے گئے۔ میں اور عثمان دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ہمارا بیڈروم اوپر تھا۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی ہر چیز بہت نفاست سے اپنی جگہ پہ تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل پہ چند پرفیوم اور کاسمیٹکس کا سامان پڑا تھا۔

"عثمان ...... یہ کیا ہے؟" میں نے سوالیہ انداز سے پوچھا۔

"مائی سویٹ تو شی ..... تم کن چکروں میں پڑ گئیں۔ میں اکیلا رہتا ہوں اس لئے ایک ٹیبل لو ہے اک

گیسٹ رکھا ہوا تھا۔ کم آن ڈارلنگ۔" عثمان نے سگریٹ کا سارا دھواں میرے چہرے پر چھوڑ دیا۔ میں نے مشکوک نظروں سے پھر اس کی طرف دیکھا۔

"عثمان علی صرف تمہارا ہے اور تمہارا رہے گا۔ سمجھیں بیوٹی کوئن!" اس کی آنکھوں میں محبت کا بیکراں سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ نیم وا دریچوں سے نم ہوتی ہواؤں کی ٹھنڈک دے رہی تھی۔ کمرے میں گرم سانسوں کی مہک اور جڑاؤ کنگن کی کھنک تھی۔ دوسرے دن آفس سے واپسی پر عثمان میرے لئے کئی ڈریسز لے کر آیا۔

"میں عثمان...... میں یہ کپڑے پہنوں گی؟" میں نے اسکرٹ بلاؤز دیکھتے ہوئے کہا۔

"وائی ناٹ۔ اس میں حرج بھی کیا ہے؟"

"لیکن مجھے تو مغربی لباس پسند نہیں۔"

"جان دیکھو، میں تمہیں ہر روپ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ جیسا دیس ویسا بھیس۔" اس میں سے میں نے آج شام کے لئے جین جیکٹ والا سوٹ پسند کر لیا۔ جب میں ڈریس اپ ہو کر سامنے آئی تو عثمان دیکھتا رہ گیا۔

"مائی سویٹ ہارٹ...... یو آر سو بیوٹی فل۔" پھر وہ نہ جانے مجھے کہاں کہاں لئے لئے پھرا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اکثر ڈرائیو کرتے ہوئے میں ٹوکتی۔

"عثمان...... اس قدر ریش ڈرائیو مت کرو پلیز۔"

"کیوں؟ مرنے سے ڈر لگتا ہے جان! ایک ساتھ مرنا ہے۔ ہر چیز میں شیئر! یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔" اور اپنی اسپیڈ اور بھی تیز کر دیتا۔

"مجھے ڈر لگتا ہے عثمان۔"

"کس چیز سے؟"

"اتنی ساری محبت سے۔"

"ارے بس اتنی سی محبت سے۔" اس نے ہوا میں مٹھی بھر کر دکھاتے ہوئے کہا تو میں ہنس پڑی۔

"ما بدولت محبت میں بہت رچ ہیں۔"

"اچھا؟"

"ہوں۔"

"دیکھوں گی۔"

"مانگئے کیا مانگنا ہے؟ تاج برطانیہ دے سکتا ہوں۔" اس نے سر کو میرے شانے پر جھکا دیا۔ حیدر بھائی اکثر اپنے کام کے سلسلے میں باہر رہتے عثمان نہ صرف مجھے ٹائم دے رہا تھا بلکہ حیدر بھائی کو اکثر رات میں لے کر کلب چلا جاتا۔ جہاں سے وہ کافی دیر میں گھر آتے۔ خوشی کا زمانہ بہت جلد بیت جاتا ہے۔ دو ماہ یوں گزر گئے جیسے دو دن۔ حیدر بھائی اور عثمان کچھ آپس میں کھنچے ہوئے لگ رہے تھے۔ اب دونوں ایک ساتھ کلب نہیں جا رہے تھے۔ اکثر حیدر بھائی کافی لیٹ آتے اور آتے ہی اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیتے اور اگر وہ سامنے ہوتے تو عثمان پتہ نہیں کیوں کترا کر گزر جاتا اور مجھے یوں لگتا جیسے حیدر بھائی کو ہمارا ایک ساتھ گھومنا پھرنا پسند نہیں ہے۔ عثمان کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ہر بار وہ میری آنکھوں میں جھانک کر رہ جاتا۔ میں نے ایک دن خود ہی پوچھ لیا۔

"عثمان..... تمہارا پارٹنر کچھ ناراض ہے؟"

"ہاں....." اس قدر مختصر جواب تھا۔

"کیوں؟"

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کچھ ذاتی پرابلم ہے۔" عثمان آج صبح سے بہت گہری سوچ میں تھا۔ پتہ نہیں وہ کھوئی کھوئی نظروں سے میرے چہرے پر کیا تلاش کر رہا تھا؟ حیدر بھائی آج گھر پر نہیں آئے تھے۔ انہیں پوچھنے کئی لوگ آئے تھے۔ عثمان ابھی تک جاگ رہا تھا اور مسلسل سگریٹ پی رہا تھا۔ کمرے میں دھواں ہی دھواں تھا۔ کسی اہم فیصلے کی گھڑی لگ رہی تھی۔ شاید ان کا کوئی ذاتی مسئلہ تھا۔ عثمان نے اس قدر سخت رویہ اختیار کر لیا تھا کہ باوجود کوشش کے میں کچھ نہ پوچھ سکی۔ آج میں نے سوچ لیا تھا حیدر بھائی آ جائیں تو جا کر بات کروں گی۔ آخر وہ ہمارے مہمان ہیں خواہ مخواہ ہی عثمان نے ان کو اتنا سیریس لے لیا ہے۔ بالکل مزہ نہیں آ رہا لائف میں، کوئی بات ہے ہر شخص اپنا منہ لپیٹے پڑا ہے اور میں درمیان میں پس رہی ہوں۔ عثمان جوتوں سمیت کاؤچ پر لیٹا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں کی کہنیوں سے آنکھیں بند تھیں۔ میں سمجھ رہی تھی وہ سو رہا ہے۔ اسی لئے میں نے بلینکٹ اس کے اوپر ڈال دیا اور آ کر خود لیٹ گئی۔ حیدر بھائی کے یوں لیٹ آنے پر نیند کوسوں دور تھی۔ اوپر سے عثمان کی پریشانی

باوجود کوشش کے نیند نہیں آ رہی تھی۔ انٹرنس کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ چابی حیدر بھائی کے پاس بھی ہوتی تھی۔ یقیناً وہی ہوں گے میں جان کر انجان بن گئی جیسے میں سو رہی ہوں تاکہ عثمان نیچے خود جائے ان سے اس غیر حاضری کی وجہ معلوم کرے اور پھر میں جا کر دونوں کے درمیان معاملہ طے کرا دوں۔ یہ سوچ کر میں نے ادھ کھلی آنکھوں سے دیکھا۔ عثمان میری طرف دیکھ رہا تھا اور پھر اس نے کمبل سے میرے کھلے ہوئے پیروں کو ڈھانپ کر ایک بار رک کر پھر دیکھا۔ زینے سے اترنے کی آواز آئی اور میں مسکرا کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بغیر آہٹ کئے ہوئے زینے سے نیچے اتر گئی۔ عثمان حیدر بھائی کے کمرے میں جا چکا تھا دروازہ بند تھا۔ میں نے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور چند سیکنڈ بعد اندر جانا چاہتی تھی۔

"ہر وقت نوشی نوشی! تم نے ہر چیز پر اسے فوقیت دے رکھی ہے۔ بہت ہو گیا عثمان، اب اسے چلتا کرو۔"

"کیوں؟" ہینڈل ہاتھ سے خود ہی چھوٹ گیا۔ سماعت جھٹلا رہی تھی۔

"حیدر..... کیا یہ ممکن نہیں نوشی ہمارے بزنس میں پارٹنر بن جائے؟"

"مسٹر..... ہوش کے ناخن لو۔ ہمارا بزنس انسان کا دل نہیں جو راہ چلتی ہوئی لڑکی کو شامل کر لے۔"

'راہ چلتی ہوئی لڑکی'۔

"تم سمجھنے کی کوشش کرو حیدر..... نوشی لوزمی۔" عثمان کی آواز تھی۔

"تو ٹھیک ہے عثمان ہم اپنا کاروبار الگ کر لیتے ہیں لیکن نوشی پر اعتماد کرنا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔"

"میری بات سنو حیدر تم نے نوشی کو ابھی سمجھا نہیں میں جو کہوں گا وہ وہی کرے گی شی لوزمی۔"

"مجھے سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں عثمان۔" اس نے اپنی آواز تیز کرتے ہوئے کہا۔

"جو لڑکی صرف تمہاری شان و شوکت سے متاثر ہو کر اپنے والدین کے اعتماد کو دھوکا دے اس کے بارے میں، مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔"

"ایک بات سوچ لو، نوشی ہمارے ساتھ رہ کر بہت کچھ کر سکتی ہے۔ اسے ہماری نجی زندگی کا کوئی احساس نہیں۔ وہ صرف خوابوں میں رہنے والی لڑکی ہے۔ محبت چاہتی ہے اور کچھ نہیں۔ اسے اپنے راستے سے ہٹانا میرے بس کی بات نہیں۔"

"یہ کام تمہیں خود کرنا ہوگا عثمان۔"

"نہیں حیدر...... یہ اب ممکن نہیں رہا۔"

"ختم کرو یہ ناٹک اور تم واپس جاؤ عثمان۔"

"نہیں نوشی ساتھ جائے گی حیدر۔" غصے میں حیدر بھائی کی آواز لڑکھڑا گئی۔ میری سماعت مجھے جھٹلا نہ سکی اور میں بہت تیزی سے اوپر کمرے میں آ کر بیڈ پر گر پڑی بالکل بے جان سی، کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ آنکھیں بالکل خشک تھیں۔ زبان اکڑ گئی تھی۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ خوف سے حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد زینے پر بھاری جوتوں کی آواز آ رہی تھی۔ وہ میری طرف آ رہا تھا۔ خوف سے میرا جسم اکڑ گیا۔ وہ مجھے اب ختم کر دے گا۔ حیدر بھائی نے اسے قائل کر لیا ہوگا۔ آواز جوں جوں قریب آ رہی تھی، میں دل میں کلمہ پڑھ رہی تھی۔ سرہانے موت کھڑی رقص کر رہی تھی جوتوں کی آواز قریب آ کر رک گئی میری آواز ہی نہ تھی کہ میں کسی کو مدد کے لئے پکارتی۔ اب میں ختم ہونے والی تھی چند لمحے باقی تھے۔ پھر وہ قریب آ کر رک گیا۔ شاید کوئی طریقہ سوچ رہا تھا۔ جوتوں کی آہٹ سے پتہ لگا وہ دوسری سمت مڑ گیا۔ میرا جسم ساکت تھا۔ اس نے میرا منہ اپنی طرف کر لیا۔ میری آنکھیں بند تھیں۔ مجھ پر غشی طاری تھی۔

"نوشی۔" اس کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی سنائی دی۔

"بہت گہری نیند میں ہو۔ میں تمہیں ڈسٹرب نہیں کروں گا۔" اس نے دوسری طرف کروٹ لی۔

"اف میرے خدا، وہ نشہ بھی کرتا ہے۔" دل دھڑک رہا تھا۔ دل چاہا کہ کروٹ بدل لوں لیکن مارے ڈر کے میں خاموش اسی کی طرف منہ کئے لیٹی رہی۔ میں نے آہستہ سے آنکھ کھولی وہ بے خبر جوتوں سمیت خراٹے لے رہا تھا۔ کافی دیر بعد میں نے دونوں آنکھیں پھاڑ کر دیکھا میں زندہ تھی۔ عثمان باہر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے میری طرف دیکھا اور پھر قریب چلا آیا۔

"کیا بات ہے نوشی! طبیعت تو ٹھیک ہے؟" پھر خود ہی بول پڑا۔

"کیا کروں ڈیئر رات دل میں قیامت برپا تھی۔ بس اسی لئے کچھ زیادہ ہی پی گیا۔" اس نے بہت شوخی سے مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔

"بس کرو نوشی، اب ہنس دو۔" وہ بہت جلدی میں تھا۔ میں بس اسے دیکھے جا رہی تھی۔ وہ تیزی سے

سیڑھیاں اترتے ہوئے پھر پلٹ آیا۔

"سویٹ ہارٹ! تم نے مجھے آج خدا حافظ نہیں کہا۔"

"خدا حافظ۔" میں نے کھڑکی سے پردہ ہٹا کر دیکھا۔ حیدر بھائی گاڑی نکال چکے تھے۔ [illegible] نے پیچھے نظر ڈالی۔ عثمان [illegible] گاڑی کی طرف جا رہا تھا۔ گاڑی [illegible] سڑک پر نکل گئی۔ میں اب پوری طرح ہوش میں تھی، جاگ رہی تھی اور زندہ تھی موت کا وقت کچھ دیر کے لئے ٹل گیا تھا۔

"یہ تمہارا قد کیوں گھٹ گیا ہے؟ بولو نوشی بیگم جواب دو۔ تمہارے قد سے بڑے آئینے میں تم خود کو چھوٹی کیوں دکھائی دے رہی ہو؟ آئینہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔" اس وقت زندگی کی تمام بدصورتی سمٹ کر میرے چہرے پہ پھیل گئی تھی۔ آنکھیں روتے روتے سرخ ہو گئی تھیں۔ میں [illegible] آنسوؤں کے ساتھ درد سے اپنی بے بسی پر قہقہے لگا رہی تھی۔ اس قدر ہنسی کہ بے دم ہو کر دیواروں پر ٹکریں مارنے لگی۔ یہ سفاک خوبصورت دیواریں مجھے چوٹ کا احساس کہاں دلا سکتی تھیں۔ پھر تھک کر میں نے خود ہی آنسوؤں اور قہقہوں کو سمیٹ لیا۔ ایک لمحے کو یوں لگا بجلی کا کرنٹ پاس ہو گیا۔ میں بہت تیزی سے اٹھی۔ الماری کے تمام کپڑے نکال ڈالے۔ خوبصورت ہیروں کا [illegible] پھینک دیا تھا۔ تمام [illegible] کھلی ہوئی میرا منہ چڑا رہی تھیں۔ فرنیچر کے شیشے ٹوٹے ہوئے پڑے تھے۔ تو یہ تھی تمہاری حیثیت اور [illegible]

[illegible]

زندگی [illegible] زندگی تمہیں بچالی ہے؟ بولو کچھ تو بولو۔" آئینے [illegible] میں نے اپنی نظر ہٹالی۔ میں اس ہنسی کا جواب نہیں دے سکتی تھی۔ "اٹھو نوشی دروازہ کھول دو۔ موت کو اس قدر [illegible] بہت [illegible] نوشی۔ کل وہ یہ نہ کہے کہ تم موت سے ڈر گئیں۔" میں نے کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تاکہ وہ آ کر مجھے ختم کر سکے۔ آج دل پہ بہت بوجھ تھا۔ وقت کی رفتار سست ہو گئی تھی۔ مجھے عثمان علی کا انتظار تھا لیکن وہ بہت دیر بعد آیا۔ ڈھیروں گجرے لئے ہوئے تاکہ میں اس کی نیت پہ شک نہ کروں۔ خدایا! وہ کس محبت سے مجھے کھینچ رہا ہے۔ کیا مرنے والوں کو محبت میں [illegible] کی طرح پیار کر زندگی کو خدا حافظ کہنا پڑتا ہے۔ شاید عثمان سے رحم ہے۔ میرے ریشمی بالوں کی گرفت سے میرا فن

زندگی کو ختم کر دے گا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اب میں اپنے آپ کو موت کے سپرد کر رہی تھی۔ وہ اپنے ہونٹوں سے گلاس لگائے مجھے خوش رنگ مشروب دکھا رہا تھا۔ بضد تھا کہ ایک گھونٹ آج لے لوں۔ وہ بہت خوش ہے کیا کہنا چاہتا ہے؟ پھر اس نے خوشی میں پاگلوں کی طرح مجھے کسی بچی کی طرح دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر گھما ڈالا۔

''نوشی آج میں بہت خوش ہوں۔ تمہیں یاد ہے میں نے کہا تھا، ہم ہر ایک چیز میں شیئر کریں گے۔ میں نے تمہیں اپنے کاروبار میں شریک کر لیا ہے۔ آج تم مائنڈ مت کرنا اس خوشی میں آج تم بھی شرکت کر لو۔'' اس نے گلاس میرے منہ سے لگا دیا۔

''نہیں عثمان۔''

''صرف ایک گھونٹ۔''

''کبھی نہیں۔'' شاید مجھے نشے میں موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا ہے۔ لیکن میں نیند میں نہیں، جاگتے ہوئے مرنا چاہتی ہوں میں مسکرا کر موت سے گلے ملنا چاہتی ہوں۔ نیند کوسوں دور تھی۔ گھڑی کی ٹک ٹک سنائی دے رہی تھی۔ تمام آوازیں خاموش تھیں۔ عثمان بے خبر سو رہا تھا اور میں سڑک کی بجلی روشنی میں رات کو گرنے والی تیز بوندوں کو دیکھ رہی تھی۔ تم نے میرے صبر کو آزمایا ہے۔ آزما لو، میں مایوس نہیں کروں گی۔ یہ دن اور رات بھی گزر گئی۔

''نوشی...... نوشی......'' وہ مجھے خوشی سے پکار رہا تھا۔ حیدر بھائی بھی مسکرا رہے تھے۔ اچھے فنکار میں سب سے بڑی خوبی حقیقت کا رنگ ہوتا ہے۔ سو وہ ان کے ہونٹوں پہ ہے۔

''میں حسن کا دیوانہ ہوں نوشی...... یو نو؟'' میں نے جواب میں سر ہلا دیا۔

''آج ہم تمہیں بہت ساری سیر کروائیں گے۔ دور تک ساحل سمندر پر۔'' اس نے مسکرا کر ایک نقشہ کھینچ کر میز پر بتایا۔ شاید وہ مجھے کسی گہرے کھڈ میں گرا دے گا۔ وہ مجھے ساحل پر لے جا رہا ہے۔ ارے پاگل ڈوبنے والے ڈوب چکے ہیں۔ تم کیوں انہیں دوبارہ وہاں لے جا رہے ہو۔ خیر میں کھلی آنکھ سے آج سمندر میں جانا پسند کروں گی۔ میں دیوانوں کی طرح اپنے آپ سے باتیں کرتی رہتی تھی۔ عثمان جان کر بہت تیز گاڑی ڈرائیو کر رہا ہے لیکن میں خوفزدہ نہیں ہوں۔ اس نے اور اسپیڈ دے دی لیکن مجھے حیرت نہیں ہے۔ بہت ممکن ہے وہ اسی تیز رفتاری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دھکا

دے دے اور میں ختم ہو جاؤں گی۔' میں نے سوچا۔

'تم کیوں دیر کر رہے ہو۔ بس وقت ہے دور دور تک کوئی گاڑی نہیں۔ دھکا دے دو۔ بزدل، تم نے رفتار سلو کر دی۔ کیوں عثمان؟ تھوڑا وقت اور گزارنا چاہتے ہو۔ تمہاری مرضی۔' میں سوچتی رہی۔

''آج تم نے جو بہادری کا ثبوت دیا ہے نوشی میں نے خود ہی ہار مان لی اور اب ہم اسی کی رفتار سے چلیں گے۔ ٹھیک ہے ارے کچھ تو منہ سے پھوٹو بس جیسے جاؤ گی وہ بھی ہذیانی انداز میں۔'' عثمان بولا۔

ساحل سمندر پر اتنی بھیڑ۔ سیاحوں کا ہجوم در ہجوم، شور، زندگی کے ہنگامے۔ عثمان میرا ہاتھ تھامے یوں جا رہا تھا جیسے میں بھیڑ میں گم ہو جاؤں گی۔ خدایا اتنی بھیڑ اور میں اتنی تنہا۔ اپنے نہ ہونے کا احساس۔ عثمان نے میرا ہاتھ اوپر کھینچا اور مجھے وکٹوریہ گاڑی میں بٹھا دیا۔ اس نے ہنستے ہوئے کاغذ کا رنگین تاج خرید کر میرے سر پر رکھ کر بہت محبت بھرے انداز میں دیکھا۔ سڑک کے درمیان کی طرف اشارہ کیا۔ تاج برطانیہ سے مشابہہ تاج ہوائیں ہلکے ہلکے ڈول رہے تھے اور میں فراخدلی سے ہنسے جا رہی تھی۔ اپنے حصے کی تمام ہنسی آج خرچ کر دینا چاہتی تھی۔ بلیک پول کے ہنگامے، میرے دل کے اندر جگہ نہ بنا سکے تو عثمان نے سمندر میں نہانے کے لئے مجھے گھسیٹ لیا۔ ہاں اب وہ یہاں مجھے اس گہرے سمندر میں تنہا چھوڑ کر جائے گا۔ ہواؤں کے تیز جھکڑ جسم میں تھرتھری پیدا کر رہے تھے۔ میں مسکرا دی۔ نہیں، مجھے تو کوئی احساس نہیں۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں تاکہ تم آرام سے میری بے دھیانی کا فائدہ اٹھا سکو۔

''او مائی گاڈ نوشی۔ تمہارا رنگ زرد ہو رہا ہے۔'' اس نے ماتھے پر سے پانی پونچھتے ہوئے کہا۔ میں نے بہت معنی خیز مسکراہٹ دی اور کہا۔

''عثمان! کیوں، بس؟ اتنی جلدی؟''

''اب ہم ایک اچھے سے ریسٹوران میں گرم چائے پئیں گے۔''

''شکریہ۔'' میں نے بغیر آواز کے کہا۔

''نوشی...... آج کی تفریح کیسی رہی؟''

''بہت بہتر۔ ہمیں پھر ایک بار اس خوبصورت ساحل سمندر کو آزمانا چاہیے۔''

"میں صرف انسانوں کو آزماتا ہوں اور وہ بھی خوبصورت۔" اس نے مسکرا کر میری طرف اشارہ کیا۔

"میں تمہیں اتنی احمق نظر آتی ہوں؟" وہ مجھے اس رش میں گھسیٹتا ہوا آگے لے گیا۔ قدیم مصری نفیری کی آواز دل کے اندر ڈوب گئی، ساکت تھی میں، فراعین مصر کے زمانے کے بت کی طرح۔ سامنے ملکہ مصر قلوپطرہ تخت پر جلوہ افروز تھی۔

"تمہارے حسن سے مشابہ ہے نوشی۔"

"کیا؟" میں پہلی بار چونکی تھی۔ وہاں ڈھائی ہزار سال پہلے کا زمانہ آنکھوں کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ جولیس سیزر اور سپہ سالار اعظم انتھونی کی داستان محبت اور قلوپطرہ کا حسن بھی مجھے خوف سے آزاد نہ کرا سکا۔ عثمان ایک ایک چیز مجھے بچوں کی طرح پکڑ کے دکھا رہا تھا۔ کب اور کیسے؟ بلیک پول کے ساحلی علاقے میں اب ہم پھر واپس بائی کار ومبلڈن جا رہے تھے۔ عثمان بہت خوش تھا۔ وہ بہت احتیاط سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ بہت بزدل ہے۔ مجھ پر ترس آ گیا۔ شاید یہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اسی لئے ایک دن اور دینا چاہتا ہے۔ احمق میرا کام ختم کر دے۔ باقی اب میرے پاس رہ کیا گیا ہے؟ کیوں میری زندگی کو پرولانگ کر رہا ہے؟ کیوں وہ ہر لمحے مجھے کانٹوں میں گھسیٹ رہا ہے۔ کب اور کیسے؟ میں ان سوالات میں الجھی رہی۔ اتنے لمبے راستے کا وقت بہت جلد گزر گیا۔ احساس اس وقت ہوا جب ہم گاڑی سے اتر رہے تھے۔ رات زیادہ ٹھنڈی تھی۔ کہر میں آسمان کی خوبصورتی چھپ گئی تھی۔ ہر چیز اپنے حسن کو چھپائے ہوئے تھی۔ حتیٰ کہ میرے لئے اپنی جاذبیت کھو کر اندھے ہو چکے تھے۔ اعتماد کے تمام آبگینے لہولہان تھے۔ ماحول پر میری ذات کے سناٹے چھائے جا رہے تھے اور عثمان تو بے انتہا خوش تھا۔ جیسے اسے کوئی دولت ہاتھ آ گئی ہو۔ آج ومبلڈن ٹینس ٹورنامنٹ کا فائنل امریکہ کے جان میکنرو اور جرمنی کے بورس بیکر کے درمیان کھیلا جا رہا تھا۔ عثمان اور حیدر بھائی دونوں ہی گئے ہوئے تھے گھر میں، میں تنہا تھی۔ دونوں اکٹھے میرے بارے میں کوئی فیصلہ کر کے آئیں گے۔ اسی لئے تو عثمان مجھے ساتھ نہیں لے کر گیا۔ ورنہ وہ ہر جگہ ساتھ رکھتا ہے۔ بھلا آج میری کیا ضرورت تھی۔ کافی دیر تک خود سے سوال کرتی رہی۔ شام تقریباً چھ بجے کے قریب عثمان گھر آ گیا۔ حیدر بھائی کہیں چلے گئے تھے۔ میں نے ان کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ باہر جانے کا سوال ہی نہیں تھا۔ عثمان اکیلا کیوں آیا ہے؟ وہ اپنی سائیڈ ٹیبل میں کچھ تلاش کر رہا ہے۔ اس نے

بریف کیس کھولا اور پھر لیمپ کا بٹن آن کیا۔ اور جھک کر میز پر کچھ لکھنے لگا۔ میں اس کی طرف پیٹھ کر کے دوسری طرف کھڑی تھی کہ اس کی آواز پر چونکی۔

"نوشی...... محبت میں اعتماد ضروری ہے۔" میں کچھ بھی نہیں سمجھ پائی تھی۔

"دیکھو۔" اس نے چیک بک سے چیک پھاڑ کر میرے سامنے کر دیا۔

"تمہارا شیئر ہے دو لاکھ ڈالر۔" میں نے حیرت سے دیکھا۔ یہ کون سا انداز ہے؟ وہ میری حیرت کو جان گیا تھا۔

"نوشی...... اگر میں چاہتا تو تمہیں اس راز سے بے خبر رکھتا لیکن نہیں، جو کچھ ہے وہ تمہارے سامنے ہے حیدر اور میرے درمیان اب تم بھی شامل ہو اور یہ تمہارے پہلے ٹرپ کا شیئر ہے۔ یہ تمہاری ذاتی ملکیت ہے اور آئندہ بھی برابر کا حصہ ہوگا۔" میں نے اس کاغذ کے پرزے کو دیکھا جس نے میری زندگی کی قیمت خود ہی بتا دی تھی۔ میری حماقتوں کا صلہ میرے ہاتھ میں تھا۔ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ موت کا خطرہ ٹل گیا تھا۔ موت ہار گئی تھی۔ میں نے پہلی بار کچھ سنا اور دیکھا تھا۔ اپنے ہونے کا احساس جاگ رہا تھا۔ تو یہ تھی عثمان تمہاری محبت! ایک خوبصورت نیکلس جسے پا کر میں نے حیدر بھائی پر اعتماد کر لیا تھا اور ان کی دی ہوئی چیزیں لے آئی۔ اس اعتماد کو حیدر بھائی نے اٹیچیوں میں نہیں میرے دل میں بند کیا تھا۔ میرے تمام سوٹ کیس انہوں نے خود تیار کر دئیے تھے اور یہی وجہ تھی کہ وہ سائے کی طرح میرے ساتھ ساتھ رہے تھے۔ اف خدایا! اتنا بڑا فراڈ! میرے جسم میں کپکپی طاری ہو گئی۔ عثمان میری کیفیت جان چکا تھا۔

"نوشی پلیز...... اس طرح مت دیکھو۔ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔ میں تمہیں کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا۔ آئی لو یو نوشی۔" اس نے مجھے کافی کا کپ تھمایا۔ پہلی بار میرے آنسو جو خشک تھے، بہہ نکلے اور وہ پریشان ہو کر بار بار اپنی محبت کا احساس دلاتا رہا۔ اسے کیسے سمجھاتی، محبت احساس دلانے سے نہیں ہوتی محبت تو خود وہ احساس ہے جو دل کے اندر دھڑکتا ہے۔ لیکن میں خاموش تھی۔ لفظ پتہ نہیں کہاں جا کر ختم ہو گئے تھے۔ اپنی جاں بخشی کا ثبوت میری مٹھی میں بند تھا اور محبت کا وہ دیوتا جو میرا مجازی خدا تھا۔ شرمندہ ضرور تھا لیکن میری طرح مردہ نہیں۔ محبت کے کتنے دبیز پردے اٹھ گئے تھے۔ آنکھیں جل تھل تھیں۔ ساری برسات میرے آنچل میں بھر گئی تھی۔ راتوں کی سیاہی آنکھوں میں

روشنی کی تلاش میں تھی اور روشنی جگنوؤں کی طرح دور دور بھاگ رہی تھی۔ زندہ رہنے کے لئے شیئر لینا ضروری تھا۔ شاید یہ پیشکش حیدر بھائی کی طرف سے تھی۔ اسی لئے وہ آج گھر سے غائب تھے۔ تمام رات میں گیلی لکڑی کی طرح سلگتی رہی۔ پریم کا کنگن آج خود ہی ٹوٹ گیا تھا۔ میری انگلیاں خون میں ڈوب گئی تھیں اور میں نے بند مٹھی کو کئی بار کھول کر دیکھا۔ ریکھاؤں کے جال میں کہیں تقدیر الجھ گئی تھی۔ صاف نہیں دکھائی دے رہا تھا کہ ہتھیلی کے بیچ میری زندگی کی ریکھا میں کیا لکھا ہے؟ موت یا زندگی؟ عثمان مجھ سے بے نیاز اپنے کاموں میں مصروف تھا۔ اسے میرا کوئی دھیان نہیں تھا۔ شاید وہ اسی طرح سے اپنی شرمندگی مٹا دینا چاہتا تھا۔ میں نے شکستہ آواز میں اس سے کہا۔

''تمہاری محبت مجھے موت سے قریب تو کر گئی عثمان لیکن میں اس دلدل میں کیسے چل سکوں گی؟ محبت خالی لفظوں کا کھیل ہے یا انسانی ضرورت؟'' لیکن وہ کچھ بھی نہیں سن رہا تھا۔ بنت حوا کو وہ ابھی پہچان نہیں سکا تھا۔ اس نے صرف محبت کرنے والی ایثار پسند اور وفا شعار عورت دیکھی تھی۔ اس لئے وہ اپنی بات کہہ کر نوید زندگی مٹھی میں دے کر خود مدہوش تھا لیکن میں ہوش میں تھی۔ حالات سے میرا ابھی کچھ کچھ سمجھوتہ ہو گیا تھا رو کر دل کی بھڑاس تو نکل گئی تھی لیکن پھانس دل میں پیوست تھی جو روز بروز اندر کی طرف جا رہی تھی۔ تین ماہ بعد واپسی کا پروگرام بن گیا۔ مجھے عثمان نے چوبیس گھنٹے پہلے یہ اطلاع دی۔ میں نے اپنا سامان پیک کیا۔ جب میں یہ خوبصورت شہر چھوڑ رہی تھی اس وقت میری تقدیر کی طرح سیاہ اور آوارہ بادل گھوم رہے تھے۔ جن کی کوئی منزل نہیں تھی۔ شاید میری طرح ہواؤں میں اپنی منزل ڈھونڈ رہے تھے۔ واپسی کا سفر بہت مشکل ہو گیا تھا۔ زیست سوال بن کر سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔ 'نوشی بیگم، یہ اڑان کیسی رہی؟ خواب نیم وا دریچوں سے آتے ہیں یا نہیں؟ خوشبو سے بے نیاز پھول چھوڑ کر کہاں جا رہی ہو؟ کسی جگہ کہاں ملو گی؟' میں نے سختی سے زندگی کو جھڑک دیا۔ 'چپ ہو جا مجھ سے سوال مت کر۔' تو وہ ہمدردی کرنے لگی۔ میں نے پھر چڑ کر کہا۔

''خاموش! رحم اور ترس صرف کمزوروں کے لئے ہوتا ہے۔ میں کسی بھی چیز سے خوفزدہ نہیں ہوں۔''

میں نے اپنی قوت ارادی کو یکجا کیا اور کہا۔

''حیدر بھائی...... میں تیار ہوں۔'' پیک مرر میں زندگی پھر سوال بن کر سامنے آ گئی تھی۔ 'آج جب ہنس رہی ہوں۔ واپس جا رہی ہوں۔ تو یہ سفر اتنا مشکل کیوں ہو گیا ہے؟ مجھے بار بار پیچھے کی طرف

پھینک رہا ہے۔ میں دو قدم آگے بڑھتی ہوں تو چار قدم پیچھے ہو جاتی ہوں۔ اس گھر کی چوکھٹ پر رک جاتی ہوں، جہاں امی، ابو، زریں آپا ہیں۔ میری زندگی کا ایک لمبا سفر، اتنا لمبا سفر کہ میں چلتے چلتے تھک گئی ہوں۔ راستوں نے پیروں کو آبلوں سے بھر دیا ہے۔ پورے جسم سے لہو بہہ رہا ہے اور میں زخم کھا کر زندہ ہوں کیوں؟ ایسا لگ رہا ہے برسوں سے جاگ رہی ہوں۔ نیند کے لئے ترس رہی ہوں۔ آنکھوں کے سامنے عذاب کا دریا پھیلا ہوا ہے۔ اس دریا کو پار کرنے کے لئے سب سے پہلے اس در سے گزرنا ہوگا۔' زریں آپی نے بھاری بھر کم لحاف کو گھسیٹ کر ہٹا دیا اور بولیں۔

''اٹھو نوشی، امی کئی بار آواز دے چکی ہیں۔''

''ارے آپی پلیز سونے دیں۔''

''پتہ ہے۔ دس بج رہے ہیں۔''

''اوہ آپی۔'' انہوں نے دوبارہ لحاف میرے اوپر سے کھینچ لیا۔ میں اٹھ کر آنکھیں ملتی ہوئی سیدھی باورچی خانے کی طرف گئی جہاں سے امی کی آوازیں برابر آ رہی تھیں۔ میری شکل دیکھ کر وہ بولیں۔

''دن کے بارہ بجے سو کر اٹھی ہے نواب زادی گھر کا سارا کام پڑا ہے۔''

''امی...... کم از کم چھٹی کے دن تو جی بھر کے سو لینے دیا کریں۔''

''سارا دن نحوست سوار رہتی ہے۔'' انہوں نے غصے سے کہا۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ سارا کام میرے انتظار میں پڑا تھا۔ زریں آپی تو تخت پر بیٹھی مشین چلائے جا رہی تھیں۔ امی تنگ تھیں میرے سونے سے۔ اس لئے امی نے کہہ دیا تھا۔

''چھٹی کے دن تم سارا کام کرو نوشی۔''

''امی...... میں؟''

''ہاں تم۔''

''کیوں؟''

''اس لئے کہ سارا دن تم پڑی سوتی ہو۔ یا رسالے پڑھتی ہو اور زریں مشین چھوڑ کر اٹھتی ہے تو حرج ہوتا ہے۔'' میں نے زریں آپی کی طرف دیکھا جو شرارت سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ میں نے بہت خوشامدانہ انداز میں ان کی طرف دیکھا تو انہوں نے گردن انکار میں ہلا دی۔ سارا سارا دن

زریں آپی مشین پر جھکی رہتیں ۔ ہمارے گھر کا بوجھ زریں آپی پر تھا ۔ سلائی کر کے وہ وقت کی گاڑی کو دس سال سے کھینچ رہی تھیں ۔ سب سے بڑی ہونے کے ناطے ان پر یہ ذمہ داری دعا ئد ہوگئی تھی یا شاید وقت اور حالات نے انہیں پابند کر دیا تھا ۔ ہم صرف تین بہنیں تھیں ۔ ہمارا کوئی بھائی نہیں تھا ۔ ابا کو دل کی تکلیف تھی ۔ ویسے بھی وہ اب ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر تھے ۔ امی کی آنکھیں وقت سے پہلے ہی جواب دے چکی تھیں ۔ سب سے چھوٹی گڈو ابھی چھٹی کلاس میں تھی اور میں ان دنوں انٹر میں تھی ۔ جہاں زندگی کو دکھوں میں گھرے ہوئے پایا، وہاں آنکھ کھولتے ہی یہ بھی سنا میں شکیب کی مانگ ہوں ۔ پہلے تو کوئی احساس ہی نہ تھا ۔ ہر وقت ان کے ساتھ ہنستے بولتے وقت گزر گیا ۔ وہ مجھ سے دس سال بڑے تھے اور زریں آپی سے ایک سال چھوٹے ۔ پہلی بار خالہ پروین زریں کے بجائے میرے لئے کوئی رشتہ لے آئیں تو امی سے کہتے سنا ۔

’’خالہ ہمارے یہاں خاندان سے باہر شادی نہیں کرتے ۔ ویسے بھی نوشی تو شکیب کو دی جائے گی ۔ اس کا تایازاد ہے ۔‘‘

’’منہ دھو رکھے ۔‘‘ میں نے زریں آپی کے سامنے قینچی بجاتے ہوئے کہا ۔ زریں آپی نے بہت معنی خیز مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا تو میں نے غصے سے قینچی رکھتے ہوئے کہا ۔

’’ہاں ٹھیک کہہ رہی ہوں ۔ مجھ سے دس سال بڑے ہیں ۔ کر دیں ناں آپی سے ۔ کیا حرج ہے ۔ آپی صرف ایک سال تو ان سے بڑی ہیں ۔‘‘ اور میں یہ کہتے ہوئے اٹھ گئی وہاں سے ۔

’’بائی گاڈ آپی، میں تو اپنی سہیلیوں کے سامنے اپنا کزن بھی نہیں بتلاتی ۔‘‘

’’نوشین ۔‘‘ زریں آپی نے گھور کر دیکھا ۔ تو میں جلدی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی ۔ امی خالہ سے شکیب کے قصیدے گنوا رہی تھیں حالانکہ وہ صرف ایک موٹر مکینک تھا ۔ تایا کے انتقال کے بعد شکیب اور بڑی اماں ہمارے ساتھ رہ رہے تھے ۔ پھر ایک دن بڑی اماں اس مصیبت کو امی اور ابا کے سپرد کر کے خود سپرد خاک ہوگئیں اور اس دن سے لگ گیا ٹھپہ کہ نوشین، شکیب کی مانگ ہے ۔ میں شکیب سے جتنی الرجک تھی، اتنا ہی شکیب مجھے تنگ کرتا ۔ میں کالج سے آرہی ہوتی تو وہ گیٹ پر ٹہل جاتا میں چاروں طرف دیکھتی، کوئی دیکھ تو نہیں رہا ۔ پھر خاموش ہو کر بیٹھ جاتی ۔

’’آپ سے کس نے کہا تھا کہ آپ زحمت کریں ۔ میں آجاتی خود ہی ۔‘‘ میں نے اپنے ماتھے سے پسینہ

پونچھتے ہوئے کہا ۔

’’امی نے آٹا گوندھ کر رکھ دیا ہوگا ۔ میں نے سوچا تمہیں جلدی سے لیتا چلوں ۔ ویسے بھی نوشین، تمہارے کالج سے گزرو تو چاروں طرف سے کھانے کی مہک خالی پیٹ کو جلا کر رکھ دیتی ہے ۔ تم ہو کہ نکلنے کا نام ہی نہیں لیتیں اور میں دھوپ میں جلتا رہتا ہوں ۔‘‘

’’تو کس نے کہا محترم آپ اس شدید دھوپ میں زحمت کریں؟‘‘

’’دل نے ۔‘‘ اس نے اپنے سر کو جھکا کر سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا ۔ تو سامنے سے آتے ہوئے ٹرک سے موٹر بائیک ٹکراتے ٹکراتے بچی ۔ شکیب نے گھبرا کر دوسری طرف موڑ کر بریک لگایا ۔

’’سوری نوشی ۔‘‘ میں نے یوں گھور کر دیکھا جیسے سارا قصور اسی کا تھا ۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے سامنے زریں آپی کو روٹیاں بناتے دیکھ کر کہا ۔

’’ارے بھئی، تھوڑا انتظار کر لیا ہوتا ۔‘‘

’’گڈو بے چاری بھوکی ہے ۔‘‘ زریں آپی توے پر روٹی ڈالتے ہوئے بولیں ۔ تو آج پتہ چلا کہ اس محاذ میں پیش پیش شکیب تھا ۔ میں نے فاتحانہ انداز میں شکیب کی طرف دیکھتے ہوئے فائل میز پر زور سے پٹخ دی ۔ اس نے مسکرا کر دیکھا اور کہا ۔

’’ٹھیک ہے، آج نہیں تو کل سہی ۔‘‘ شکیب ہر وقت اپنے بڑے ہونے کا حق جتاتا ۔ امی نے اسے سر پر بٹھا رکھا تھا ۔ زریں آپی اس کا ہر حکم بجا لاتی تھیں ۔ گڈو شکیب بھائی، شکیب بھائی کہتے نہ تھکتی تھی ۔ بس ایک میں تھی جو شکیب سے جلی بھنی رہتی تھی لیکن وہ چکنی مٹی کا تھا ۔ یوں بھی زریں آپی کے برابر ہی وہ ہمارے گھر کا بوجھ سنبھالے ہوئے تھا ۔ وہ خود ہی ضرورت کی چیزیں لے آتا اور اسی طرح گھر کی طرف خاصی توجہ دیتا تھا میں زیادہ سے زیادہ گھر سے فرار حاصل کرتی رہتی تھی ۔ کالج سے گھر آ کر مجھے گھر کے کام کرنے کے لئے اگر امی کہتیں تو میں کوئی نیا بہانہ تلاش کر لیتی ۔ زریں آپی کہتیں ۔

’’میں روز کی کل کل سے تنگ آگئی ہوں ۔‘‘ وہ خود ہی مشین روک کر میرے حصے کا کام کر ڈالتی تھیں اور میں آپی کے گلے میں بانہیں ڈال کر ان کی پیشانی چوم لیتی تھی ۔ نازک سی آپی ہر وقت شکیب کی طرف سے میرا دل صاف کرتی رہتی تھیں ۔

’’دیکھو نوشی، شکیب تمہاری بہتری کے لئے کہتے ہیں ۔ کالج سے آ کر تم جو سیکھو گی وہ تمہارے کام آئے

گا۔ وہ ہمارے دشمن نہیں ہیں۔''

''تو دوست بھی نہیں ہیں۔''

''تم بہت غلط سمجھتی ہو نوشی۔''

''آپی پلیز..... چھوڑیئے اس ٹاپک کو۔''

''اچھا چلو جاؤ بھاگو۔ میں شام سے پہلے پہلے یہ کام ختم کر دوں گی۔'' یوں لگتا تھا، آپی کو شکیب کی ہر بات اچھی لگتی تھی اور یہی حال خود شکیب کا تھا۔ ہر معاملہ میں امی اور زریں آپی کو اہمیت دیتا۔ ٹیبل ٹینس کی خالی ٹیبل ہم دونوں کے انتظار میں تھی۔ فریال اپنے ڈیڈی اور ممی کی خوبصورت باتیں کر رہی تھی اور اسمارٹ کزن کی تعریف وہ اس دلکش انداز میں کر رہی تھی کہ سامنے لگتا وہ کھڑا ہے۔ میرا دل چاہا میں بھی کسی کزن کا ذکر کروں مگر شکیب کا دھواں پھینکتا اسکوٹر یاد آ گیا۔ دل جل کر خاک ہو چکا تھا۔ فریال کی باتیں میں بہت دلچسپی سے سن رہی تھی۔ وہ داستانِ محبت جو فریال اور وقاص کے درمیان تھی۔ میں چونکی جب فریال نے کہا۔

''اور تم سناؤ نوشی، کوئی تو ہوگا جو تم پر مرتا ہوگا؟'' میں بہت زور سے ہنسی۔

''ارے..... کس کس کا بتاؤں؟ یہاں تو لائن لگی ہے۔''

''اوہ..... مائی گاڈ تم تو چھپی رستم نکلیں۔ یار کچھ تو ہمیں بھی بتاؤ۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی ہمیں گھنٹی کی آواز پر کلاس روم کی طرف جانا پڑا۔ جہاں مسز شان ہم سے پہلے موجود تھیں۔ ہم نے نظریں نیچی کر لیں اور آخری رو میں بیٹھ گئے۔ تمام پیریڈ وہ لیکچر دیتی رہیں اور میں کسی حسین کزن کے تصور میں فریال کی طرح کرولا میں بیٹھی ہوئی ہواؤں سے زیادہ تیز اڑتی رہی۔ ہر بار شکیب کا چہرہ ہی راہ میں رکاوٹ بن جاتا کاٹ کر نکل جاتی۔ پتہ نہیں دل میں کیسا احساس جاگ اٹھا تھا۔ کچھ طالبات پریکٹیکل کے لئے رکی ہوئی تھیں لیکن ہمارے گروپ میں سے صرف سحر باقی تھی جس نے چلتے ہوئے کہا تھا۔

''کیا ہوا نوشی، ابھی تک گئیں نہیں؟''

''ہاں آج ڈرائیور نہیں آیا، اسی کا انتظار کر رہی تھی۔'' کچھ دیر بعد میں بس اسٹاپ کی طرف چل پڑی۔ اتفاق سے سحر اسی اسٹاپ پر مل گئی۔ میں نے فوراً کہا۔

''دراصل ابھی میں نے فون کیا تو پتہ چلا کہ گاڑی خراب ہے۔ اس لئے اب بس سے جاؤں گی۔

یوں بھی مما تو رکشہ یا ٹیکسی میں آنا جانا پسند نہیں کرتیں۔ ڈیڈی بھی کہتے ہیں بس بہت سیف ہے۔''

یہ تو میرا معمول تھا۔ آج گاڑی خراب تھی کل میں نے فریال کو بتایا تھا کہ ڈیڈی گاڑی لے گئے۔ ایک دن شکیب آ گیا تو میں نے مہوش اور عدرت کو بتلایا تھا۔

''گاڑی کسی ضروری کام سے ڈیڈی لے گئے ہیں۔ اس لئے انہوں نے ڈرائیور کو بھیجا ہے۔ یہ اسکوٹر اس کو گھر واپسی کے لئے دیا ہے ورنہ بے چارہ اپنے گھر بس سے جاتا ہے۔'' تب فریال نے بتایا تھا۔

''ہاں یہ بہت پرابلم ہے۔ ایک گاڑی میں سو سوار تو نہیں ہو سکتے۔ ڈیڈی نے کرولا ہم سب کے لئے الگ کر دی ہے۔ کل ممی اپنی کسی دوست کے گھر لے کر چلی گئیں تو چھوٹی آپا اپنی دوست کے گھر پارٹی میں نہیں جا سکیں۔ یار، بالکل مزہ نہیں آتا رکشہ اور ٹیکسی میں۔ میں خود آج کل ڈرائیونگ سیکھ رہی ہوں جیسے ہی آئی اور بس ڈیڈی سے اس برتھ ڈے پر گفٹ لوں گی۔'' فریال کو سحر نے بڑی حسرت سے دیکھا اور مسکرا کر کہا۔

''چھوڑو بھئی، یہ گاڑیوں کے قصے، ہم تو یہاں یہ دعا کر رہے ہیں کہ اے خدا ہماری ویگن اور بس کو اگلے راؤنڈ اباؤٹ تک جانے کی اجازت مل جائے تو ہمارا مسئلہ حل ہو جائے۔'' میں نے حیرت سے سحر کی طرف دیکھا۔ کس سچائی سے وہ اپنا ذاتی مسئلہ بتا رہی تھی۔ میری اس حیرت پر اس نے کہا۔

''واقعی نوشی، گرمی میں تو بس یہ حال ہوتا ہے کہ گھر جا کر لمبی تان کر پڑ جاؤ۔ شام کو ڈھنگ سے پڑھائی بھی نہیں ہو سکتی۔ سارا کام پڑا ہوتا ہے اور امی بے چاری کرتی رہتی ہیں۔ میں پڑھائی چھوڑ کر نمٹاتی ہوں اور پھر رات کو اسٹڈی کرتی ہوں۔'' اس نے ہم دونوں کی طرف بہت بے چارگی سے دیکھا اور پھر کہا۔

''دیکھو نا امتحان قریب ہیں اور ابھی تک ریوائس نہیں کر سکی۔ مجھے ہر حال میں اچھے نمبر لانے ہیں۔ تم لوگوں کا کیا ہے، صورت شکل تو اللہ نے دی ہی ہے۔ اوپر سے دولت، عیش ہی عیش۔ خدا ہر سامنے والے کا اسی طرح بھلا کرے۔ میں تو چلی ورنہ بس نکل جائے گی۔'' میں سحر کو جاتے دیکھتی رہی۔

''بے چاری!'' فریال نے سحر کے لئے کہا تو میں چونک گئی۔ کل اسے پتہ چل گیا تو یہ مجھے ہمدردی سے کہے گی۔ ''بے چاری'' یہ سوچ کر میں نے فریال سے خدا حافظ کہا۔

''اچھا فریال، میں لائبریری جا رہی ہوں۔ آج ڈرائیور دیر سے آئے گا۔'' اور میں چلی آئی اس وقت

تک کے لئے جب تک فریال چلی نہ جائے۔ زندگی تھی کہ اپنی ڈگر پر رواں دواں تھی۔ ہم ان لوگوں
میں سے تھے جن کی زندگی تھم جاتی ہے۔ اس کے برعکس ہر روز فریال سے نئے قصے، نئی باتیں
ہوتیں۔ زندگی تھی یا ہنگامے۔ اپنی بدنصیبی پر رونا آتا۔ فریال سے میں بے حد متاثر تھی اور فریال
میرے حسن کی دیوانی۔ ہم دونوں کی ضرورت تھی سحر جو ہمیں نوٹس اتار کر دیتی رہتی۔ بالکل بچوں کی
طرح وہ ہماری پڑھائی میں مدد کرتی۔ پھر ایک دن میں نے ضد کر کے فریال کی برتھ ڈے پر امی اور ابا
سے اجازت لے ہی لی۔ جانے کا مسئلہ خود شکیب نے حل کر دیا۔

''میں تمہیں شام کو ڈراپ کر دوں گا۔'' میں نے بھی غنیمت جانا اور چپ کر گئی۔ فریال تو مجھے دیکھ کر
مجھ سے لپٹ گئی۔ کالج سے صرف میں ہی شریک تھی۔ اس کے گھر کے اندر ہی سارا انتظام تھا۔ رات
کو دن کا سماں تھا۔ نیلی نیلی روشنی میں میوزک پر رقص کرتے اس کے کزن۔ فریال خوشی سے میرا ہاتھ
تھامے ہر ایک سے ملا رہی تھی۔ میں اس ماحول میں آ کر بالکل خوفزدہ نہیں تھی۔ میں نے زندگی میں
اتنے خواب فریال کی باتوں سے اکٹھے کر لئے تھے کہ میں نے خود کو اس اجنبی ماحول میں ایڈجسٹ
کر لیا تھا۔ میری چال میں تمکنت میرے حسن کو اور بھی حسین بنا رہی تھی۔ میں نے اس دن لائٹ
پنک کلر کی شلوار قمیض پہنی تھی۔ اسی سے میچ کر کے ہلکی لپ اسٹک لگائی تھی تو میرا گلابی رنگ سیاہ
گھنگھریالے بالوں کے درمیان کھل اٹھا تھا۔ اس خوبصورت اسٹائل پر تو فریال عاشق تھی۔ اس دن
بھی میرے بالوں کو دیکھ کر کہا۔

''نوشی تمہارے بال تمہارے حسن کو دوبالا کر رہے ہیں۔''

''شکریہ فریال۔'' میں نے مسکرا کر دیکھا تو اپنے چہرے پر گرم گرم نگاہوں کا احساس ہوا۔ مجھے وہ
ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔ میری نظریں محسوس کر کے خود ہی جھک گئی تھیں۔ دیکھنے والا قریب ہی چلا آیا
تھا۔

''ہیلو..... فریال۔'' اس نے دیکھا مجھے اور کہا فریال سے تھا۔ پہلی بار میں اس طرح کسی کے سامنے
تھی۔ پھر فریال نے خود تعارف کرایا۔

''عثمان بھائی، یہ ہیں نوشی اور نوشی ...... یہ ہیں ہمارے کزن عثمان علی۔'' تو میں نے پہلی بار نظریں
اٹھائیں۔ پتہ نہیں کیا تھا، خود بخود نگاہیں جھک گئی تھیں۔ صرف اس کی ایک مسکراہٹ نے میری

پیشانی کو بھگو دیا تھا۔ وہ جہاں بھی تھا، مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں چند خواتین کی آڑ میں ہو گئی تو بھی وہ مجھے
دیکھ رہا تھا۔ فریال مجھے اپنی کزن ثانیہ کے حوالے کر کے لان کے دوسرے سرے پر چلی گئی۔ وہ
میرے تعاقب میں تھا۔ یہاں بھی وہ پہنچ گیا اور لگا ثانیہ سے باتیں کرنے۔

''ثانی جی، تم نے کبھی آئینہ دیکھا۔ آج گھر جا کر نظر اتار لیجئے گا ورنہ۔''

''ورنہ کیا عثمان بھائی؟'' اس نے پوچھا تو اس نے مسکرا کر میری طرف اشارہ کر دیا۔

''اوہ آئی سی...... تو یہ چکر ہے عثمان بھائی۔ کب سے ہے یہ دیوانگی؟''

''برسوں سے شناسائی ہے۔'' میں یہ سب سن کر شرم سے گھبرا گئی۔ میں نے پہلی بار ایسے جملے سنے
تھے۔ پھر مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ میں یہ سب سن کر شرما گئی تھی۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی نو
بجنے والے تھے۔ پھر چاروں طرف دیکھا تو فریال نظر آ گئی۔ میں نے غنیمت سمجھا اور ثانی سے کہا۔

''تم ذرا فریال کو بلا نا میرا ڈرائیور آ گیا ہے۔'' اور بغیر اس کو دیکھے، بغیر فریال کو ملے تیز قدم اٹھاتی
گیٹ سے باہر نکل آئی۔ شکیب وقت کا بہت پابند تھا۔ وہ ٹھیک نو بجے آ گیا تھا۔ میں نو بج کر دس منٹ
پر نکلی تھی۔ موٹر سائیکل اسٹارٹ ہوئی اور میں چلی آئی۔ آ کر میں نے اپنا چہرہ آئینے میں دیکھا۔ بار بار
اس کے جملے سماعت کو چھو رہے تھے۔

''آج گھر جا کر نظر اتار لیجئے گا۔'' اس جملے میں دل کی دھڑکنیں ہم آہنگ ہو گئی تھیں۔ میں نے آئینے
میں اس پیکر کو جھانکتے ہوئے دیکھا۔ کتنے افسانے ایک نظر سے جاگ اٹھے تھے۔ میں بار بار آپی کے
سامنے سے گزر رہی تھی کہ وہ تعریف کریں مگر انہیں کہاں فرصت تھی۔ وہ تو رات کو بھی سوئی دھاگے
سے بٹن ٹانک رہی تھیں۔ اماں شکیب کے لئے کھانا گرم کر رہی تھیں۔ اس کے تصور میں شب بیت
گئی۔ آج میں چاہ رہی تھی، فریال صرف اس کی بات کرے، اس کے قصے سنائے لیکن فریال تھی کہ
وقاص کے قصے لے کر بیٹھ گئی تھی۔ جو ابھی حال ہی میں فارن سے پلٹ کر آیا تھا اور فریال کی چاہت
میں گم تھا۔

''ہائے نوشی...... میں تو بھول ہی گئی۔ پتہ ہے وہ اپنے عثمان بھائی ہیں ناں انہوں نے تمہیں بہت
لائیک کیا ہے؟'' میں مسکرا دی۔

''ہاں، ہیں بھی اسمارٹ اور گریس فل۔'' میں نے بے دھیانی میں کہہ دیا۔

''وَنڈر فل، عثمان بھائی تو یہ لفظ سن کر پاگل ہو جائیں گے نوشی۔''

''اچھے خاصے آدمی کو پاگل مت بنا فریال۔'' میں نے ہنس کر کہا اور پھر وہ اپنے قصے سناتی رہی۔ ہر روز فریال کوئی نہ کوئی ایسا جملہ عثمان کے بارے میں لے کر آتی کہ میں سارا سارا دن اس کے تصور میں گم رہتی۔ سحر نے میری حالت جان لی تھی۔

''میں سچ کہتی ہوں نوشی، تم ان چکروں سے باہر نکل آؤ۔ فائنل ایگزیم سر پر ہیں اور تم پر عشق کا بھوت سوار ہے۔'' پھر ایک دن فریال، عثمان کا پیغام لے کر آ ہی گئی۔

''یار نوشی...... وہ تو تمہارے حسن میں بالکل کام سے چلا گیا ہے۔ ہر روز آ کر میرے گھر بیٹھ جاتا ہے۔ ہر وقت تمہاری باتیں کرتا ہے۔ وقاص، عثمان کو بالکل لائیک نہیں کرتا۔ پلیز تم ایک بار ملو۔ وہ بہت بے قرار ہے۔ نوشی، صرف ایک بار وہ تم کو دیکھنا چاہتا ہے اور تم ہو بھی ایسی چیز جس نے ایک بار دیکھا، دوبارہ دیکھنے کی تمنا کئے گیا۔'' اور وہ پھر ایک دن میرے لئے آ ہی گیا۔ شاید مجھے خود بھی اس کا انتظار تھا۔ ہر دفعہ کالج کے گیٹ سے نکلتے وقت میں اس کو ڈھونڈتی اور آج فریال اس کو لے ہی آئی تھی۔ سحر مجھے بار بار سمجھا رہی تھی۔ ''تم ہرگز مت جانا۔ یہ مرد لوگ بھول بھلیاں ہیں۔ ایک بار ان سے ملو تو گھر کا راستہ پاس سے گزر جاتا ہے لیکن راستہ نہیں ملتا۔'' لیکن فریال اصرار کر رہی تھی۔ وہ اپنی مرسڈیز میں بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ فریال کو میں نے راضی کر لیا تھا۔ وہ ہمارے ساتھ جائے گی۔ پھر وہ مجھے اور فریال کو لے کر پول گیا۔ ہم نے لنچ کیا۔ گھر پہنچنے کا وقت ہو گیا تھا۔ فریال اور عثمان نے مجھے کالج کے گیٹ پر چھوڑ دیا۔ فریال کو بتاتے ہوئے میں نے اسے کہا تھا۔

''ڈیڈی آفس سے آتے وقت مجھے پک کر لیں گے۔''

''پلیز فریال۔'' لیکن وہ تو خود ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اکیلے ہوا میں لہراتے ہوئے ہاتھ کو دیکھتی رہ گئی اور پھر میں نے جلدی سے رکشہ لیا تاکہ میں جلد پہنچ جاؤں۔

گھر میں داخل ہوتے ہی سارا عشق رفو چکر ہو گیا۔ امی باورچی خانے میں تھیں۔ میں دبے قدموں سے آپی والے کمرے میں داخل ہوئی۔ زریں آپی حسب معمول سلائی کر رہی تھیں۔ میں کچھ گھبرائی تھی۔ زریں آپی نے پوچھا۔

''کیا بات ہے نوشی، تم پریشان ہو؟''

''ہاں آپی، راستے میں کچھ ہنگامہ ہو گیا تھا۔ بس رکی رہی اس لئے دیر ہو گئی۔'' میں نے بڑی معقول دلیل دے دی تھی۔ جو فوراً گڈو کے ذریعے امی تک پہنچ گئی۔ ابا بھی اسی ہنگامے کے بارے میں پوچھتے رہے اور میں انہیں تفصیل بتاتی رہی۔ میں اس کی سوبر پرسنالٹی سے بہت متاثر تھی اور وہ میرے حسن سے متاثر تھا۔ اس کی عادت خوبصورت چیزوں کو اکٹھا کرنا تھی۔ مجھے بھی شان و شوکت اور گلیمر پسند تھا۔ میں نے فریال کے روپ میں خود کو اتنی بار دیکھا کہ اب آئینہ بھی جھوٹ بول رہا تھا۔ میرے حسن نے اسے دیوانہ بنا دیا تھا اور میں خود کو اس کے برابر تصور کر رہی تھی۔ کوئی بھی نہیں تھا میری گہری نیلی آنکھوں اور گھنگھریالے سیاہ بالوں جیسا۔ ہر شخص کلاس میں بات کرنا اور دوستی کرنا پسند کرتا اور یہ احساس مجھے اور میرے حسن کو مغرور بنا رہا تھا۔ عثمان نے آج پھر گیٹ پر ڈراپ کیا تھا۔

''او کے سی یو۔'' کہہ کر چلا گیا۔ کالج سے وقت پر گھر واپس آ گئی تھی۔ اس لئے کسی کو احساس نہیں ہوا۔ رات کو دن کے سہانے خواب آنکھوں میں سما رہے تھے۔ نیند کوسوں دور تھی۔

خوابوں میں خواب اس کے، یادوں میں یاد اس کی
نیندوں میں گھل گیا ہو جیسے کہ رتجگا سا

نیم وا دریچوں سے نم ہوائیں پیغام محبت لے کر آ گئی تھیں۔ اس لئے دل میں نگوں کی ٹھنڈک اتر رہی تھی۔ میں نے بھی چپکے سے اس کے نام ہوا میں محبت کا پیغام بھیجا۔

''نوشی......'' اس کی بھاری آواز جلترنگ کی طرح سنائی دیتی۔

''نوشی...... اب ایگزیم قریب ہیں۔ میں تمہیں گھر ڈراپ کر دوں۔'' وہ مستقل رابطہ چاہتا تھا۔ میں سن کر ہی گھبرا گئی۔

''نہیں عثمان۔'' ایسا لگا میں چھوٹے چھوٹے پیس میں تبدیل ہو کر اب ذروں میں تبدیل ہو رہی ہوں۔ یہ کیا...... خواب کی تعبیر اتنی جلدی۔ فریال نے بہت پہلے سے کالج آنا یہ کہہ کر بند کر دیا۔ میں آج کل وقاص کو زیادہ سے زیادہ ٹائم دے رہی ہوں۔ پھر ایک دن وہ سخت غصے میں تھی۔ اپنے ڈیڈی سے شکایت تھی۔ وہ وقاص کو فریال کے قابل نہیں سمجھ رہے تھے۔ اس کی ممی اس کے ساتھ تھیں۔ انہوں نے فریال کو پوری اجازت دے دی تھی وہ کہہ رہی تھی۔

"ڈیڈی کو تو خوانخواہ وقاص سے وحشت ہے۔ بٹ آئی لو ہم۔ ہم ڈیڈی کی مرضی کے بغیر کورٹ میرج کرلیں گے۔ ممی نے کہا ہے بعد میں وہ راضی ہو جائیں گے۔ ورنہ وقاص واپس چلا جائے گا۔ اوکے نوشی اور سحر، گڈ بائی۔ شاید میں ایگزیم نہ دے سکوں۔" میں اور سحر حیرت سے دیکھتے رہ گئے۔ کتنی آسانی سے وہ اتنا اہم فیصلہ سنا کر چلی گئی تھی۔ مجھ سے زیادہ سحر حیرت زدہ تھی۔ وہ روکتی رہی لیکن وہ وقاص کے ساتھ چلی گئی۔ آج پھر عثمان علی نے پرانا سوال کر ڈالا جس کا مجھے ڈر تھا۔

"نوشی..... آخر میں تمہیں گھر پر کیوں نہیں ڈراپ کر سکتا؟"

"وہ عثمان" لفظ اٹک گئے اور میں اس کے کسی سوال کا جواب دیئے بغیر چلی آئی۔ میں اسے گھر کس طرح لے جاتی۔ وہ تو مجھے امیر زادی سمجھ رہا تھا۔ میں نے سارے ڈائیلاگ فریال سے سیکھ رکھے تھے اور جھوٹ بولتے بولتے اتنی عادی ہو گئی تھی کہ کبھی غلطی کا امکان نہیں تھا۔ لیکن اس دن یہ احساس ہوا کہ جھوٹ بولتے ہوئے میں بہت دور آ گئی ہوں۔ سحر نے اپنی کتابیں سمیٹ کر کہا۔

"نوشی..... ! میں روز نوٹس کی تیاری کے لئے آتی تھی۔ پڑھائی تو ہو نہیں رہی۔ وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ؟ اب میں سوچ رہی ہوں۔ گھر میں ہی پڑھائی کروں۔" جب یہ سوال میں نے خود سے کیا تو لڑکھڑا گئی۔

"تو صرف میں کالج آیا کروں گی اور وہ بھی کب تک صرف چند دن۔ اس کے بعد لمبی چھٹیاں اور پھر عثمان۔"

"کیا بات ہے؟" سحر نے میرے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔ سحر نے زندگی کے اتنے بڑے سچ بولے تھے کہ میرے جھوٹ بھی کم تھے اور پھر میں یہ بوجھ نہ برداشت کر سکی۔ اس کے گلے لگ کر رو پڑی۔ الف سے یے تک سب کچھ اسے سنا دیا۔

"راستہ تو تم نے اس دن کھو دیا تھا نوشی، جس دن تم نے کالج کی چہار دیواری سے باہر قدم نکالا تھا۔"

"پلیز سحر..... مجھے کوئی راہ دکھا دو۔ میں نکلنا چاہتی ہوں۔"

"نہیں نوشی، اس ذلت سے نکلنا اتنا آسان نہیں ہے۔"

"تو پھر میں کیا کروں سحر؟ وہ بضد ہے امی اور ابو سے ملنے پر اور یہ ناممکن ہے۔" سحر تھوڑی دیر کے لئے رک کر سوچتی رہی۔ پھر وہ بولی۔

"نوشی..... بالکل اسی طرح الف سے یے تک اس کو بتا دو۔"

"نوشی ڈیئر، مجھے ان باتوں سے کیا لینا۔ میرے پاس خود اتنی دولت ہے۔ تم جیسے مل جاؤ اسے اور کیا چاہیئے، اس کا تو آخری سفر بھی ہنستے ہنستے گزر جائے گا۔" اس نے اس قدر پرعزم لہجے میں کہا۔

"خدا حافظ۔" خوشیوں کا تاج پہنے میں ناچنے لگی۔ مجھے انتظار تھا سحر کا۔ اب وقت آ گیا تھا لیکن سحر نہ آئی۔ شاید میری قسمت میں سحر تھی ہی نہیں اور پھر میں تیار ہو کر کالج کے فنکشن میں آ گئی۔ آج ہمارا آخری دن تھا۔ ہم ایک دوسرے سے بچھڑ جانے کے لئے اکٹھے ہوئے تھے۔ مجھے انتظار تھا سحر کا لیکن سحر کے بجائے فریال فل میک اپ میں چلی آ رہی تھی۔ ہم ہفتوں کے بچھڑے ملے تھے۔ ڈھیروں باتیں کیں۔ اس نے پھر اپنا قصہ چھیڑ دیا تھا۔

"ویسے نوشی ڈیئر یو آر ویری لکی۔" مجھے خود پر رشک آ رہا تھا، اپنی قسمت پر۔

"کیا ڈگنٹی گریس ہے عثمان بھائی میں۔ تمہارے تو عیش ہی عیش ہیں۔ کبھی پیرس، کبھی لندن اور کبھی سوئٹزر لینڈ۔ وہ ہمیشہ ٹور پر ہی رہتے ہیں۔" اس نے مجھے سیریس دیکھا تو کہا۔

"نوشی..... فارگیٹ اٹ۔" اس نے میرا سر اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"میں سحر سے ایک بار ملنا چاہتی تھی۔ پتہ نہیں وہ کیوں نہیں آئی۔" پھر میں نے سحر کے نظریات فریال کو بتا دیئے۔

"اوہ نوشی..... ناٹ سو بگ پرابلم اگر سحر بھی ہوتی ناں تو وہ بھی تمہیں یہی مشورہ دیتی۔ ہاں کبھی اگر امریکہ آنا ہوا تو ملنا ضرور۔ اوکے نوشی۔" اس نے بہت پیار سے میرے ماتھے پر بوسہ دیا۔ جاتے جاتے فریال باہر عثمان سے بھی ٹکرا گئی تھی۔ اس نے اسے بھی اپنے مشورے سے نواز دیا تھا۔ وہ بھی اس کی بات پر اگیری تھا۔ تمام رات میں کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔ وہ رات بہت بھاری تھی۔ سیاہ اور لمبی رات، نہ آسمان پر تارے، نہ چاند۔ میں بار بار اٹھ کر پانی پی رہی تھی۔ خوف سے امی کو دیکھتی کہیں دل کا بھید جان تو نہیں لیا۔ خدایا کہیں نیند میں سب کچھ نہ کہہ ڈالوں۔ اس لئے میں نے اپنا منہ چھپا لیا۔ خوف ہر آن دھڑک رہا تھا۔ اب میں کل کس طرح کالج جاؤں گی۔ کیا بہانہ ہوگا۔ میں عثمان کو کیسے دیکھ سکوں گی۔ امی، ابو اور زریں آپی کبھی عثمان کو پسند نہیں کریں گے۔ وہ فریال کے ڈیڈی

نہیں اور میں عثمان کے بغیر ایک پل کا بھی تصور نہیں کر سکتی تھی صبح کالج ٹائم پر امی نے پوچھا تو میں نے کہا۔

''امی..... مجھے سحر سے نوٹس لینے ہیں۔ وہ آج کالج آئے گی۔'' اور پھر میں وقت پر پہنچ گئی۔ کالج سے دور گاڑی میں بیٹھا وہ میرا انتظار کر رہا تھا۔

''مجھے معلوم تھا تم آؤ گی نوشی۔'' وہ اسی طرف چلا آیا۔

''جذبہ سچا ہو تو انسان خود ہی کھنچا چلا آتا ہے۔'' اس نے میری ڈری ہوئی شکل کی طرف دیکھ کر کہا۔

''نوشی! تم کسی نتیجے پر پہنچی ہو؟''

''نہیں عثمان، مجھے خوف آتا ہے۔ ہم بہت مختلف لوگ ہیں۔ ابا دونوں صورتوں میں نہیں مانیں گے۔ عثمان! کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم لوٹ جائیں۔ اپنی منزلوں پر۔''

''نہیں نوشی۔ اب بہت دیر ہو گئی ہے۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ آئی لو یو نوشی۔'' اس نے اتنی گہری آواز میں کہا کہ میں پھر ڈوب گئی۔ تھوڑا سا ابا کا خوف جو دل میں تھا وہ بہہ گیا میں عثمان کی محبت میں سرشار تھی۔ مجھے کچھ خوف نہیں تھا۔ میری منزل میری دنیا سب کچھ عثمان کی اسی آواز میں تھا۔

''آئی لو یو نوشی..... سوچ۔'' پھر قدم عثمان کے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑے۔ میں اپنی قسمت کے فیصلے پر دستخط کر آئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ عثمان کب اور کیسے مجھے حاصل کرے گا؟ میں نے زندگی کے فیصلے کی ڈور عثمان کو تھما دی تھی اور اب وہ میرا مالک تھا۔ جب اور جس طرح چاہے حاصل کر لے۔ اسے محبت پر پورا یقین تھا۔ ایگزیم کی ڈیٹ تک ہمارا دل ہر لمحے خوف سے لرزتا رہا کب ہوگا، کیسے ہوگا؟ میں بغاوت کیسے کر سکوں گی؟ کمرۂ امتحان میں سحر نظر آ گئی تو میں اس سے لپٹ گئی۔

''بے وفا..... پلٹ کر پوچھا بھی نہیں۔ چلو تم نہ سہی ہمیں فریال نے اپنا محبت کا نسخہ کیسا بتلا دیا۔''

''کیا؟'' ایسا لگا جیسے سحر کو کرنٹ لگ گیا ہو۔

''تو کیا تم نے بھی؟''

''ہاں! میں نے بھی۔''

''نوشی..... یہ تو نے کیا کیا؟ قسمت کے فیصلے یوں سرِ راہ ہونے لگیں تو ہماری مائیں ہمیں کبھی ان

درسگاہوں میں نہ بھیجیں۔ نوشی! تم نے دستخط کر کے پچھتاوے کے علاوہ کچھ نہیں پایا۔'' اس کی آواز حلق میں پھنس گئی۔ میں نے گھبرا کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا تو اس نے چھڑاتے ہوئے کہا۔

''نوشی..... میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ جاؤ اور اپنی ماں کے سر سے چادر سرِ راہ اتار دو۔ اس چادر کو جس پر صرف بنت حوا لکھا ہوا ہے۔ نوشی تمہیں پتہ ہے تم نے کتنی بیٹیوں سے اعتماد چھینا ماؤں کی پرورش کا مذاق اڑایا۔ تم نے نہ صرف گھر کی چار دیواری کو بلکہ اس درسگاہ کی دیواروں کو مسمار کر دیا۔ جاؤ نوشی..... آنسوؤں سے کبھی یہ زخم نہیں دھلتے۔ نوشتۂ تقدیر کا لکھا ہوا تم کیا جانو۔ ارے اپنے خدا سے گھر بیٹھ کر تو مانگا ہوتا۔ وہ تمہیں مایوس نہیں کرتا۔ ہزار راستوں سے تمہیں گزار کر بھی تمہیں دے دیتا لیکن۔'' اس نے پیار سے خدا حافظ کہا اور چلی گئی۔ عثمان سینٹر کے قریب ہی میرا انتظار کر رہا تھا۔

''تم اس قدر پریشان مت ہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں خود.....'' اس نے یہ کہہ کر دیکھا تو میں رو رہی تھی۔

''آنسو پونچھ ڈالو نوشی۔ یہ نمکین پانی زندگی کو مٹھاس نہیں دے سکتا۔ مسکراتے رہنا ہی زندگی ہے۔'' اور میں کر بھی کیا سکتی تھی۔ میں نے آنکھیں صاف کیں اور گاڑی کو دور چھوڑ کر آ گئی۔ آنکھیں ابھی تک لال تھیں۔ امی گھبرا گئیں۔

''کیا ہوا؟ پرچہ کیسا کیا بیٹا؟'' وہ میرے ماتھے کا پسینہ اپنے دوپٹے سے پونچھ رہی تھیں تو پتہ نہیں کیوں میں بے ساختہ ان کے آنچل سے لپٹ کر رو پڑی۔ سب حیران تھے۔ زریں آپی نے کہا۔

''چلو کیا فرق پڑتا ہے اگر ایک پرچہ اچھا نہ ہوا۔'' آج پھر وقت نے سب کے سامنے میری لاج رکھ لی تھی۔ کتاب کھولتی تو لفظ دھندلا جاتے۔ بڑی مشکل سے تیسرا پرچہ دے کر گھر آ گئی۔ عجیب سے ہول اٹھ رہے تھے۔ میں ادھر سے ادھر دیوانوں کی طرح گھومتی رہی تھی۔ کسی چیز میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ ایک لفظ نہ پڑھ سکی۔ سامنے کتاب کھلی تھی اور اس پر عثمان، کبھی سحر، کبھی ابا نظر آ رہے تھے۔ شام قریب پانچ بجے خالہ پڑوسن پھر آ گئی تھیں۔

''سچ کہہ رہی ہوں زریں کی ماں، اس بار ہاں کر ہی دو۔ لڑکا ڈاکٹر ہے اور کیا حسن دیا ہے اسے خدا نے۔ تمہاری نوشی بیٹیا کو کہیں گھر سے باہر دیکھ لیا۔ اس کی ماں کئی روز سے میرے گھر کے چکر لگا رہی ہے۔''

"خالہ...... میں نے بتایا تو ہے کہ ہمارے خاندان میں باہر نہیں دیتے۔" امی نے کہا تو شکیب بول پڑا۔

"امی...... کسی نہ کسی کو تو پہل کرنی ہوگی اور ہے بھی ہماری نوشی اس قابل۔ ان روایتوں کے پیچھے کب تک بھاگتے رہیں گے؟"

"آپ کا کیا خیال ہے؟" اس نے ابا سے سوال کر ڈالا۔

"لیکن بیٹا، وہ نوشی تو......" امی نے ابھی پورا جملہ بھی ادا نہیں کیا تھا۔

"ارے چھوڑیئے امی...... میں نے تو کبھی نوشی کو اس نظر سے نہیں دیکھا۔ اسے ہمیشہ میں نے چھوٹی بہن کی طرح چاہا ہے۔"

"اللہ تمہیں سدا خوش رکھے۔" خالہ خوش ہو کر بول پڑیں۔

"لیکن بیٹا شکیب، میں نے تو ہمیشہ یہی چاہا اور سمجھا۔"

"ارے چچی امی...... میں تو شروع سے ہی زریں کو......" آپی گھبرا کر شرما کر مجھ سے ٹکرا گئیں۔

"شکیب بھائی، اتنا بڑا سچ۔" میں نے کتاب مضبوطی سے پکڑ کر سینے سے لگا لی۔ خاموشی اماں اور ابا کی رضامندی تھی۔

معلوم نہیں...... اسی وقت میں سو رہی تھی یا جاگ رہی تھی بس اتنا یاد تھا میں چیخ پڑی تھی۔

"شکیب بھائی گریٹ شکیب بھائی۔" اور پھر میں نے کتاب سے نکال کر وہ قسمت کا پروانہ تھما دیا۔ جو بیس دن سے مجھ پر بہت بھاری تھا۔ جس کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے تھک گئی تھی۔ شکیب بالکل سحر کے انداز میں بولا۔

"یہ کیا کیا نوشی...... بولو، جواب دو۔ کیا ہم اس قابل نہیں تھے کہ تمہاری قسمت کا فیصلہ کرتے؟" سب کو معلوم ہو گیا تھا۔ ایک پل میں گھر کی خوشیاں چھن گئی تھیں۔ امی بیڈ پر گر پڑیں۔ زریں آپی رو رو کر مجھے برا بھلا کہہ رہی تھیں۔ ابا دل تھامے بیٹھے تھے اور میں گناہ گار مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑی تھی۔

"شکیب بھائی، پلیز شکیب بھائی، مجھے اس اذیت سے نجات دلا دو میں زندہ نہ رہ سکوں گی۔ پلیز شکیب بھائی۔" میں نے ان کے پاؤں پکڑ لیے۔ میں نے دل تھامتے ہوئے باپ کو دیکھا تو محبت کی نسبت عزت کا پلڑا بھاری تھا۔ میں موت کے سناٹے میں دفن ہو گئی تھی۔ تمام رات روتے گزر گئی۔

سحر کے الفاظ کانوں میں گونج رہے تھے۔ تم نے کتنی بیٹیوں کا ماؤں سے اعتماد چھینا ہے۔ لوگ ہم پر اعتماد نہیں کریں گے۔ شکیب بھائی راضی ہو گئے تھے کہ وہ کسی طور مجھے آزاد کرالیں گے لیکن وہ بڑے اداس سے شام کو گھر واپس آ گئے۔ میرا سوالیہ چہرہ دیکھ کر بولے۔

"نوشی...... جس کاغذ پر تم دستخط کر کے آئی ہو، وہ اتنا معمولی نہیں ہے اور ہماری بساط بھی نہیں عثمان سے ٹکرانے کی۔ اس نے دھمکی دی ہے اور کہا ہے نوشی اس کی منکوحہ ہے۔ اگر وہ اس کے حوالے نہ کی گئی تو وہ قانونی چارہ جوئی کرے گا۔ نوشی، تمہارا سفر غربت سے امارت کی طرف ہے اور ہم اس کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اس لئے چچا کا بھی یہ فیصلہ ہے کہ تمہیں جانا ہوگا۔ کل تک ہم تمہارے شریک غم تھے لیکن آج نہیں نوشی۔ کل میں نے عثمان کو بلایا ہے اور تمہیں جانا ہے۔ نوشی، اسی میں ہماری عزت ہے۔"

"نہیں شکیب بھائی، نہیں۔ مجھے بچا لو۔ میں نہیں جاؤں گی۔ مجھے اس کا انجام نہیں معلوم تھا۔" امی دوپٹہ لپیٹے لیٹی تھیں۔ ابا کل سے لے کر آج تک مسجد میں تھے۔ زریں آپی کی مشین اور تخت ویران پڑا تھا۔ گڈو سہمی ہوئی کونے میں بیٹھی تھی۔ شکیب بھائی کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ ان کی سرخ آنکھیں دیکھی نہیں جا رہی تھیں۔ ہارن کی آواز پر دل کی دھڑکن تھم گئی۔ یہ تو عثمان کی گاڑی کا ہارن تھا۔ شکیب بھائی مجھے خود سے لپٹائے کھڑے تھے۔

"نوشی...... میں نے بہت کوشش کی وہ تمہیں دنیا والوں کے سامنے عزت بنا کر لے جائیں لیکن وہ یہ سب نہیں جانتے اور نہ ہی ان کے پاس وقت ہے یا پھر وہ عزت کا مفہوم نہیں جانتے۔" انہوں نے مجھے خود سے الگ کر کے کہا۔

"چلو نوشی......" میں بے اختیار امی کے قدموں سے لپٹ گئی۔

"پیاری امی...... مجھے چھپا لو نا۔ میں نہیں جاؤں گی امی۔" لیکن امی نے پیر ہٹا لئے اور کہا۔

"جانے سے پہلے نوشی، صرف اتنا بتاتی جاؤ۔ میں نے کون سی تمہاری تربیت میں کسر چھوڑی تھی جو تم اعتماد کو توڑ کر جا رہی ہو؟"

"امی......" میں کیا جواب دیتی۔ شکیب بھائی نے مجھے سنبھالا۔ یہ کیسی دلہن تھی جس کی مانگ میں افشاں نہیں تھی۔ پھولوں کے گہنوں سے بے نیاز جا رہی تھی۔ ماں اور سہیلیوں کی دعاؤں سے محروم

میں عثمان کے ساتھ عثمان ولا میں جب اتری تو رات کی سیاہی پھیل چکی تھی۔

''عثمان..... تم نے شکیب بھائی کی بہت انسلٹ کی ہے۔''

''ڈیئر پیچھے پلٹ کر مت دیکھو۔ صرف میری طرف دیکھتی رہو۔'' اس نے خوبصورت پرندوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''سب امپورٹڈ ہیں۔ ہر ملک کا خوبصورت پرندہ میرے پاس ہے۔ میری سب سے بڑی کمزوری حسن ہے۔ میرا مقصد صرف تمہیں پالینا تھا۔ میرے قلب شجر پر کھلنے والی پہلی کلی تم ہو نوشی۔ میں ساری دنیا سے ٹکرا سکتا ہوں۔ میری محبت میری میراث ہے۔ میں اس حسن کو اجنبی نہیں بننے دوں گا۔ تم دیکھو، یہ بے زبان پرندے میری آواز پر کتنے مانوس ہیں حالانکہ میں ان سے اکثر دور رہتا ہوں لیکن پھر بھی یہ مانوس ہیں۔ بالکل اسی طرح تم سب کو بھول کر میری رہو گی۔ یہ میرا ایمان محبت ہے ڈیئر۔'' عثمان نے اتنی خوشیاں دیں کہ میں سمیٹ نہ سکی۔ وہ ہر وقت مجھے ساتھ رکھتا۔ ساری ندامت ختم ہو گئی تھی، اپنے فیصلے کا پچھتاوا نہیں تھا۔ عثمان نے مجھے اپنی محبت میں اس قدر جکڑ رکھا تھا کہ ایک پل کو بھی اس نے مجھے تنہا نہیں چھوڑا جو کبھی امی، ابا سے مل آتی۔ ویسے بھی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ وہ مجھے ہر پارٹی میں ساتھ رکھتا۔ اس نے سب قریبی دوستوں سے مجھے ملوایا۔ میں نے عثمان سے ایک نام کافی سن رکھا تھا ایک مانوس سا چہرہ حیدر بھائی۔ پھر وہ مجھے ہر ایک سے روشناس کرا کے اس عثمان ولا کو میرے حوالے کر کے بزنس کے سلسلے میں انگلینڈ جانے کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ حیدر بھائی ساتھ ساتھ تھے۔

''میں بہت جلد آنے کی کوشش کروں گا اور اگر نہ آسکا تو تم خود آجاؤ گی۔ عثمان علی تمہارے بغیر بہت اداس رہے گا نوشی۔'' اور پھر عثمان چلا گیا۔ میں سارا دن تنہا بیٹھی رہتی۔ بس ہر وقت یہی دل چاہتا کسی طرح امی اور ابا سے ایک بار معافی مانگ لوں۔ آپی اور گڈو کو ایک نظر دیکھ لوں لیکن پشیمانی روک دیتی۔

''نوشی.....'' میں چونک گئی کراچی ایئرپورٹ پر جہاز لینڈنگ اپروچ بنا رہا تھا۔ اگر عثمان مجھے نہ بتاتا تو شاید مجھے پتہ بھی نہ چلتا میں بہت بڑے دریا کو عبور کر کے آرہی تھی۔ حیدر بھائی ہمارے ساتھ ہی تھے۔ جہاں سے چلی تھی وہیں پر آ کر یہ موڑ رک گیا تھا۔

عثمان ولا کی ہر چیز جگمگا رہی تھی لیکن میں اندر سے ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ میری شریانوں میں زنگ لگ

گیا تھا۔ اندر سے کھوکھلی ہو گئی تھی۔ یہ کون سی منزل تھی جو ہواؤں میں بغیر ستون کے کھڑی تھی۔ میری طرح۔ پر رونق عثمان ولا کی خوبصورت چیزوں میں میرا اضافہ ہو گیا تھا۔ باوجود احساس دلانے کے مجھے عثمان پر یقین نہیں تھا۔ ساری محبتیں اور خواب آنکھوں سے دور کسی ویرانے میں جا کر سو گئے تھے۔ صرف میں خالی وجود لئے زندہ تھی۔ وقت کا سب سے بڑا سچ بولنے کی تمنا جاگ اٹھی تھی۔ اسی لئے ایک اور بڑا جھوٹ۔ میں عثمان علی کے سہارے زندہ تھی۔ تمام شامیں وہی تھیں۔ زندگی میں کوئی بھی فرق نہیں آیا تھا۔ اب میں زیادہ سے زیادہ حیدر بھائی اور عثمان کے قریب تھی۔ ہر بات میں شریک تھی۔ وہ لوگ جب سے آئے تھے۔ واپسی کی تیاری میں لگے تھے۔ مجھے ہر پل کی خبر تھی۔ اس بار پھر عثمان سوئٹزرلینڈ کی تیاریوں میں تھا اور کچھ ہی دنوں بعد میں حیدر بھائی کے ساتھ چلی جاتی۔ وقت بہت قریب آگیا تھا۔ تیاری مکمل تھی۔ عثمان کتنی دیر تک مجھ سے ہمارے ماضی کی باتیں کرتا رہا۔ میرا خوف سے سرد پڑ جانا، کبھی گھر کے خوف سے رو پڑنا۔ مجھے عثمان سے پتہ چلا تھا کہ فریال امریکہ سے واپس آگئی ہے۔ اس نے وقاص سے علیحدگی اختیار کر لی ہے اور اب اپنے والدین کے ساتھ رہ رہی ہے۔ مجھے بہت دکھ ہوا یہ جان کر کہ وہ کچھ دن مینٹل ہاسپٹل میں رہ کر آئی ہے۔ دکھ کے سوا اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ میں جو کچھ ہوں یہاں تک مجھے فریال لائی تھی۔ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہے۔ عثمان کی تیاریاں تقریباً مکمل تھیں۔ تمام حفاظتی انتظامات کر لئے گئے تھے۔ حیدر بھائی بہت محتاط تھے۔ وقت اور دن کا تعین نہیں ہوا تھا۔ شاید انہیں کسی کی طرف سے خطرہ تھا اور پھر ایک دن عثمان نے کہا۔

''نوشی ...... ہمارے بزنس کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی جانا پڑتا ہے۔ تم میرے جانے کے بعد کچھ ہی دنوں میں وہاں آجاؤ گی۔ او کے.....''

''عثمان میرا دل چاہ رہا ہے کہ تم نہ جاؤ۔''

''نہیں نوشی...... تمہیں جانے کی نوعیت معلوم ہے اور ہمیں آج رات کی فلائٹ سے جانا ہے۔'' آج دل بہت اداس تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ میں عثمان سے محبت کرتی تھی۔ ورنہ اسے یوں نہ روکتی۔ عثمان مجبور تھا اور میں بھی بے آس، زندگی کے مہرے حیدر بھائی کے ہاتھ میں تھے۔ عثمان کو اس راہ پر لانے والے حیدر بھائی تھے اور عثمان آنکھ بند کر کے اس آگ میں کود پڑا تھا۔ دوسری طرف بہت کی دھوپ

میں میرا وجود جل گیا تھا۔ عثمان کی محبت نے مجھے زندگی دی تھی لیکن میری محبت عثمان کو واپس نہ لا سکی۔
جس وقت عثمان جانے کے لئے ڈریس اپ ہو کر آیا تو میری آنکھیں بھر آئیں۔ دل میں کہا۔
'عثمان دل بھر کر نظر بھر کے دیکھ تو لینے دو۔'
''نوشی..... تم اس طرح کیا دیکھ رہی ہو؟''
''اس عثمان کو جس کو میں نے چاہا تھا۔''
''تو کیا اب میں کچھ تبدیل ہو گیا ہوں؟''
''نہیں.....'' میں نے بہت مختصر سا جواب دیا اور نظر جھکا لی۔ 'عثمان علی تم نے حیدر جیسے انسان کے ہاتھوں سے مجھے بچایا اور میں تمہیں اس کے صلے میں کیا دے رہی ہوں۔ دل کے اندر ایک طوفان بپا تھا۔ کشتی ساحل پر تیار کھڑی تھی اور مجھے اس پار یا اس پار اترنا تھا۔ کاش یہ رات ٹھہر جائے، عثمان رک جائے لیکن آج کی رات تو وحشی طوفان اٹھا لائی تھی۔ تیز ہواؤں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ سیاہ بادلوں کے جھنڈ کسی کی تلاش میں گھوم رہے تھے۔ دل کے اندر مد و جذر آیا ہوا تھا۔ میری دنیا الٹ پلٹ گئی تھی۔ گہری رات کے سناٹے دل کے اندر اتر رہے تھے اور عثمان علی میرے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کی گہری آنکھوں میں امڈتی ہوئی محبت، میری انگلیاں قلم کر رہی تھیں۔
''نوشی ڈارلنگ، اتنی اداس مت ہو کہ راستہ مشکل ہو جائے۔ تمہاری مسکراہٹ مجھے پسند ہے۔ بس ایک بار۔'' میں ہنستے ہنستے رو پڑی، نوشی جان تمہارے سچ کا یہ کون سا راستہ ہے۔ اپنے ہاتھوں تم اپنی محبت کو بکھیر رہی ہو۔ سوچ لو ایک بار پھر، لیکن ہر بار میں ہار گئی۔ سچ جیت گیا۔ دل کے دروازے بند کر دیئے۔ عثمان، حیدر بھائی کے ساتھ ایئر پورٹ چلا گیا۔ اس نے کتنی بار مڑ مڑ کر دیکھا۔ آج وہ سوئس ایئر لائن کی فلائٹ سے سوئٹزرلینڈ جا رہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد باہر کی تیز ہوا دل میں اتر گئی تھی۔ تیز ہوا کے جھکڑ مجھے زمین سے اکھاڑ رہے تھے میں نے دیوار کا سہارا لے لیا۔ 'رک جاؤ عثمان، باہر طوفان ہے۔ مت جاؤ عثمان..... میں تمہیں نہیں جانے دوں گی لیکن وہ جا چکا تھا۔ یہ کیسی اہم رات تھی جس کا انتظار میں نے ایک ایک پل کیا تھا اور اب کمزور کر رہی ہے۔ میرے ارادوں سے ان کی جان چھین رہی ہے۔ یہ ہواؤں کے شور میں کیسی گونج ہے۔ روک دو ان آوازوں کو جنہوں نے عثمان کی آواز کا روپ دھار لیا تھا۔ ہر طرف عثمان کی ایک ہی آواز تھی۔

''آئی لو یو نوشی.....''
''آئی لو یو نوشی.....'' میں نے کان بند کر لئے لیکن یہ سامنے آئینے میں میری شکل دھندلا رہی ہے۔ ہر بار عثمان کا چہرہ نظر آ رہا ہے۔
'سوچ لو نوشی..... تم خود اپنے ہاتھوں سے سر کی چادر اتار رہی ہو۔ دھوپ کی شدت تمہیں پگھلا دے گی۔ کیا تپتی دھوپ میں ننگے پاؤں یہ سفر طے کر لو گی اور کبھی تمہیں کوئی پچھتاوا آواز دے تو..... نرم خوابوں کی دنیا کا خیال تمہیں ریزہ ریزہ کر دے۔ نہیں محبت اور فرض کے درمیان فاصلہ کر دو۔ صدیوں کا الزام غلط ثابت کر دو۔' 'اے بنت حوا کیا ہوا؟ رک گئیں۔ آ گیا تمہیں اپنی آسائش محبت کا خیال۔ نہیں۔ تیری تخلیق کا مقصد نسل انسانی کو زہر پلانا نہیں ہے۔ رک جاؤ نوشی۔ یہ زہر تمہیں پینا پڑے گا۔
اے زندگی آج تو پرے پلٹ جا۔ مت روک مجھے۔ اس گناہوں کی دلدل سے نکل جانے دے۔
'ٹھہرو نوشی..... یہ آگ ہاتھ میں مت لینا۔'
'اے میری خواہشو! مجھے مت ڈراؤ۔ جانے دو اس آگ کے قریب' گھڑی کی ٹک ٹک کہہ رہی تھی۔
'بس دس منٹ۔ صرف دس منٹ رک جاؤ۔' 'اے وقت تو خود ہی پیچھے ہو جا۔ میں نے تو کل ہی تجھے دس منٹ آگے کر دیا تھا تا کہ تو مجھے عبور نہ کر سکے بلکہ میں تجھے عبور کر لوں اور ابھی دس نہیں، بیس منٹ ہیں عثمان کو فلائٹ میں نوشی تجھے دو کی سوئیوں سے کراس نہیں کرنے دے گی۔ محبتوں کے دریا کو عبور کرتے وقت میں کئی بار گری لیکن فرض کے مضبوط ہاتھوں نے مجھے تھام لیا۔ زندگی کے تمام سوالوں کو شکست دے کر آخر کار میں ٹیلی فون تک پہنچ ہی گئی۔
''ہیلو.....'' میں نے قوت ارادی کو یکجا کر کے کہا تو دوسری طرف سے آواز آئی۔
''پاکستان نارکوٹکس کنٹرول بورڈ۔''
''جی میں مسز عثمان علی بول رہی ہوں۔'' ایک فرض شناس عورت کی آواز میں، میں نے کہا۔
''یس!''
''اس فلائٹ سے ہیروئن اسمگل کی جا رہی ہے۔'' جب میں گھر سے باہر آئی تو اندھیرے کہہ رہے تھے۔
''بٹ آئی لو یو نوشی۔''
''بٹ آئی لو یو نوشی۔''

''کل عید ہے اور تم نے ابھی تک کوئی ڈھنگ کا سوٹ نہیں خریدا۔'' وہ پرانے عید کارڈز نکالے دیکھ رہی تھی کہ اماں کو یاد آیا تھا۔

''کیا کروں گی خرید کر؟ ڈھیروں تو پڑے ہیں پہن لوں گی کوئی سا۔ اپنا کیا ہے اماں!'' وہ بہت بے زار سے لہجے میں بول کر پھر کارڈ کو پڑھنے لگی تھی۔

Love is the hardest of all of express and there is no

emotion.

Word capable of expressing my feelings for the

question except to say

''EID MUBARAK''

But somehow it just does not

Seem . enough to simply say so

And thought about max often

Than you think

محبت: گیت، خوشبو رنگ بھرا مہکتا ہوا یہ پیغام سعدیہ احمد تیرے لئے۔'' اس کی آنکھوں میں خمار چھا گیا۔

''یہ رنگ، چمکتے ستارے، یہ چوڑیاں سب تیرے لئے سعدیہ احمد۔'' اس کے دل کے اندر جلترنگ سی بج اٹھی۔ لفظوں سے خوشبو کی مہک آ رہی تھی۔ وہ پور پور خوشیوں میں ڈوب گئی۔

''میں تو کہتی ہوں تم بھی ایک اچھا سا سوٹ خود جا کر پسند کر لو۔''

''جی اماں! کیا کہا؟'' سارے رنگ ہواؤں میں اڑ گئے۔ وہ کارڈ پر نظریں جمائے ہوئے آہستہ سے بولی تھی۔

''یہ لو شگفتہ نے تمہیں دیئے ہیں۔'' اماں نے پرس اٹھایا۔

''کہاں اماں مجھے ضرورت نہیں۔'' وہ کارڈ کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

''پھر بھی رکھ لو۔'' اماں پیسے تھما کر چلی گئی تھیں اور وہ وہیں پور پور خوشبوؤں میں بھیگی بیٹھی تھی۔ وہ صبح بے قرار کے موسم کدھر گئے۔ نہ چاندرات کا انتظار نہ صبح سویرے ہاتھوں کی لالی جو سب سے پہلے نظر آتی تھی۔ اس نے کارڈ کو دوبارہ پڑھا سب سے نمایاں اور الگ علی کا کارڈ تھا بار بار پڑھنے کے باوجود وہ ابھی تک تشنہ تھی۔ کبھی وہ بے قراری چاندرات تھی۔ جو بادلوں میں کھو گئی پھر نہ چاند نکلا اور نہ ہی صبح عید آئی۔ بس یوں بیدار آنکھوں میں پچھلے خواب آتے رہے۔ آنکھیں جلتی رہیں۔ موسم سمٹتے رہے۔ محبت کرنے والے سب اپنی سمتوں کو لوٹ گئے۔ سعدیہ احمد! لیکن محبت کرنے والے بھی تو ارزاں نہ تھے۔ جو اپنی محبتوں میں دوسروں کو معتبر ہونے کے سارے مواقع گنوا دیں۔ چلو اچھا ہوا کم از کم ابا کے مرنے کے بعد ان کا بھرم رہ گیا۔

''رشتے دار سب ایک جیسے ہوتے ہیں، کیا اپنے کیا تمہارے۔'' ابا کے لفظ ساکت رات کے لمحوں میں اکثر سنائی دیا کرتے۔ پتہ نہیں اماں کو یقین آیا نہیں کیا خبر اماں دل میں ابا سے شرمندہ رہتی ہوں۔ خیر ہمیں تو اب شکوہ ہی نہیں رہا۔ علی جان اب مجھے تمہارا انتظار بھی نہیں سنا ہے تم باہر سے لوٹ آئے ہو اور کسی خوبصورت لڑکی کی تلاش ہے۔ جو تم سے عمر میں کم از کم دس برس چھوٹی ہو حالانکہ تم اپنی زندگی کے دس برس گنوا آئے ہو۔ وہ عمر کی نقدی کیا کسی حساب میں شمار نہیں ہوگی۔'' آنکھیں جلنے لگیں تو سعدیہ نے دونوں ہتھیلیوں سے رگڑ کر صاف کیں۔ کارڈ کے لفظ پھر بھی نہیں دھندلائے تھے۔ کاغذ پر وہ رنگ جوں کی توں تھی۔ صرف وقت گزر رہا تھا ایک پل کے لئے کہ لمحے کھٹکنے لگے اوراق پلٹنے لگے۔

''عیدی آئی ہے اماں!'' ویدی نے ایک نوید سنائی تھی۔

ڈھیروں پھول، چوڑیاں، رنگین لباس اور پرفیوم، سجے سجائے ٹوکروں میں فروٹ اور مٹھائی۔ یہ سب خالہ بہت ارمان سے ہر سال لے کر آ جاتی تھیں ایک رسم ایک روایت سی بن گئی تھی۔ وہ بھاگ کر شاور لینے گئی تھی۔ علی کی شوخ نظروں کا خمار ابھی تک اس کی براؤن آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ جب وہ

شاور لے کر باہر آئی تو اماں کمرے سے لاؤنج میں جا چکی تھیں۔ اس نے اپنی پسند کا گہرے نیلے رنگ کا راسلک پہ ہلکا سبز، اورنج اور گولڈن ہینڈ بلاک پرنٹ کا سوٹ زیب تن کیا جو اس پہ بے حد کھل رہا تھا۔ آج وہ پورے سنگھار کے موڈ میں تھی۔ آنکھوں میں کاجل لگایا تو آنکھیں خمار سے گلابی ہو گئیں۔ میچنگ چوڑیاں دونوں ہاتھوں کی مہندی کو وہ غور سے دیکھ رہی تھی۔ ابھی اس نے دو قدم اٹھائے بھی نہ تھے کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے پہلی بیل پر ریسیور اٹھا لیا تھا۔

''ہیلو!'' آواز اسی کی تھی۔

''عید مبارک!'' گویا وہ بھی فوراً ہی پہچان گیا تھا۔

''عید مبارک!'' وہ کھلکھلائی تو علی کو یوں لگا اس کے اطراف میں کلیاں بکھر گئیں۔

''کیسی ہو؟ چوڑیاں پسند آئیں؟ کارڈ پڑھا؟'' اس کی خاموشی پر وہ ہنس پڑا۔ اسے یوں لگا ساری فضا آج گنگنا اٹھی ہو۔

''تم سب آج بہت یاد آ رہے ہو...... لیکن مجبوری ہے، وطن سے دور رہنے والوں کی بھی عید بھلا کیا عید ہے؟'' وہ بے حد خوشگوار لہجہ میں بولا تھا۔

''اماں کو فون کیا تو پتہ چلا سب تمہارے درشن کے لئے گئے ہوئے ہیں سو ہم نے فون پر ہی مبارک کی سوچی اور زہے نصیب۔'' علی زور سے ہنسا۔

''آج اماں کسی اور نظریہ سے گئی ہیں اور مجھ سے بھی اب یہاں تنہا رہا نہیں جا رہا بس اگلی عید اکٹھی ہوگی۔ میری طرف سے سب کو ہی پوچھ لینا بولو ناں کچھ۔'' اس کے انداز میں شرارت تھی۔

''لفظ کھو گئے ہیں۔''

''کہاں؟'' وہ پھر شریر لہجہ میں مخاطب تھا۔

''پتہ نہیں؟'' وہ شرما کر ہنسی تو اس کی چوڑیاں کھنکیں آنکھوں کا کاجل پھیل گیا۔

''چوڑیوں کی کھنک تو محسوس کی البتہ گجروں کی مہک'' علی جان نے ایک گہری سانس لی۔ جو اس کی سماعت سے گزر کر روح کے اندر تک پھیل گئی۔

''ہیلو سعدی ہیلو۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا تھا۔

''ہاں میں سن تو رہی ہوں۔'' وہ اس کی شرارت محسوس کر رہی تھی۔

''ڈیڈی آ رہی ہیں۔'' اس نے سرگوشی کی۔

''میں کل صبح فون کروں گا ٹیک کیئر۔'' اس نے فون پر ایک چھوٹی سی شرارت تھی۔

''علی!'' وہ ریسیور تھامے کھڑی تھی ڈیڈی کو دیکھ کر، جلدی سے ریسیور رکھ کر مڑی تھی، لیکن چہرہ ابھی تک تپش کر رہا تھا۔

''خالہ آئی ہیں، تم تیار ہو کر جلدی سے آ جاؤ۔'' ڈیڈی کمرے میں آ کر بتا کر چلی گئی تھیں۔

وہ کتنی دیر تک اپنی سانسوں کو قابو میں نہیں کر سکی تھی اور نہ ہی چہرے کی ہنسی اور اندرونی جذبات کو جو علی نے آخری جملے پر اسے ہنسایا تھا۔ ابھی تک سرگوشیاں اس کے اندرونی جذبات کی عکاسی کر رہی تھیں۔ بہت دیر تک آئینہ کے سامنے کھڑی رہی۔ پھر خود ہی اپنے آپ سے شرماتی ہوئی لاؤنج کی طرف بڑھی تھی کہ وہیں دروازے پر ٹھٹھک گئی۔ اماں اور خالہ کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

''کیسے ممکن نہیں ہے؟ اگر ممکن نہیں ہے تو صاف صاف جواب دے دو علی کے لئے ہزاروں لڑکیاں ہیں۔'' خالہ کا انداز کس قدر توہین آمیز تھا۔

''خالہ آپ کیسی باتیں کرتی ہیں؟'' ڈیڈی کی آواز آہستہ ہو گئی تھی۔

''بس علی آئے گا تب ہی ممکن ہے۔'' اماں بھی بولی تھیں۔

''علی تو پانچ برس بعد آئے گا۔ تو کیا ہم بیٹھے رہیں گے؟'' خالہ سراسر زیادتی پر اتر آئی تھیں۔

''سعدیہ کا یہ فائنل ایئر ہے۔ اب صرف دو چار ماہ کی بات ہے اس قدر جلدی کس لئے؟'' ڈیڈی نے رسان سے جواب دیا تھا۔

''نکاح فون پر ہوگا اور سعدیہ اسٹوڈنٹ ویزے پر جا سکتی ہے۔ پڑھائی کا کیا ہے۔'' خالہ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

''مجھے معلوم ہے خالہ کوئی نہیں اتنی جلدی جا سکتی۔ آپ ضد نہ کریں سعدیہ کے امتحان کے بعد آ جیئے گا۔'' ڈیڈی نے جواب دیا تھا۔

''تو ہماری طرف سے ناں سمجھو۔ بس بات ختم ہوئی۔'' خالہ غصے سے بولی تھیں اور پرس اٹھا کر باہر کی طرف بڑھیں۔

''تو پھر سنو ہماری بھی طرف سے ناں سمجھو۔ یہ سب کس لئے؟ ساتھ لیتی جاؤ۔'' خالہ نے غصے سے

ایک بار مڑ کر دیکھا اور پھر ثاقب اور شہزاد کو اشارے سے چیزیں اٹھانے کے لئے کہا اور باہر نکل گئیں۔ وہ ایک قدم لاؤنج میں رکھے جہاں تھی وہیں کھڑی رہ گئی۔

''اماں یہ کیا ہو گیا؟'' ویدی روہانسی سی بیٹھی تھیں۔

''یہ تو ہونا تھا ہی جب سے علی باہر گیا ہے۔ خود کو نجانے کیا سمجھ رہی ہے؟'' اماں کو بھی ملال تھا۔

''چھوٹوں سے محبت اور بڑوں کا لحاظ تو اسے کبھی رہا ہی نہیں ہے۔'' اماں کو ملال تھا اس لئے وہ آنچل سے آنکھیں پونچھ رہی تھیں۔

''اماں شاید اس بار ہماری غلطی تھی۔'' ویدی کے آنسو بہنے لگے۔

''اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ کوئی دوسرا بہانہ تراش لیتی، بات اتنی بڑی نہیں تھی، لیکن اسے بات ختم کرنی تھی۔'' اماں وہیں صوفے پر سر تھامے بیٹھی رہ گئیں۔

''اماں یہ سارا ہمارا قصور تھا۔'' ویدی آنسو پونچھتے ہوئے بولیں۔

پھر کیا ہوا؟ ویدی کب اٹھیں؟ اماں کو قرار کیسے آیا؟ وہ تو بھاگ کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ علی کے ہونٹوں کی وہ سرگوشی ابھی تک اسے اپنے حصار میں لئے ہوئے تھی اور تواتر سے آنسو بہہ رہے تھے۔

صبح سب سے پہلا فون علی ہی کا تھا۔

''ہیلو!'' ایک آواز شناسا سی سمندر پار فاصلوں کو چیرتی ہوئی سماعت سے ٹکرائی تھی، لیکن اس طرف وہ ریسیور تھامے کھڑی تھی۔

''ہیلو میں علی بول رہا ہوں، کوئی آواز نہیں ہے۔'' لیکن اس نے ریسیور رکھ دیا تھا۔ گھنٹی پھر بجی تھی۔ ویدی نے فون اٹھانا چاہا تھا۔

''پلیز ویدی!'' اس نے ریسیور پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اس دن وہ بہت روئی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں نڈھال سی آنکھیں موندے لیٹی تھی۔ ویدی دبے قدموں اندر آئی تھیں۔

''سعدیہ! شاید غلطی ہماری ہی ہے۔'' ویدی کی انگلیاں اس کے سلکی بالوں میں کنگھا کرنے لگیں۔

''نہیں ویدی ایسا آپ مت سوچیں۔'' اس نے ویدی کا ہاتھ ہونٹوں سے لگا لیا۔

''ان ہاتھوں نے تو مجھے چلنا سکھایا، زندگی کی وہ سمت دکھائی جہاں پر میں اپنی محبت کیا زندگی بھی قربان کر سکتی ہوں۔'' اس نے ویدی کے ہاتھوں کو چوما تھا۔

''سوچتی ہوں میں نے تمہاری خوشی چھین لی۔''

''جس نے خوشیوں سے ہمیں بھر دیا ہو وہ بھلا کیا خوشی چھینے گا؟''

''لیکن لوگ ایسا تو ہمارے بارے میں باتیں بنا رہے ہیں۔''

''بنانے دیجئے مجھے آپ سے زیادہ کوئی اور عزیز نہیں۔'' وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''میں خالہ سے جا کر معافی مانگ لوں؟''

''ہرگز نہیں ویدی آپ ایسا کچھ نہیں کریں گی۔''

''لیکن میں خود کو مجرم محسوس کر رہی ہوں۔''

''اگر میں خالہ کو ہاں کہہ دوں تو کیا تم اپنی تعلیم جاری رکھ سکو گی؟''

''وہ بھلا کس لئے؟ جب میں خود خالہ سے اتفاق نہیں کرتی۔ آج کے بعد یہ آنسو آپ پھر کبھی نہیں دیکھیں گی۔'' اس نے رخسار سے بہتے آنسوؤں کو آنچل سے صاف کیا اور ویدی سے لپٹ گئی تھی بالکل بچوں کی طرح۔

''لیکن شاید میں خود کو کبھی معاف نہ کر سکوں۔'' ویدی کے آنسوؤں میں دور تک ایک کہانی بہت پرانی سی بہنے لگی۔ انسانوں کی بے اعتباری پھر سے پلٹ آئی اپنے اپنوں کو کمزور جان کر ہمیشہ کھٹکتے ہیں۔ کچھ اسی طرح ان کے ساتھ بھی ہوا تھا کتنی امنگوں اور چاہتوں سے ویدی کو پھوپھی اپنانا چاہتی تھیں۔ وہ بضد تھیں کہ شبیر کو صرف اور صرف شگفتہ چاہئے ان کی رونق ہی شگفتہ ہے۔ اماں نے لاکھ منع کیا کہ ابھی شگفتہ تو فرسٹ ایئر میں ہے۔

''تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہاں جا کر پڑھ لے گی۔ چار بیٹیوں کا بوجھ ہے کچھ تو بھیا کو سکون ملے گا۔ بس تم ہاں کر دو۔'' ابا مان گئے اماں ہار گئیں ویدی رخصت ہوئیں تو گھر میں سناٹا چھا گیا۔ پھر یہ سناٹا آہستہ آہستہ ویدی کی زندگی میں پھیل گیا۔ پھوپھی نے صاف انکار کر دیا کہ اب وہ شادی شدہ ہے پڑھ لکھ کر کیا نوکری کرنی ہے؟ پھوپھی کا طعنہ چار بیٹیاں تھیں اس لئے انہیں رحم آ گیا اور بیاہ لائیں اپنے ساتھ کی صائمہ اور نائمہ کو وہ کالج جاتے دیکھتی آنسوؤں سے روتی۔ اماں نے وعدہ یاد دلایا ابا نے سفارش کی، لیکن پھوپھی نے اور زیادہ سختی کر دی۔ ملنے جلنے پر پابندی لگا دی گئی۔ دو برس بھی نہ گزرے کہ ابا بھی اس دنیا سے گئے۔ اماں کا شکوہ دھرا کا دھرا رہ گیا کہ تمہاری بہن نے ہماری بیٹی پر

ظلم کیا ہوا ہے۔ ابا کی آواز کی بازگشت گھر میں گونجتی رہ گئی۔

"میری بہن کیا تمہاری بہن کر سکتی ہے یہی کچھ۔" اماں کا دعویٰ کہ وہ ایسے ویسے خاندان کی نہیں ہیں لیکن اب سننے اور کہنے والے الگ الگ ہو گئے تھے۔ پھوپھی نے شگفتہ دیدی پر اور سختی کر دی تھی کہ وہ جا کر گھر کی باتیں اماں کو بتاتی ہیں اور پھر وہ باتیں خاندان بھر میں پھیلتی رہتی ہیں۔ آنے جانے پر پابندی جاہل، گنوار، ان پڑھ کے طعنے ملتے۔ ماں نے کیا سکھایا ہے پھر چار برس میں، وہ ماں بھی نہ بن سکی۔ شبیر بدگمان سا رہنے لگا۔ ہر وقت ساس نندوں کے طعنے سہتے سہتے وہ تنگ آ گئی۔ پھر ساس ڈاکٹر کے پاس لے گئیں، ڈاکٹروں نے دونوں کو بلایا تھا۔ نقص اس میں نہیں شبیر میں ہی کمی تھی۔

"کوئی نہیں، ڈاکٹر بکواس کرتے ہیں، اولاد تو اللہ تعالیٰ کی دین ہے جب مرضی ہوگی تو اللہ تعالیٰ دے گا۔" ساس کے دل کو قرار آ گیا تھا، لیکن وہ دوسری طرح سے اسے مصروف رکھتی تھیں۔ خود بوتیک کھول کر بیٹھیں تو ساری سلائی کڑھائی شگفتہ کے ذمہ دی۔

"فالتو بیٹھے بیٹھے کرتی کیا ہو اگر اس طرح سے اماں کا ہاتھ بٹا دو گی تو اچھا ہی ہوگا۔" شبیر اپنی جان چھڑا کر کہتا تھا لیکن دکھ اسے یہ نہیں تھا، دکھ اسے یہ تھا شبیر نفسیاتی مریض بنتا جا رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ شگفتہ سے بہت دور ہو گیا۔ بعض وقت تو وہ اسے دیکھ کر خوفزدہ ہو کر کمرے سے باہر نکل جاتا۔ اوپر سے یہ طعنہ کہ اگر ماں کے گھر جانا ہے تو ہمیشہ کے لئے جاؤ۔ وہ رفیہ کی شادی میں غیروں کی طرح گئی اور واپس آ گئی۔ اماں نے روکا بہنوں نے ہاتھ پکڑا، لیکن وہ ساس کی طرف دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"بس اماں پھر آؤں گی۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی حالانکہ دو برس بعد آئی تھی۔

"دیدی!" ماریہ اور سعدیہ نے ایک ساتھ پکارا تو انگلی میں سوئی کھب گئی۔

"تم لوگ۔" وہ سلائی چھوڑ کر کھڑی ہو گئیں۔ وہ دونوں کا ہاتھ پکڑ کر اندر کمرے میں لے گئی۔

"اماں تو ٹھیک ہیں تم لوگ یہاں کیوں آئی ہو۔" وہ بے انتہا گھبرائی سی لگ رہی تھی۔

"دیدی آپ اماں کو سمجھائیں۔ آپ کے سوا ہمارا اور کوئی نہیں۔" ماریہ رونے لگی۔

"دراصل دیدی اماں ہماری بھی شادی کرنے والی ہیں۔" ماریہ جذباتی ہو گئی۔

"کہاں کیسے؟" شگفتہ واقعی گھبرا گئی۔

"دیدی مجھے پڑھنا ہے۔ میں مزید پڑھوں گی۔" ماریہ ہاتھ پکڑ کر رونے لگی۔

"میں کیا کر سکتی ہوں؟"

"اماں کو سمجھائیں دیدی...... مجھ پہ یہ ظلم نہ کریں۔ میں رفیہ اور آپ جیسی زندگی نہیں گزار سکتی۔"

"اچھا اماں کو آ کر سمجھاؤں گی۔" وہ دونوں بہنوں کو رخصت کرتے ہوئے بولی تھی۔ دوسرے دن وہ دھاگے اور میچنگ کا سامان لینے کے بہانے اماں کے گھر پہنچی تھی۔ اماں کو وہی گلہ تھا کہ وہ اس غربت میں دونوں کو کیسے پڑھا سکتی ہیں، اگر کوئی بھائی ہوتا تو ٹھیک تھا، آخر سلائی کر کے وہ گھر چلائیں یا ان کی پڑھائی؟ اماں کی بات اس کے دل کو لگی تھی۔ بڑی بے بسی سے اس نے ہاتھ ملایا، وہ دل مسوس کر آ گئی تھی لیکن دل تھا کہ وہ بار بار سوچے جا رہی تھی کہ وہ کیا کرے پھر وہ کسی نتیجہ پر پہنچ کر رک گئی۔

"میں رفیہ اور آپ کی طرح زندگی نہیں گزار سکتی۔" ماریہ کی سلگتی ہوئی آواز اس کے دل کے دروازے کو بار بار وا کر رہی تھی۔ بے علم و بے ہنر انسان کی زندگی، بڑی دیر تک وہ ٹہل ٹہل کر سوچتی رہی۔ یہاں میرا کیا رشتہ ہے۔ صرف ڈر اور خوف، خود پیٹنا پڑتا دنیا کو دھوکا دینا کہ وہ ایک شادی شدہ زندگی گزار رہی ہے۔ شبیر اور اس کا ساتھ تو برسوں پہلے ہی ختم ہو گیا تھا۔ پھر بھی وہ ساتھ رہ رہے تھے۔ دو آنسو ٹوٹ کر گرے اور وہ چلتی ہوئی الماری کے پاس گئی، سر پہ چادر ڈالی اور ساس کے پاس آئی۔

"پھوپھی میں اماں سے ملنے جا رہی ہوں۔"

"اور یہ کام؟"

"دو چار دن رہ کر آؤں گی۔" وہ بہت اعتماد سے مخاطب تھی۔

"دو چار دن ہرگز نہیں اگر جانا ہے تو ہمیشہ کے لئے ورنہ یہ آنے جانے کا سلسلہ ختم کرو۔ بوڑھی اور غریب ماں کو دکھ دینے سے کیا فائدہ؟ اگر ہم نے تم سے یہ چھت چھین لی نا تو سوچو تمہاری غریب بہنوں کو کون بیاہنے آئے گا، کیسی جگ ہنسائی ہوگی، میں نے تو بھائی کی اولاد سمجھ کر رشتہ ڈالا تھا ورنہ شبیر سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟" ساس نے حسب معمول اسے ڈرایا تھا لیکن آج وہ ڈری نہیں اور اللہ حافظ کہہ کر وہ دہلیز پار کر آئی تھی۔

"یہ کیا کیا بیٹا تم نے؟" اماں نے سنا تو سر پیٹنے لگیں۔ لیکن پھر اس نے اپنے سارے زخم اماں پہ عیاں کر دیئے۔

''بس اماں میں ان دونوں کے لئے آئی ہوں۔ میری زندگی تو جہالت کی بھینٹ چڑھ گئی کم از کم میں ان کو تو بچاؤں وہاں سوئی دھاگوں سے الجھنے سے تو بہتر ہے کہ میں ان کے لئے ہی کچھ کروں آخر آپ یہ بوجھ کیسے اٹھائیں گی کیا اماں نے بیٹی کو جنم نہیں دیا۔'' وہ سر جھکائے ہوئے آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔

''لیکن شگفتہ یہ سب رشتے دار جینے دیں گے؟'' اماں پریشان سی ہو رہی تھیں۔

''کیوں اماں! کسی رشتہ دار نے یہ کبھی سوچا کہ شگفتہ ماں سے ملنے کیوں نہیں آتی؟ اس پر کیا گزر رہی ہے؟ پھر وہ بھلا کیوں سوچیں گے۔'' اس نے سر اٹھا کر عزم سے سوچا۔

''نہیں دیدی آپ لوٹ جائیں، لوگ طعنہ دیں گے۔'' ماریہ سہم کر بولی تھی۔

''میں کشتیاں جلا کر آئی ہوں وہاں ہمارا کچھ نہیں تم دونوں کو میری ضرورت ہے۔'' اس نے دونوں بہنوں کو سینے سے لگا لیا اور دل بھر کر روئی تھی۔ پھر چند دن بعد اسے تین لفظوں کا تمغہ ایک رجسٹری کی صورت میں ملا تھا لیکن وہ اپنی دنیا میں مگن تھی۔ اماں کی جگہ، وہ مشین پر کپڑے سیتی رہتی پھر ایک دن اس نے گھر پر ہی بوتیک کا کام شروع کر دیا تھا۔ زندگی کے ماہ و سال یوں گزرے کہ پتہ بھی نہ چلا جب ماریہ نے ماسٹرز کرنے کے بعد مقامی کالج میں ایک لیکچرر کی حیثیت سے جاب شروع کی اور اسی سال اماں نے اسے رخصت کر دیا۔ کتنی خوش تھی وہ اس کی محنت اور محبت نے ماریہ کی آبیاری کی ہی تھی کہ خالہ نے آ کر سعدیہ کو رنگ پہنا دی تھی۔

''بس اماں ہم ایک دو سال میں اس کی شادی کر دیں گے۔'' وہ سعدیہ اور علی جان کے رشتے سے بے حد مطمئن تھی۔ خالہ نے علی کے جانے سے چند ماہ پہلے ہی تو اسے رنگ پہنائی تھی اور آج جب خالہ نے شادی کی بات کی تو وہ اماں سے پہلے انکار کر چکی تھی۔

''ہر گز نہیں سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔'' وہ اعتماد اور محبت سے بولی تھی اور اب تو خالہ کیا دو خاندانوں کو آپس میں روٹھے ہوئے پانچ سال ہو گئے تھے علی امریکہ سے ایم بی اے کی ڈگری لے کر بھی آ گیا تھا۔ خالہ ہر روز لڑکی کی تلاش میں نکلتی تھیں لیکن انہیں کوئی لڑکی ہی پسند نہ آتی۔

''اماں آپ ہی خالہ کے گھر چلی جائیں۔'' اس نے کئی بار کہا تھا۔

''سوال ہی نہیں ہوتا ہم لڑکی والے ہیں۔'' اماں انا کا مسئلہ بنائے ہوئے تھیں۔

''اماں رشتے داریاں جدا نہیں ہوتیں۔ قصور تو ہم لوگوں کا تھا اگر خالہ کی بات مان لیتے تو شاید یہ نوبت ہی نہ آتی۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے خوشامد کرنے کی، ہماری لڑکی پڑھی لکھی ہے۔ ہزاروں ملیں گے۔'' اماں نے شگفتہ کو جھڑک دیا تھا۔

''لیکن اماں سعدیہ کے دل میں علی کے لئے نرم گوشہ ہے۔'' وہ دبے دبے لفظوں میں بولی تھی۔ لیکن اماں یہ سن کر یوں انجان بن گئیں گویا کچھ سنا ہی نہ ہو لیکن دیدی کے دل میں سعدیہ کے آنسو اکثر ہی گرا کرتے اور وہ یوں بیٹھی بیٹھی اداس ہو جاتی تھی۔

''کیا ہوا اماں! کس کا جوڑا بن رہا ہے؟'' دیدی کمرے میں آئیں تو وہ بھی بیڈ پر پچھلے عید کارڈ دیکھ کر ٹھٹک گئیں اور سعدیہ ہی کے بیڈ پر، وہ بیٹھ گئیں۔

''یہ کس کا کارڈ ہے؟'' دیدی نے سعدیہ کے ہاتھ سے کارڈ لے لیا۔ وہ گھبراہٹ میں کچھ نہ کہہ سکی۔ دیدی نے پلٹ کر پڑھا اور یوں انجان سی بن گئیں گویا کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا پھر باری باری سب ہی پرانے کارڈز کو دیکھتی رہیں۔ پھر دیدی نے محسوس کیا کہ سعدیہ کی آنکھیں نم سی ہوئی ضرور تھیں۔

''اماں سنا ہے خالہ نے علی کے لئے ایک لڑکی پسند کر لی تھی لیکن علی نے انکار کر دیا۔'' دیدی نے اچانک موضوع ہی بدل دیا۔

''وہ جانے، اس کا کام مجھے کیا، اب جب کوئی رشتہ ہی نہیں رہا تو پھر؟'' اماں تو تمام رشتے ناطے توڑے بیٹھی تھیں۔ اسی لئے انہیں اس ذکر سے کچھ نہیں ہوا۔ البتہ سعدیہ نے غصے سے کارڈ لئے اور اٹھا کر فائل میں بند کر دیئے۔

''دیدی اس وقت علی کا کیا ذکر؟'' وہ بہت خاموش سی بولی تھی۔

''ذکر تو ہوگا، اس سے خونی رشتہ ہے، خونی رشتے یوں ختم نہیں ہوتے اور وہ بھی ذرا سی بات پر۔'' دیدی نے تو یوں بات کی گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اس نے دیدی کو غور سے دیکھا لیکن وہ حواسوں میں تھیں۔

''دیدی اب علی کا نام مت لیا کیجئے۔'' اس کی آنکھیں چھلک پڑیں اور وہ اٹھ کر واش روم میں چلی گئی۔ دیدی چپ چپ سی وہیں لیٹی رہیں۔ شام کے سائے ڈھل گئے تو اماں نے نیچے بلایا تھا کہ اب اذان

میں دیر ہی کتنی رہ گئی۔ روزہ کھولنے کے بعد ویدی، شاپنگ کے لئے بازار گئی تھیں۔ اماں عشا کی نماز سے ابھی تک فارغ نہیں ہوئی تھیں کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی سعدیہ نے ہی ریسیور اٹھایا تھا۔

''ہیلو!'' ایک آواز ایک صدائے جاناں سماعت میں ٹھہر سی گئی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی آواز کو پہچان لیا تھا۔

''سعدیہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'' علی جان جلدی سے بولا تھا۔

''بہت دیر ہو گئی علی!''

''کچھ اتنی بھی نہیں۔''

''جدائیاں اور غلط فہمیاں انسان کو بہت دور لے جاتی ہیں۔''

''لیکن نہ تو میں جدا ہوا ہوں اور نہ ہی میں کسی غلط فہمی کا شکار ہوں۔ بس یہ کہ آج تھک گیا تو سوچا ایک بار دستک دے کر دیکھ لوں شاید قسمت جاگ جائے۔'' علی کا لہجہ بہت تھکا ہوا سا تھا۔

''دیکھو علی اب میں دوبارہ سے اس محبت کی ابتدا کر ہی نہیں سکتی جو ختم ہو گئی۔''

''غلط سعدیہ! محبت ختم نہیں ہوتی یہ پھول اور خوشبو کا رشتہ ہے پھر بھلا۔''

''یہ سب کہنے کی باتیں ہیں علی جان جو ہوا، وہ نوشتہ تقدیر تھا۔''

''میں یہ سب کچھ نہیں جانتا، بس میں ایک بار تم سے ملنا چاہتا ہوں۔'' علی کی آواز میں محبت کی شدت تھی۔ تب ہی وہ ایک لمحہ کے لئے بوکھلا گئی تھی۔

''یہ اب ممکن نہیں رہا علی۔''

''کیوں کیا کیا ہے میں نے اور کیوں نہیں مل سکتے ہم؟'' اس بار اس کی آواز میں شوخی اتر آئی تھی۔

''دیکھو سعدیہ تم فون بند مت کرنا۔ میں تم سے وضاحت چاہتا ہوں۔''

''کس بات کی؟'' اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

''اس محبت کی جو ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے ہے کیا پوچھ سکتا ہوں کہ واقعی تمہارے لئے اب میں اتنا اہم نہیں رہا۔'' علی نے جواب طلب کیا تھا۔

''دیکھو علی بات سمجھنے کی کوشش کرو، محبت گڈے اور گڑیوں کا کھیل نہیں، جس کو بزرگ آ کر توڑ چھوڑ دیں ہم بیٹھے ان کے گھروندے پھر سے آباد کر لیں جو بات بھی تھی۔ اس میں ہمارے بزرگوں کی

رضامندی شامل تھی اور اب وہ اس فیصلے پر خوش نہیں تو نہ سہی۔ ہمیں ابھی اتنا حق نہیں کہ ہم ان کے فیصلے کے خلاف ہاں اور ناں کہہ سکیں۔'' وہ پاتال سے بول رہی تھی۔

''لیکن میں احتجاج کر سکتا ہوں۔'' وہ بہت سنجیدہ سے لہجہ میں بولا تھا۔

''لیکن دوسری طرف سے اگر تعاون نہ ہوا تو تم ہار جاؤ گے۔''

''مطمئن تو لوٹ جاؤں گا، کم از کم یہ تو احساس نہ رہے گا کہ میں نے دستک نہ دی۔'' وہ بہت مایوسی سے ہنسا۔ سعدیہ کے دل میں بھی ایک درد کی لکیر پھیلی تو تھی لیکن وہ جذبات پر مکمل قابو کئے ہوئے تھی۔

''کون ہے فون پر؟'' ویدی نے چادر اتار کر رکھتے ہوئے پوچھا تو اس نے گھبرا کر جلدی سے ریسیور رکھ دیا اور آنچل سے آنسوؤں کو صاف کرنے لگی۔

''کالج کی کوئی دوست تھی۔'' وہ جھوٹ بول کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

''لیکن تم تو روئی ہوئی لگ رہی ہو۔'' ویدی نے تشویش کی نظر سے دیکھا۔

''آنکھوں میں کچھ پڑ گیا ہے۔'' وہ باتھ روم کی طرف چل دی۔ جب وہ فریش ہو کر آئی تو ویدی اور اماں شاپنگ کی ہوئی چیزیں دیکھ رہی تھیں۔

''یہ میں نے تمہارے لئے لیا ہے۔ تم تو کوئی عید کا اہتمام ہی نہیں کرتی ہو۔''

''کیا ضروری ہے؟''

''بالکل جناب'' ویدی بہت خوش لگ رہی تھیں۔

''اور اماں یہ رہیں سب چیزیں نادیہ اور رفیہ کے بچوں کی اور ہاں اماں اس بار میں علی کے لئے بھی ایک سوٹ لے کر آئی ہوں۔''

''علی کے لئے؟'' اماں کو حیرت ہوئی۔

''اب بھلا ان سے ہمارا کیا رشتہ؟'' اماں دکھی سی ہوئیں۔

''کیوں نہیں اماں وہ برسوں بعد لوٹا ہے۔'' ویدی کے اندر سے محبت ابلنے لگی۔

''ویدی جگ ہنسائی سے اب کوئی فائدہ نہیں۔'' سعدیہ نے پیک کیا ہوا گفٹ اٹھا کر ایک طرف ڈال دیا۔

''ایسا نہیں سوچتے، کسی نہ کسی کو تو پہل کرنی ہوگی۔ یونہی تو نہیں وہ انکار پہ انکار کئے جا رہا ہے آخر۔''

ڈیدی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''اور ہاں جس طرح سے خالہ جان پانچ برس پہلے آئی تھیں۔ میں بھی اسی طرح جاؤں گی۔ باقی چیزیں میں آرڈر کر کے آئی ہوں اگر چاند نکل ہوگیا تو پہنچ جائیں گی۔ میں نے نمبر اور ایڈریس نوٹ کروا ہی دیا ہے۔'' ڈیدی اماں کو بتا رہی تھیں۔

''یہ تو جھکنے اور گرنے والی بات ہے۔'' اماں بھی بڑبڑائیں۔

''جھکنے اور گرنے کی اس میں بھلا کیا بات ہوئی؟ ہماری خالہ کا گھر ہے ہم جا رہے ہیں۔ اگر یونہی انا کا مسئلہ بنائے بیٹھے رہے تو بہت مشکل ہو جائے گی۔'' ڈیدی کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ ابھی تک تھی۔

''ایک بار اچھی طرح سوچ لو بیٹی۔'' اماں نے مشورہ دیا۔

''بس اماں محبت میں پہلا قدم تو کسی نہ کسی کو اٹھانا ہی پڑتا ہے۔ سو بس میں ہی اپنے نصیب میں لائی تھی۔'' ڈیدی ہنسی۔

''ڈیدی آپ نہیں جائیں گی، مجھے اپنی محبت سے زیادہ آپ کی عزت پیاری ہے۔'' سعدیہ نے ڈیدی کا ہاتھ تھام لیا۔

''پگلی مجھے اپنی عزت سے زیادہ اس محبت پر ناز ہے، جس کے آگے تم نے سر جھکایا، اگر ہم یونہی ایک انا کے اردگرد بیٹھے رہے تو زندگی کے مختصر لمحے بیت جائیں گے اور پھر علی غیر تھوڑی ہے۔ وہ اپنا ہے اپنوں اور غیروں میں یہی تو فرق ہے۔'' اماں بھی کچھ کچھ راضی لگ رہی تھیں اور پھر اماں کی ناراضگی کے باوجود ڈیدی علی کی عیدی لے کر خالہ کے گھر گئی تھیں۔ خالہ ڈیدی کے گلے لگی بہت دیر تک روتی رہیں، مگر خوش تھیں شگفتہ نے محسوس کیا کہ واقعی خالہ خوش ہیں اور سب لوگ بھی۔

''خالہ میں علی کے لئے عید کا سامان اماں کی طرف سے لے کر آئی ہوں۔'' ڈیدی نے ڈرتے ڈرتے بات کی اور پھر پیکٹ اٹھا کر خالہ کے سامنے رکھ دیا۔

''میں کچھ کچھ سمجھ تو گئی تھی۔'' خالہ دھیرے سے بولیں تو ڈیدی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

''آپا کیوں نہیں آئیں؟'' خالہ نے سنجیدگی سے کہا۔

''مجھے جو بھیجا ہے۔'' ڈیدی نے گھبرا کر کزنز کی طرف دیکھا جو انہیں گھیرے بیٹھی تھیں۔

''آپا کو خود آنا چاہئے تھا۔'' خالہ غور کرنے لگیں۔

''لیکن خالہ۔'' ڈیدی کے چہرے پر مایوسی کی جھلک سی نمایاں ہوئی۔

''ہمارے لئے تو یہی کافی ہے کہ ڈیدی آ گئیں۔ سچ ڈیدی عید کا مزہ ہی جاتا رہا۔ نہ کہیں آنا نہ جانا غیروں میں پل دو پل کی خوشیاں سچ ہمیں تو نہیں اچھی لگتیں۔'' مسرت خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔

''چلیں نا بھیا دیکھیں کتنے دنوں کے بعد شگفتہ ڈیدی ہمارے گھر آئی ہیں۔'' صباحت نے علی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا تھا۔

''ارے ڈیدی۔'' علی دیکھ کر مسکرایا لیکن ڈیدی نے محسوس کیا علی کچھ نروس اور رنجیدہ سا دکھائی دے رہا تھا۔ اسی طرح بار بار مسرت اور صباحت ماں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ گویا ماں نے سب کی خوشیاں مٹھی میں بند کر رکھی ہوں۔

''اچھا خالہ۔'' کچھ دیر بیٹھ کر ڈیدی اٹھیں۔

''ٹھہرو شگفتہ۔'' ڈیدی کے پیر لڑکھڑا گئے۔ خود علی بھی گھبرا کر ماں کی طرف دیکھنے لگا۔

''ہم نے عید کی دس تاریخ مانگی تھی کیا آپا کو وہی تاریخ منظور ہے؟'' ڈیدی نے سر پر اوڑھی ہوئی چادر دوبارہ اتاری اور خالہ کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

''دس، پانچ دن کا مسئلہ نہیں خالہ آپ ابھی آ جایئے۔'' ڈیدی کھلکھلا کر ہنسیں تو سب ہی ہنسنے لگے۔

''ٹھیک ہے آج کسی پہر ہم لوگ بھی آئیں گے۔'' چلتے وقت خالہ نے ڈیدی کو خالی ہاتھ نہیں بھیجا تھا۔ ڈیدی خوشی کا پیغام لئے رخصت ہوئی تھیں۔ ڈیدی کی غیر موجودگی میں اماں نے ٹہل ٹہل کر وقت گزارا تھا۔

''ارے اماں ہمیں دیکھ کر سب اتنے خوش تھے کہ بتا نہیں سکتی اور خالہ تو سب سے زیادہ خوش تھیں۔ وہ لوگ آج رات کسی پہر آئیں گے، اچھا، دانا میں چلی گئی۔'' ڈیدی محبت میں بڑی فراخ دلی سے سب کچھ بڑھا چڑھا کر بتا رہی تھیں۔ اماں نے ساری بات تفصیل سے سنی تھی لیکن پھر بھی یقین نہیں تھا، وہ تو سمجھی تھیں کہ اب قیامت کو ہی ملیں گے۔

بھیگی رتوں میں

وہ کہنے کے لیے تو بہت کچھ آئی تھی لیکن دونوں خاموش تھے، ان کے درمیان وہ پہلی سہانی صبح آ کر ٹھہر گئی تھی۔ وہ جب پہلی بار ملے تھے۔ کیفے ٹیریا کی وہ صبح۔

''ہیلو آپ ہیں مس ورشہوار حسن؟'' اس نے ورشا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں۔''

''میں میگزین ایڈیٹر جہانزیب ہوں۔'' اس نے بہت گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''بیٹھئے۔'' ورشا نے میز پر پیالی رکھتے ہوئے کہا۔

''شکریہ مس ورشا آپ کا افسانہ بھیگی رتوں میں بہت زیادہ پسند کیا گیا ہے۔''

''کچھ زیادہ ہی سپر ہٹ ہوا ہے۔'' نیلو نے پیالی سے سپ لیتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنی نوٹ بک میز پر رکھی اور مسکرا کر ورشا کی طرف دیکھ کر کہا۔

''میں بھی یہی بتانے آیا ہوں۔ آپ اچھا لکھتی ہیں۔''

''شکریہ۔'' وہ اٹھ کر چلا گیا۔

پھر وہ اچھے دوستوں کی طرح ملتے رہے، وہ دونوں کلاس فیلو تھے۔ ورشا اس سے مرعوب تھی، وہ خود بھی ہر لحاظ سے ایک مکمل شخصیت کا مالک تھا۔

''ورشا!'' وہ چونک گئی اور پھر دونوں ساحل کے کنارے کنارے چلنے لگے۔ بہت دور تک سنہری ریت پر ان کے قدموں کے نشان نظر آ رہے تھے۔ بظاہر وہ اس وقت جہاں زیب کے ساتھ تھی لیکن پھر وہ پلٹ کر کسی رو پہلی دھوپ میں پہنچ گئی تھی۔

جب جہانزیب نے پہلی بار کچھ کہنا چاہا تھا۔

''ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی ایسی بات نہیں جو کوئی مشترکہ فیصلہ کرنے میں معاون ثابت ہو

لیکن پھر بھی میں یہ کہنا پسند کروں گا۔ جب کبھی تمہیں فیصلے کا حق ملے تو میرے بارے میں بھی غور کرنا۔'' تو اس نے بھی اسی صاف گوئی سے اقرار میں گردن ہلا کر اس کی بات کا جواب دیا تھا۔

''پرامس۔''

''پرامس۔'' اس نے بھی جہانزیب کے ہاتھ میں ہاتھ دیتے ہوئے کہا تھا۔

پھر وہ امریکہ جانے سے پہلے حسن مسرور سے ملا۔ اس دن وہ آف وہائٹ شرٹ اور بلیو پینٹ میں بہت اسمارٹ لگ رہا تھا۔

ورشا نے کئی بار اس کے قہقہوں پر پلٹ کر دیکھا جو وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ لگا رہا تھا۔ حسن مسرور ان سب لوگوں سے مل کر خوش ہوئے تھے، خاص طور پر اس کے والد سے وہ متاثر تھے، شور اور ہاہمی کچھ کم ہوئی تو وہ ورشا، نیلو اور مومی کی طرف چلا آیا۔

''مس ورشا پارٹی پسند آئی؟''

''جی بہت خوب آپ کی نہ صرف پارٹی بلکہ جناب آپ بھی انکل حسن مسرور کو پسند آ گئے۔'' یہ نعیم بھائی تھے۔

''زہے نصیب۔'' اس نے مسکرا کر ورشا کی طرف دیکھا جو آنکھوں سے نعیم بھائی کی خوشامد کر رہی تھی کہ خدا کے واسطے یہاں تو باز رہیے۔

اس نے دونوں ہاتھ کرسی کی بیک پر ٹیک دیے اور کہا۔

''میں کل تم سب سے دور چلا جاؤں گا۔'' ورشا نے مسکرا کر دیکھا لیکن ان کے درمیان کوئی ایسی بات نہیں تھی، جو ایک دوسرے کو اداس کرتی۔ دونوں حقیقت پسند تھے لیکن آج دونوں کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ڈھیر ساری باتیں کریں اور ہنسیں۔

''ورشا تم نے لکھنا کیوں چھوڑ دیا؟''

''جہانزیب تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ وہ صرف میری ڈائری کا صفحہ تھا۔ جو نیلو نے میری اجازت کے بغیر خاموشی سے میگزین میں دے دیا تھا۔''

''لیکن پھر بھی ورشا ہماری تمہاری دوستی کی ابتدا ہی ان لائنوں سے ہوئی ہے جن کو تم نے دوسروں کے لیے ادھورا چھوڑ دیا تھا۔'' اختتام تو میں خود بھی اس کہانی کی شہزادی کا نہیں جان سکی جس کو چندن کے

چڑنے بنا ہوئے رکھی تھی، جس کے انتظار میں ڈھیروں پھول رکھے تھے لیکن وہ......! اب سب کچھ کڑواہٹ بن کر میرے اندر جذب ہو گیا ہے۔ یہ زہر میری روح اور قلم دونوں میں اتر گیا ہے۔ اب یہ زہر میری شریانوں میں سرایت کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور جب کچھ کہنا چاہوں تو خوبصورت الفاظ کوکلے جیسے الفاظ میں بدل جاتے ہیں اور اختتام پر وہی لڑکی آ جاتی ہے جس کو پتہ نہیں چندن نے بھی پناہ دی یا پھر وہ کسی پناہ کی تلاش میں بھٹکتی رہی؟'' اس نے بہت بے زاری سے سب کچھ کہہ ڈالا۔

''لیکن پھر بھی ورشا'' یہ کہتے ہوئے وہ کھو سا گیا۔ اس کی اس حالت پر ورشا بھی مسکرا پڑی تو اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے تم کوکلے جیسے الفاظ سے ہی مجھے یاد کرنا میں جواب دوں گا۔'' پھر دونوں ہی ہنس پڑے۔ شاید جہانزیب بھی اس کے ساتھ ساتھ ان لمحوں میں اتر گیا تھا۔

''تم نے میرے خط کا جواب نہیں دیا تھا۔'' وہ چونک کر حال میں واپس آ گئی۔

پھر دونوں ایک لمحے کو رک گئے۔ دونوں اب پوری طرح سے ایک دوسرے کو کہہ اور سن سکتے تھے۔ دونوں چلتے ہوئے ساحل سمندر پر بہت دور تک نکل آئے تھے۔

''جہانزیب تم اس بات کو کیوں نہیں مانتے، میں اس دوران سخت مینٹلی ڈسٹرب تھی اور ہوں۔'' وہ تھک کر بیٹھ گئی۔

''ناممکن میں اس بات کو نہیں مان سکتا اگر یہ سچ بھی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں اپنے فیصلے یوں بھی بدلنے کا عادی نہیں ہوں۔''

''لیکن زیب مجھے لوگ ابنارمل کہتے ہیں۔''

''غلط۔'' اس نے دور ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھتے ہوئے دوبارہ کہا۔

''ورشا تم ہی نے مجھ سے ایک بار کہا تھا۔ سنے سنائے قصوں سے ایک شکل تو بنتی ہے لیکن نقوش واضح نہیں ہوتے سمندر کی اوپری سطح سے اس کی گہرائی کا اندازہ ناممکن ہے اور اس کی پرکھ کے لئے ہمیں آخری سرے تک پہنچنا چاہئے اور آج تم دوسروں کے شک و شبہات کی بنا پر اس شکل کو کیوں نہیں دیکھ سکتیں۔ جہاں ایک، ایک نقش واضح ہے تمہیں اوپری سطح سے اس محبت کا اندازہ کیوں نہیں ہو رہا۔ جو میرے اندر ابل رہا ہے۔'' یہ باتیں وہ بہت جذباتی انداز میں کر رہا تھا۔'' پلیز ورشا ہمارے درمیان

وقت بہت کم رہ گیا ہے میں تمہارا فیصلہ جاننا چاہوں گا۔''

''زیب میں تم کو دھوکا نہیں دے سکتی، تم میرے ایک اچھے دوست ہو آج بھی اور کل بھی رہو گے لیکن پھر بھی تم ایک بار اپنے کیے ہوئے فیصلے پر غور کر لو ممکن ہے۔'' جواب نہ پا کر ورشا پھر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

''ورشا یہ میری بات کا جواب نہیں تھا۔'' اس نے بہت گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بوکھلا گئی۔

''جہانزیب لڑکیوں کی قسمت کے فیصلے تو والدین ہی کرتے ہیں اور وہی صحیح فیصلے ہوتے ہیں یہ تو صرف میں تمہیں دوست سمجھ کر مشورہ دینے آئی تھی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں کوئی فیصلہ لے کر آئی تھی۔'' یہ کہتے کہتے اس کی نظریں جھک گئیں اور اب خاموشی اس بات کا جواب تھی کہ اس آنے والی رات کے پار ان کے سنگم کا سورج جگمگا رہا ہے۔

سمندر پر اندھیرا چھانے لگا اور وہ ایک دوسرے کے قدموں کے نشان کو غور سے دیکھتے ہوئے گھر لوٹ رہے تھے۔

☆☆

شدید گرمی کے باوجود ماما گل (جہاں آرا) نے کمرے کے دروازے اور کھڑکیاں بند کر دیں لیکن برگ ریز ہواؤں کا شور، دل کے اندر جوار بھاٹے کی طرح ابل رہا تھا۔ دل کے چور کو وہ چھپانے دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ لیکن ایک پل نہ سو سکیں۔ ہر لمحے یوں لگتا، جیسے عطیہ ان کے قدموں میں سر رکھے معافی مانگ رہی ہیں، جب وہ گھبرا کر دیکھتیں تو وہاں ان کے علاوہ کوئی اور نہ ہوتا لیکن ہر پل ان کے ساتھ ان کی پچھلی زندگی ہوتی۔ جو ان کی روح پر عذابوں کی طرح مسلط تھی اور ہر لمحہ بھی خیال رہتا کہ میری بیٹی اسی عذاب میں مبتلا ہے۔ میرے گناہوں کی سزائیں وہ بے سکون ہے، وہ بھی ہر لمحے عطیہ کی طرح سہمی ہوئی رہتی ہے۔ کاش وہ ایک بار مل جائے تو میں خود معافی مانگ لوں گی لیکن یہ ان کے دل کی بات تھی۔ ورنہ انہوں نے عطیہ کے نام کو ہر ایک کی زبان سے یوں ختم کر دیا تھا جیسے وہ کبھی تھی ہی نہیں یا پھر تھی تو مر گئی۔ حالانکہ ہر لمحہ عطیہ آپا ان کے دل میں دستک دیتی تھیں اور جب ماما گل آنکھیں کھول کر دیکھتیں تو صرف سہمی اور لپٹی ہوئی ورشا ہوتی اور یہی حال آکا میاں کا تھا۔

جس بات کا ماما گل کو ڈر تھا وہی ہوا۔ ورشا خوف کے مارے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کی نگاہیں بند کھڑکی پر تھیں۔

''ماما گل اس کے پیچھے ہے کوئی؟''

''نہیں میری جان تمہارا وہم ہے۔'' انہوں نے پردے کو ایک طرف کر دیا لیکن ورشا نے ایک نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ماما گل نے اس کے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

''اب تم سو جاؤ آرام سے۔''

''ماما گل!'' ورشا نے آہستہ سے ماں کو پکارا لیکن وہ رفعت سے یہ کہتی ہوئی چلی گئیں۔

''رفعت! لائٹ آف کر دو۔''

ماما گل سزاؤں کے اس سمندر کو عبور کرتے ہوئے تھک گئی تھیں۔ کب تک وہ ورشا کو اپنے آنچل سے لگائے رکھتیں آخر ایک دن تو اس کو اس گھر سے جانا تھا۔ پہلی بار امید کی کرن نظر آئی تھی، لیکن ان کے دل کے وسوسے سوفی صد درست ہوئے۔ ورشا آج اچانک پھر سوتے میں چیخ پڑی کہ پردے کے پیچھے کوئی رو رہا ہے حالانکہ ماما گل نے سرِ شام ہی تمام کھڑکیاں اور دروازے بند کر دیے تھے اس کے باوجود ماما گل کو خود بھی اس بات کا یقین تھا کہ ورشا آج ان سے پہلی بار الگ ہو رہی ہے کہیں پھر نہ ڈر جائے۔ بچپن میں ورشا کو جب یہ دورہ پڑا تھا تو ماما گل نے شہر کے تمام ڈاکٹروں سے رجوع کیا جب کچھ فائدہ نہ ہوا تو انہوں نے کوئی بھی خانقاہ نہ چھوڑی۔ اپنے پیر و مرشد کو آزماڈالا لیکن ورشا کے سر چڑھا جن نہ اترنا تھا نہ اترا۔ وہ تمام رات سہمی ہوئی ماما گل کے ساتھ چمٹی رہتی۔ بس ایک بات کہتی ماما گل کوئی شیشے کے پیچھے رو رہا ہے۔ ماما گل اٹھ کر پردہ ہٹا دیتیں لیکن وہ اپنی آنکھیں مارے خوف کے بند رکھتی۔ سارا گھر اس کے اس خوف کی وجہ سے سہا رہتا۔ ماما گل کی تو زندگی ختم ہو کر رہ گئی تھی ہر جگہ وہ ان سے لگی رہتی۔ خاص طور پر جب آسمان پر بادل ہوں اور تیز بارش کے شور سے تو ورشا مارے خوف کے رات بھر نہ سوتی۔ بس ایک رٹ رہتی۔ ماما گل آپ جاگتی رہیں آکامیاں آپ جاگتے رہیں۔ جوں جوں وہ بڑی ہوئی خوف کچھ کم ہو گیا لیکن پھر بھی وہ بھیگی راتوں میں خوفزدہ ہو جاتی۔ ماما گل ایسے موسم میں ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی تھیں۔ یہ بات خاندان کے تمام افراد جانتے تھے۔ اکثر بوڑھی خواتین ہم عمر لڑکیوں کو ورشا سے دور رکھتی تھیں۔ ان کے خیال میں یہ کوئی عاشق مزاج جن تھا۔ جو بس

بھیگتے دنوں میں آ جاتا تھا۔ سب ہی لوگ جانتے تھے کہ ورشا اپنا رول ہے۔ ورشا کے ساتھ کی لڑکیاں ایک ایک کر کے سب رخصت ہو چکی تھیں۔ ماما گل حیرت سے دیکھتیں اور دل میں کانٹا سا چبھ جاتا۔ ورشا نے ایم اے کر لیا تھا اور وہ گھر میں خالی وقت جہاں آرا کے ساتھ گزار رہی تھی۔ کبھی کبھی تو ماما گل تنگ آ کر اس کو خود سے الگ کر دیتی تھیں۔ اس کے دوستوں کا حلقہ بہت کم تھا۔ صرف ایک نیلو تھی جو کبھی کبھی آ جایا کرتی۔ ان پرانی گزری ہوئی باتوں میں نیلو خود ہی جہانزیب کا ذکر کرتی وہ جو اتنے سال گزر جانے کے باوجود ہمیشہ برتھ کارڈ پوسٹ کرتا تھا۔

''سویٹ زیب!'' نیلو یہ کہتے ہوئے ورشا کی آنکھوں میں جھانکتی۔

''پگلی۔'' وہ گھور کر کہتی۔

اس کے علاوہ اس کی پرانی یادوں میں کوئی ہنگامہ کوئی احساس نہ تھا۔ لیکن پھر ایک دن اچانک جہانزیب آ گیا۔ پہلے تو پہچان ہی نہ ہو سکی۔ وہ پہلے سے زیادہ اسمارٹ لگ رہا تھا۔ ورشا کے خوابوں سے زیادہ۔ جہاں آرا کو ایسا لگا جیسے وہ سزا کے اس سمندر کو عبور کر چکی ہیں۔ جو ان کے سامنے پچیس سال سے پھیلا ہوا ہے اور پھر جہانزیب کی ماں ثروت بیگم نے جہاں آرا کی ڈیوڑھی کی ڈھول لے ڈالی۔ ماما گل کو ہاں کرنی پڑی لیکن دل کے سناٹوں میں ایک خوف سا چھا گیا تھا کہ کہیں ورشا پھر نہ اپنے ماضی میں پلٹ جائے حالانکہ کافی حد تک وہ اب ٹھیک تھی۔ جہاں آرا نے آہستہ آہستہ خود کو الگ کر دینا چاہا لیکن ورشا ماں کے ساتھ سونے کی عادی ہو چکی تھی۔ اسے آج بھی ماں کے ساتھ لپٹ کر سونے میں مزا آتا۔ اسی لئے آج اس کے کمرے میں رفعت سو رہی تھی۔ اس کے باوجود وہ چیخ پڑی حالانکہ رفعت اس کے بیڈ پر ہی تھی۔ ماما گل کے چہرے پر کرب کی پرچھائیاں تھیں۔ دل کے دروازے کھل گئے تھے اور ان سے اندیشے جھانک رہے تھے اور انہیں ایک ہی خیال آ رہا تھا۔ پیر مرشد نے کہا تھا کہ اسے کبھی اکیلا مت چھوڑنا اور کبھی اس کی شادی کے بارے میں مت سوچنا ورنہ نقصان اٹھاؤ گی۔ وہ دل سے اس بات کو تسلیم کر چکی تھیں ورشا پر کسی جن کا سایہ ہے۔ نماز پڑھتے ہوئے وہ آخری سجدے میں سزا جزا کے اسی دوراہے پر پہنچ جاتی تھیں لیکن جلد ہی نکل آتی تھیں اور خود ہی کہہ اٹھتی تھیں۔ نہیں میں نے کچھ نہیں کیا۔ جہاں آرا نے کمرے میں جھانک کر دیکھا ورشا جاگ رہی تھی۔

"خدارا میری بیٹی پر رحم کردے، یہ کب تک یونہی جاگتی رہے گی۔" صبح کے دس بج رہے تھے۔

دروازے کو آہستہ سے ماما گل نے کھولا لیکن، بیڈ پر درشا نہیں تھی۔ انہوں نے سارا گھر چھان مارا لیکن وہ کہیں نہیں تھی۔ ان کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہی ہوا جس کا انہیں ڈر تھا کہ اچانک درشا غائب نہ ہو جائے۔ رفعت نے اٹھ کر یوں بستر پر نظر ڈالی، جیسے کوئی چھوٹی سی چیز کہیں گم ہو گئی ہے۔

"پھوپھی جان! سونے دیں، ساری رات درشا نے سونے نہ دیا اور صبح ہی صبح آپ نے جگا دیا۔" سارے گھر میں پھر ایک خاموشی چھا گئی۔

"درشا لاپتہ ہے۔" ماما گل تو دل تھام کر بیٹھ گئیں اور اس کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتی تھیں۔ گھر میں مہمان بھرے ہوئے تھے۔ سب حیران پریشان کہ درشا کو کہاں دیکھیں؟ ماما گل کا روتے روتے برا حال تھا، سب ہی لوگ انہیں تسلی دے رہے تھے لیکن وہ تھیں کہ پچھلی باتیں یاد کر کر کے آنسو بہائے جا رہی تھیں۔

عادل ممانے ہر ایک سے فون کر کے پتہ کر لیا تھا۔ ماما گل مایوسی کے عالم میں اپنی ماں سے بول رہی تھیں۔

"اماں جانی آپ کو یاد ہے میں نے کتنے دکھ اس درشا کے لئے اٹھائے ہیں، پچیس سال سے میں چاندی شاہ کی چوکھٹ پر ہر نوچندی جمعرات کو ایک تولہ چاندی کا نذرانہ دے رہی ہوں۔" یہ کہتے کہتے ان کی آنکھیں پھر آبدیدہ ہو گئیں۔ اماں جانی نے پیار سے ان کے سر کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ ان کی بوڑھی آنکھوں میں حوصلہ ابھی تک زندہ تھا۔

"ارے کیسے صبر کروں سوچا تھا کہ درشا امریکہ بیاہ کر چلی جائے گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پیر چاندی شاہ نے بھی سات ہی سمندر پار بیاہ کرنے کو کہا تھا۔" وہ پھر ایک بار آنسوؤں سے رونے لگیں۔

رفعت جہاں بارہ بجے کمرے سے تولیے سے منہ کو صاف کرتی ہوئی نکلی تو سب کے چہرے اترے ہوئے تھے۔

"کیا ہوا؟" وہ گھبرا گئی صولت نے اسے گھور کر دیکھا اتنی بڑی قیامت گھر میں گزر گئی اور وہ ہے کہ اب سو کر اٹھی ہے۔ جہاں آرا کے جگانے کے بعد وہ دوبارہ سو گئی تھی۔ درشا کے نام پر وہ چونک گئی۔

"کیا ہوا درشا کو؟" مگر پھر تھوڑی ہی دیر میں سب سمجھ میں آ گیا تھا۔ رفعت کی ہنسی رکنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی بمشکل اس نے اٹکتے ہوئے کہا۔

"میں نیند میں تھی۔ درشا نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا تھا۔ جہانزیب کا رات فون آیا تھا۔ اسے کچھ شاپنگ کرنی ہے اور خود درشا کو کچھ بات کرنی ہے۔ میرے خیال میں درشا وہیں گئی ہے۔ نعیم بھائی نے انہیں ڈراپ کیا ہوگا۔ میں نیند میں تھی۔" یہ کہتے ہوئے جہاں آرا کی طرف دیکھ کر سنجیدہ ہو گئی۔

ماما گل کے سرد ہاتھوں میں گرمی آ گئی۔ ان کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔ سب نے رفعت کی طرف دیکھا۔ وہ سر جھکائے ہنسے جا رہی تھی۔ شادی میں شرکت کرنے بھارت سے آئی ہوئی بی بی خالہ حیرت سے اس طرح رفعت کو کھی کھی کرتے ہوئے دیکھ رہی تھیں، جس کا دوپٹہ ہنستے ہنستے گر گیا تھا۔ انہیں یہاں کی دنیا عجیب سی لگ رہی تھی۔ انہوں نے دل میں کئی بار توبہ کی کہ شادی سے پہلے لڑکی، لڑکے سے ملنے چلی گئی۔ درشا نظریں نیچی کیے ہوئے گھر میں داخل ہوئی تو وہ ماما گل کی قہر آلود نظروں کا سامنا نہ کر سکی۔ بی بی خالہ نے جلدی سے اپنے دوپٹے کو درست کیا۔ وہ درشا کے سامنے احترام سے بیٹھ گئیں وہ ہر وقت درشا کے قریب رہتی تھیں۔ رفعت نے حیرت سے بی بی خالہ کی آنکھوں میں شرارت سے جھانکا تو بی بی نے اپنی نظریں درشا سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"اے بی بی کیا میں فاتر العقل لگتی ہوں؟" اس پر رفعت کی ہنسی پھر بے اختیار ہوتی چلی گئی۔ اس کی ہنسی کے دورے کو کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ شام کے اندھیرے اترنے لگے تھے، لوبان کی بھینی اور پھر تیز خوشبو پھیل گئی۔ بی بی خالہ نے درشا کی طرف مڑ کے دیکھا جو رفعت کا ہنسی میں ساتھ دے رہی تھی۔ بی بی خالہ اور قریب آ گئیں۔ ان کا خیال تھا بس اسی وقت درشا پر جن آ گیا ہے۔ جو رفعت کے ساتھ ہنسے جا رہی ہے۔ انہیں بھی جہاں آرا سے چاندی شاہ کی کرامات معلوم ہو چکی تھیں۔ بس انہیں ایک لگن تھی کسی طرح سے کچھ ایسا مل جائے کہ ان کا اکلوتا بیٹا بہو کے چنگل سے آزاد ہو جائے اور پھر وہ چاندی شاہ کی کرامات انڈیا جا کر سنائیں۔ فرش پر سفید چاندنی بچھی تھی سب ہی لوگ کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔ لڑکیوں نے ڈھول سنبھال لیا تھا۔ رفعت نے صولت سے کچھ کہا۔ پھر رفعت نے بی بی سے کہا۔

"بی بی اگر کچھ مانگنا ہے تو صولت سے مانگیں، اس کے اوپر جن آتے ہیں۔" رفعت نے اپنے سر میں

ہو کر کہا کہ بی بی کو یقین آ گیا۔

''بس وہ چار آپ قوالی یا گانے سنا دیں اور پھر دیکھیں کس طرح سے صولت پر حال آتا ہے۔'' صولت خاموش بیٹھی رہی۔رفعت نے خود ہی مشورہ دیا۔

''بی بی وہ سنا دیں۔فنا کے سمندر میں یا وہ پھر خاک چھن چھن کر گرے گی۔'' بی بی نے ڈھول سنبھال کر لہک لہک کر جو گایا تو صولت اپنی ہنسی کو چھپائے جھومنے لگی۔

''بی بی اب مانگیں جو مانگنا ہے۔'' رفعت نے بی بی کے ہاتھ آہستہ سے دباتے ہوئے کہا۔ بی بی نے جھومتی ہوئی صولت سے کہا۔

''اچھے میاں ہمیں کچھ عطا کرو۔''

''بی بی آپ اس وقت الائچی مانگیں۔'' رفعت جھٹ بولی تو بی بی نے صولت کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا۔صولت نے مٹھی میں دبی الائچی بی بی کے ہاتھ میں رکھ دی تو بی بی کے ہاتھ پھر تیزی سے ڈھولک پر چلنے لگے اور دوسری طرف رفعت کی ضبط کی ہوئی ہنسی پھوٹ پڑی۔

''ہوش میں رہو بی بی یہ تمہیں بے وقوف بنا رہی ہے۔'' منا جی نے چھالیہ کترتے ہوئے کہا تو بی بی کے ہاتھ رک گئے۔صولت اور رفعت لوٹ پوٹ ہو کر ہنس رہی تھیں، ورشا تو مارے ہنسی کے اپنا پیٹ پکڑے بیٹھی تھی۔نعیم بھائی ہنستے ہنستے بے حال ہو گئے تو انہیں کھانسی آنے لگی۔وہ جلدی سے باہر نکل گئے۔رفعت کی ماں نے ڈانٹ کر کہا۔

''چپ ہو جاؤ رفعت۔'' لیکن اب وہ بھی اپنی ہنسی نہ روک سکیں، بی بی روہانسی ہو کر ایک طرف بیٹھ گئی تھیں۔سارے دن کی کوفت جو آج ورشا کی وجہ سے ہوئی تھی ختم ہو گئی۔ماما گل بھی اپنا چہرہ لڑکیوں کی طرف سے موڑ کر ہنس رہی تھیں۔پھر ہر روز بی بی سے انڈین ڈھولک گیت سنتے سنتے وہ دن بھی آ گیا۔

''ہمارے گھر سے دلہن سادے کپڑوں میں جائے گی۔'' یہ جہاں آرا نے ورشا کی سسرال والوں کو بتلا دیا۔پہلے تو بہت سخت اعتراض ہوا آخر کار وہ لوگ مان گئے۔ماما گل نے پیر صاحب کا حکم سب کو سنا دیا کہ نکاح مغرب سے پہلے کرنا اور دلہن سادے کپڑوں میں رخصت ہوگی۔ورنہ خیر نہیں۔ہر ایک نے حیرت سے سنا اور چپ رہا۔

''چاندی شاہ کی خانقاہ پر اصلی گھی سے چراغاں کیا جائے گا۔صدقے کے تین بکرے بھجوا دو۔'' ماما گل آغا میاں کو ہدایت دے کر اندر چلی گئیں اور آغا میاں یوں بیوی کی ہدایت پر دوڑے کہ چشمہ گرتے گرتے بچا۔ نکاح سے پہلے زبردستی ورشا کو ماما گل چاندی شاہ کی چوکھٹ پر سر لگانے کو لے گئیں۔چاندی شاہ نے کھونٹی سے لٹکتی ہوئی لوہے کی زنجیر کو اپنے ماتھے سے لگا کر ورشا کی آنے والی قسمت کا حال ماما گل کو بتا دیا کہ سات سمندر پار کوئی خطرہ نہیں ہے۔ تو بی بی کی سانس رک کی رہ گئی۔

''آپ میرے مائی باپ ہیں حضور، ہم پر بھی کچھ رحم کریں۔'' بی بی نے دونوں ہاتھ ان کے سامنے جوڑ دیئے۔تو چاندی شاہ نے پھر ایک بار زنجیر کو حرکت دی اور ماتھے سے لگا کر کہا۔

''بول کیا مانگتی ہے؟''

''حضور میرا بیٹا۔'' ان کی سانس ابھی تک رکی ہوئی تھی۔

''وہ اس وقت گھر میں نہیں ہے۔'' تو بی بی کی سانس واپس آ گئی اور بولیں۔

''میکے لے گئی ہوگی۔'' زنجیر کو ماتھے سے گھستے ہوئے کہا۔

''نہیں وہ لوگ وہاں بھی نہیں ہیں۔'' یہ الفاظ بی بی کو چکرا گئے۔

''بس آپ دعا کریں۔'' یہ کہتے ہوئے بی بی نے ہاتھ سے چاندی کے دو چھلے اتار کر ان کے قدموں میں ڈال دیئے۔جنہیں پیر و مرشد نے اٹھا کر زمین پر پھینک دیا۔

''بس چلو تمہارا کام ہو گیا۔'' ماما گل نے اٹھتے ہوئے کہا اور وہ عقیدت سے الٹی چلتی ہوئی خانقاہ سے باہر آ گئیں۔ماما گل جب گھر پہنچیں تو بری کے جوڑے آ چکے تھے ہری ہری مہندی چاندی کے پیالوں میں گھلی ہوئی رکھی تھی۔رفعت نے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہائے ورشا جانی کہ یہ مہندی تمہاری قسمت میں نہیں۔'' مہندی کی مہک شبنم کے قطروں کی طرح تمام رات ورشا کے خوابوں میں بکھرتی رہی عجیب سی رات تھی سب کے ہاتھوں میں مہندی اور دلہن کے ہاتھ سادے تھے۔رفعت بار بار دلہن کی مخروطی انگلیاں پکڑ کر کہتی۔

''کتنا ارمان تھا کہ میں ورشا کی مہندی کا پھوپھی گل سے نیگ لوں گی۔'' لڑکیاں کچھ دیر کے لئے اگر رک جاتیں تو بی بی خالہ ماحول میں اپنی آواز کا جادو جگائے رکھتی تھیں اور بڑے ٹھسے سے کہتی۔

''تمہاری عمروں کی جب میں تھی تو اکیلے رات بھر گاتی تھی۔'' تو زینت کہتی۔

''بی بی مکرر ارشاد۔'' اور بی بی خالہ جھوم جھوم کر بغیر سُر تال کے گائے جاتیں۔ درشا کا سادے کپڑوں میں نکاح اور پھر رخصتی کی تیاری ہوئی۔ رفعت درشا سے لپٹ کر روئے چلی جا رہی تھی۔ نعیم بھائی نے بہت آہستہ سے کہا۔

''آپ اب انہیں اجازت دیں اور انشاء اللہ ست رہئیں۔ ہم آپ کا بھی جلدی پروگرام سیٹ کریں گے۔'' تو روتے روتے درشا اور رفعت دونوں ہنس پڑیں اور پھر ڈھیروں دعاؤں تلے درشا رخصت ہونے لگی۔ ماما گل نے تعویذوں اور گنڈوں سے درشا کو محفوظ کر دیا۔ جہانزیب اور درشا ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے سہارے گاڑی تک آئے، بی بی خالہ نے بلائیں لیں اور ماما گل نے اس کے مستقبل کی دعا دی۔ سخت پردے کے تحت نندوں نے درشا کو اتارا۔ ہر کوئی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بے تاب تھا۔ موی نے بڑی ممانی کو ہٹاتے ہوئے کہا۔

''جی نہیں جب تک میں درشا بھابھی کو سجا نہیں لوں گی۔ اس وقت تک کوئی رسم نہیں ہوگی۔'' اور پھر موی اور سب لڑکیاں مل کر درشا کے میک اپ میں لگ گئیں۔ درشا مارے گھبراہٹ کے بار بار اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھ رہی تھی لیکن موی بھلا کب چھوڑنے والی تھی۔ موی نے اپنی اکلوتی بھابھی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''بھابھی چیز ہی ایسی ہیں کہ جن کیا ہمارے بھیا عاشق ہو گئے۔'' درشا گلابی کمخواب کے غرارہ سوٹ میں ایک ہنگامہ لگ رہی تھی۔ ماتھے پر تاج اور پیشانی پر افشاں اس کی گلابی رنگت کو جگمگا رہے تھے وہ جھجکی بیٹھی تھی۔ موی نے اس کے کان میں کہا۔

''بھابھی ذرا سامنے دیکھیں۔ اس اتنی دور کا جن آپ کو کس طرح سے تک رہا ہے۔'' اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا تو جہانزیب کھڑے مسکرا رہے تھے اور پھر ہنس کر کہا۔

''اسی لئے تو اڑا کر لے آیا۔'' روز و شب انتہائی مصروفیت میں گزر گئے کبھی دعوت کبھی کوئی گھر میں تقریب۔ درشا کے سہمے ہوئے چہرے پر شادابی آ گئی تھی۔ جو ماما گل کے اطمینان کا باعث تھی۔ تین ماہ پلک جھپکتے گزر گئے۔ درشا نے گلے لگتے وقت رفعت سے کہا۔

''رفعت آج لگ رہا ہے کہ میں رخصت ہوئی ہوں۔'' اور پھر ماما گل کے گلے لگ کر رو پڑی۔ سب ہی لوگ اسے سی آف کرنے ایئرپورٹ پر موجود تھے۔ جب درشا سب سے مل کر چلی گئی تو ماما

گل کو یوں لگا جیسے سارے موسم ایک پل میں بیت گئے۔ جب تک وہ گھر میں تھی وہ ایک ایک دن کا حساب رکھتی تھیں اور انہیں ایسا لگتا تھا کہ بتیس سال نہیں بتیس صدیاں گزر گئیں اور جب وہ چلی گئی تو یوں لگا جیسے بہار کا ایک جھونکا تھا جو گزر گیا۔ ایک پل تمام رتوں کو سمیٹے ہوئے تھا اور وہ ہاتھ مل کے رہ گئیں۔

☆☆

درشا نے اپنے بالوں کو برش کر کے پن اپ کیا اور اپنی یادوں سے نکل آئی، جہاز نیویارک ایئرپورٹ پر لینڈ کرنے والا تھا۔ اس کے سامنے جگمگاتا ہوا اجنبی شہر تھا۔ اس کے وجود سے اپنے وطن کی مہک ابھی تک آ رہی تھی، ہر چیز اجنبی تھی۔ جہانزیب بار بار باہر کی طرف دیکھ رہے تھے، اور پھر تھوڑی ہی دیر میں بھیا گاڑی لے کر آ گئے اور وہ بائی کار فلاڈلفیا کے لئے روانہ ہو گئے۔ مطلع ابر آلود تھا پھر بھی روشنی نظر آ رہی تھی۔ ہلکی ہلکی دھوپ پھوار بن کر گر رہی تھی۔ صاف شفاف سڑکیں تیز رفتار گاڑیاں۔ سرخ اور سفید عنابی عمارتوں پر ہرے ہرے درختوں سے دھوپ چھن کر گر رہی تھی۔ کہیں کہیں بادلوں کے بڑے بڑے ٹکڑے آوارہ گھوم رہے تھے۔ گاڑی بہت تیزی سے سفید، سفید بادلوں کو اور ہرے درختوں کو چھوڑتی ہوئی گزر رہی تھی۔ تا حد نظر پھیلے ہوئے بادلوں کے سلسلے ختم ہو گئے تھے گاڑی کی رفتار بھی کم ہو گئی تھی کچھ ہی دیر میں یہ لوگ ڈاربی پہنچ گئے۔ انگلینڈ کی طرز پر بنے ہوئے سرخ اینٹوں کے مکانات کی قطار شروع ہو گئی تھی جو دیکھنے میں تقریباً ایک جیسے تھے اگر مکان کی نمبر پلیٹ سامنے نہ ہوتی تو مشکل سے پہچانا جاتا۔ پھولوں کی خوبصورتی رات کے ملگجے اندھیروں میں چھپ گئی تھی۔ سفید جالیوں سے آنے والی روشنی بل کھاتی ہوئی سڑکوں پر دور سے نظر آ رہی تھی اور دو گھنٹے مسلسل ڈرائیو کرنے کے بعد گھر آ گیا۔ درشا کو فلاڈلفیا آئے ہوئے ایک ہفتہ گزر گیا تھا اس کا خوبصورت گھر ڈاربی میں تھا۔ آج موسم بہت ہی خوشگوار تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی وہ قریب ہی ولکو میں شاپنگ کرنے گئی تھی۔ واپسی پر ہلکی پھوار میں وہ اپنے گھر آ گئی لیکن جب وہ پانی کے بجل اور باریک قطروں کو اپنے چہرے سے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے پونچھ رہی تھی۔ اسے ایسا لگا کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ کپکپائی لیکن جلد ہی اس نے اپنے اس خوف پر قابو پالیا اور برش رکھ کر وہ تیزی سے نیچے ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ ونڈو سے اس نے جالی کا پردہ ہٹا دیا۔ پھوار کے باوجود

دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ورشا نے ٹک ٹک کرتی ہوئی گھڑی پر نظر ڈالی۔ شام کے سات بج رہے تھے لیکن پھر بھی سڑکوں پہ یوں روشنی تھی، جیسے پاکستان میں چار بجے ہوں سورج کی روشنی نے اس کے خوف کو کم کر دیا تھا۔ جہانزیب جاب سے واپس آنے والے تھے۔ وہ بہت بے چینی سے ٹہل کر انتظار کرنے لگی۔ خوف نے دل میں آہستہ آہستہ دستک دی تھی لیکن اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ پوری قوت ارادی کے ساتھ خوف سے اپنا دفاع کر رہی تھی۔ اس کے باوجود اس کے دماغ کی رگوں میں کھنچاؤ محسوس ہو رہا تھا۔ کال بیل پر وہ چونک گئی اور کچھ دل کو ڈھارس ہوئی۔ جہانزیب جاب سے واپس آچکا تھا۔ اس نے بہت مسکرا کر اپنے خوف کو چھپا دینا چاہا لیکن اس کے چہرے کی رنگت تبدیل ہو چکی تھی۔ جہانزیب نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ہم لوگ آج باہر کھانا کھائیں گے۔'' تو وہ چونک گئی۔ اس کے اس انداز پر اس نے ہنس کر کہا۔

''کیا بات ہے تم کچھ پریشان ہو؟''

''نہیں تو۔'' اس نے بہت مسکرا کر کہا لیکن دل کی دھڑکن ابھی تک تیز تھی۔ رات کے حسین ستارے آسمان سے غائب تھے۔ ان کی جگہ کالے کالے بادل چاند کو چھپانے کی ناکام کوشش میں مصروف تھے۔

رات کا کچھ حصہ اس کی پلیٹر پر اترا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ باہر جا کر کھانا کھایا جائے یا پھر گھر پر۔ جہانزیب کے بے حد اصرار پر وہ لرزتے قدموں سے چلتی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اس نے ایک بار بھی نظر اٹھا کر اس شریر سیاہ بادل کے ٹکڑے کو نہیں دیکھا جو چاند کے گرد چکر لگا رہا تھا۔ جہانزیب نے اس کے دل کی کیفیت جان لی تھی، لیکن اس نے کوئی اہمیت جان کر نہ دی۔ وہ سارا دن سہمی رہتی۔ پھر کبھی لان میں مصروف رہتی جہانزیب کی غیر موجودگی میں سارا کام نمٹا دیتی تاکہ وہ پھر دوبارہ آکر تنہائی نہ فیل کرے۔ بیسمنٹ میں تو آکر وہ بہت زیادہ خوفزدہ ہو جاتی بس ہر لمحہ یہی دھڑکا لگا رہتا کہ کوئی پیچھے سے آکر تہہ خانے کا دروازہ بند کر دے گا، اس نے کمروں کے پردے بند کر دیئے تھے۔ جہانزیب شام کو آکر کھول دیتا تو وہ پھر بند کر دیتی۔ اس نے تقریباً اب گھر سے نکلنا بند کر دیا تھا۔ روز بروز اس کی صحت گر رہی تھی اس کے آنکھوں کے حلقے بتاتے کہ وہ سارا دن ایک پل کے لئے آرام نہیں کر سکی۔ جہانزیب کو بہت زیادہ فکر تھی کہ آخر اسے تکلیف کیا ہے۔ اسے ایسا لگا جیسے کوئی

اس کے بیڈ کو آہستہ آہستہ ہلا رہا ہے۔ جہانزیب نے ڈاکٹر کو دکھایا تو پتہ چلا کہ لو بلڈ پریشر ہے لیکن اس کے دل کو کوئی خاص اطمینان نہ ہوا وہ پھر بھی ہر لمحہ گھبرائی اور سہمی ہوئی رہنے لگی۔ بارش کے شور سے اس نے اپنے کمرے کے دروازے بند کر لئے لیکن دل کا دریچہ کھلا تھا۔ جہاں سے وہ تمام آہٹوں کو سن سکتی تھی۔

☆☆

ورشا کو گئے ہوئے تین ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا تھا۔ ماماگل نے تمام پرانے اور نئے کام کر ڈالے لیکن وقت ٹھہرا ٹھہرا لگتا ہر وقت وہ خدا سے دعا مانگا کرتیں کہ ان کی بیٹی خیریت سے رہے۔ بی بی خالہ اب واپسی کی تیاریوں میں لگی ہوئی تھیں۔ آکا میاں ہر وقت ایزی چیئر پہ بیٹھے پیر ہلاتے رہتے ان کی بھی سوچوں کا محور ورشا تھی۔ ہر ہفتے خط پا کر بھی دوسرے دن سے انتظار شروع ہو جاتا تھا۔ آسمان پہ بادل گھر آئے تو ماماگل نے دزدیدہ نظروں سے آکا میاں کی طرف دیکھا جو بار بار رقص کرتے ہوئے بادلوں کو دیکھ رہے تھے۔ دونوں کے دل ایک ساتھ لرزتے ''لیکن ضروری تو نہیں کہ وہاں بھی بارش ہو۔'' دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے بات کی، اور بی بی کی موجودگی کا احساس کر کے ان کے پروگرام کے متعلق گفتگو کرنے لگے۔ بی بی خالہ دنیا جہاں کی شاپنگ کر کے آئی ہوئی تھیں تھکن کے مارے برا حال تھا، سفر کے خوف سے وہ پہلے ہی گھبرائے جا رہی تھیں لیکن اس کے باوجود پاکستانی کپڑا تھانوں کے حساب سے کھجرا لاتی تھیں۔ جو چیز دیکھتیں بس خرید لو یہ وہاں نہیں اور یہاں سستی ہے۔ ماماگل نے کواڑ کی آڑ سے پوسٹ مین کو آتے دیکھا تو فوراً ہی آکا میاں کے پاس پہنچ گئیں۔ تیز رفتاری سے گزرتی ہوئی ماماگل کہتی چلی گئیں۔

''ورشا کا خط آیا ہے۔'' آکا میاں کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے ماماگل نے اپنا دل تھام لیا۔ بی بی کے دل کی حرکت تیز ہو گئی اور پھر خط آکا میاں نے ماماگل کے ہاتھ میں ڈال دیا۔ جہاں آرا نے ایک نظر اپنے شوہر پہ ڈالی جو بہت بے چینی سے ٹہل رہے تھے اور پھر خط پر نظریں جم گئیں۔

''ورشا سخت بیمار ہے، اسے ہر وقت یہ وہم ہے کہ کوئی اس کے ساتھ ہے یا پھر کوئی پردے کے پیچھے جھانک رہا ہے ذہنی کوفت اور تنہائی سے وہ شاید ڈر گئی ہے۔ یہاں پر اچھے ڈاکٹروں کا علاج ہو رہا ہے۔'' اس کے بعد کے الفاظ دھندلا گئے اور بی بی نے اپنے سر کو ہلا کر کہا۔

"خدایا رحم کر، ہاں بھی وہ پہنچ گیا۔" ماما کے ضبط کا بندھن ٹوٹ کر کاغذ کو بھگو گیا۔ آ کا میاں باہر چلے گئے۔ انہیں ایک راستہ دکھائی دیا چاندی شاہ اور پھر جہاں آرا نے خانقاہ پر جا کر جو ماتھا ٹیکا ہے تو آنسوؤں سے ان کا چہرہ تر ہو گیا۔

"مشکلات میں نہیں گھبراتے۔" یہ ان کے پیرو مرشد کی آواز تھی۔

جہاں آرا پچیس سال سے اس در پر ماتھا ٹیک رہی تھیں لیکن کسی کو پتہ نہ چلا لیکن آج ان کی فریاد سوالی تھی۔ جو ہر اک کے کان تک پہنچ رہی تھی۔

"مت گھبرا۔" یہ کہہ کر پیرو مرشد نے زنجیر کو ماتھے سے رگڑا اور ارشاد کیا۔

"میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔ تم اب گھر جاؤ۔" جہاں آرا نے اپنی مراد لکھ کر چوکھٹ پر ڈال دی اور خود چلی آئیں۔ تمام رات ان کو نیند نہ آئی۔ مسلسل پھیلے ہوئے عذاب میں گھری رہیں کہ ان سے کون سی غلطی ہوگئی ہے جو ان کی اکلوتی لاڈلی کو سزا مل رہی ہے۔ انہوں نے سزا اور جزا کو انصاف کے پلڑے میں رکھ کر تولا لیکن ہر بار خود کو بری پایا۔ کبھی کبھی کوئی احساس ان کے بوڑھے جسم میں کپکپی پیدا کرتا، تاہم پھر وہ مطمئن ہو کر تسبیح کے دانے گھمانے لگتی تھیں۔ آ کا میاں بھی خاموش تھے، آج انہیں ورشا یاد آ رہی تھی۔ پھر اچانک پتہ نہیں ورشا کو یاد کرتے کرتے وہ کہاں ہو گی، اس خیال سے وہ ہول گئے جلدی سے انہوں نے پانی کا ٹھنڈا گلاس لے کر اپنے دل کے اندیشوں کو ٹھنڈا کر دیا۔ جہانزیب جاب سے جلدی گھر واپس آ جاتے لیکن ورشا کی صحت خوف کی وجہ سے گرتی جا رہی تھی۔ اسے ہر وقت ماما گل کے آنچل سے اٹکے رہنے کی عادت ہو گئی تھی۔

"دیکھو باہر کتنا خوبصورت موسم ہے۔" جہانزیب نے گاڑی کے وائپر چلاتے ہوئے کہا تو ورشا نے بہت سہم کر ایک نظر ڈالی۔

"جہانزیب میں نے اپنی پوزیشن پہلے واضح کر دی تھی۔"

"میں نے کوئی اعتراض کیا؟"

"وہ ٹھیک ہے لیکن پھر بھی میری وجہ سے تم خاصے ڈسٹرب ہو۔"

"جی نہیں۔" اس نے گاڑی کو روک دیا۔ سامنے میکڈونلڈ تھا۔ وہ دونوں اتر کر اندر چلے گئے۔ اکثر ہی وہ رات کا کھانا کھانے یہاں آ جاتے تھے۔

"ورشا تم اس حقیقت کو خود تسلیم کر لو کہ تم تنہا ہو اور تمہارے ساتھ کوئی نہیں۔"

"ہر کوشش کے باوجود میں ناکام ہوں۔" وہ ایک چھوٹے سے برگر کے ٹکڑے کو کھاتی رہی، آج اسے بالکل بھوک نہیں تھی نہ ہی موڈ تھا۔ جہانزیب کے بے حد اصرار پر چلی آئی تھی۔ زرد ساڑھی میں اور بھی پیلی نظر آ رہی تھی۔ جہانزیب اسے مستقل مصروف رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"دن میں تم جب تنہا ہوتی ہو تو اس وقت لکھا کرو۔"

"میں ایک بار پھر یاد دلا دوں کہ میں لفظوں کو کوئلے میں بدل نہیں سکتی۔"

"لیکن تم ان کی سیاہی دور کر سکتی ہو۔" ورشا نے انکار میں سر ہلایا تو جہانزیب کو وہ بہت ہی بے بس اور معصوم سی گڑیا لگی جو سارا دن سہمی ہوئی کمرے میں بند رہتی ہے اور شام کو تھوڑا سا سانس لیتی ہے۔

"مجھے یاد آیا تمہارا افسانہ 'بھیگی رتوں میں'۔"

"تم اسے بھول جاؤ، وہ صرف ڈائری کا ایک صفحہ تھا۔" ورشا نے چونک کر دیکھا۔

"لیکن وہ کاپی میں نے سنبھال کر رکھی ہے اور ہماری تمہاری دوستی کی بنیاد بھی وہی افسانہ تھا۔"

"جہانزیب اب گھر چلتے ہیں۔" ورشا نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔

"ابھی سے! کل تو ویک اینڈ ہے اس شہر میں رت جگے ہیں اور تم....." اس نے گھڑی کی طرف دیکھا اور معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

کتنی دیر تک جہاں زیب ورشا کو لیے ماضی کے دریچوں میں جھانکتا رہا لیکن ہر بار وہ بہت خوبصورتی سے باہر نکل آئی کیونکہ ڈاکٹر جان جو یہاں کا بہت بڑا ماہر نفسیات تھا اس سے جہاں زیب ملے تھے اور ورشا کا علاج ہو رہا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق کوئی بچپن کا حادثہ یا خوف ہے جو ذہن کو متاثر کر گیا ہے۔ ورشا کی طرف سے جہانزیب خاصے پریشان تھے آج کل وہ کچھ زیادہ ہی خاموش تھی۔ جہاں زیب کی موجودگی میں وہ ٹھیک رہتی۔ اس کے بعد ہر لمحہ وہ خوفزدہ رہتی۔ بیسمنٹ میں کسی کام سے نیچے گئی تو وہ خوف سے سہم گئی۔ اسے ایسا لگا جیسے کوئی شیشے کے پیچھے کھڑا ہے اس کی تقریباً چیخ نکل گئی۔ جہانزیب نے اسے بہت تسلیاں دیں۔ پردہ ہٹا کر دکھایا لیکن بے سود۔

"جہانزیب میں نے خود دیکھا ہے۔"

"تمہارا وہم ہے۔"

''نہیں۔''اس کے آنسو گالوں پر ڈھلک آئے۔

''ٹیک اٹ ایزی۔'' جہانزیب نے اسے بیڈ پر لٹایا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ سارا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ ورشا کی گرتی ہوئی حالت دیکھ کر اسے مزری کوڈیا اسپتال میں داخل کروا دیا گیا۔ ڈاکٹروں کی کوششوں سے وہ نارمل ہو گئی تھی۔ جہانزیب بھی خوش تھا۔ ورنہ واپسی کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ ویسے بھی ماما گل کا فون پر فون آ رہا تھا کہ اسے جلدی واپس بھیج دو، لیکن جہانزیب نے انہیں اطمینان دلایا کہ یہاں اس کا علاج ہو رہا ہے، مزری کوڈیا اسپتال میں جب جہانزیب ملنے گئے تو ورشا بھی خوش تھی کہ دو ہفتے کے بعد گھر جا رہی ہے۔

''ہاں تمہارے نام دو خط آئے ہیں۔ میں لانا بھول گیا۔''

''گھر چل کر پڑھ لوں گی۔'' اس کے چہرے سے تمام تھکن دور ہو چکی تھی۔ آنے والی زندگی کے تصور میں کھوئی تھی۔ موسم پھر آج ابر آلود تھا۔ لیکن وہ بالکل نارمل تھی۔ جہانزیب کے چہرے پر اطمینان اور سکون تھا وہ پہلے سے بہتر ہے۔ اس نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''کیا حالت ہو رہی ہے۔'' تو جہانزیب نے گھبرا کر بیڈ کی چادر ٹھیک کرنی شروع کر دی۔

''ہاں وہ خط کہاں ہیں؟'' اس نے ٹیبل سے خط اٹھاتے ہوئے کہا۔

''دیکھئے جناب میں نے تو کھولا بھی نہیں۔''

''شکریہ۔'' پہلا خط رفعت کا تھا۔ جس میں اس نے اس کی بیماری کے بارے میں فکر اور پریشانی ظاہر کی تھی اور ڈھیروں دعائیں دی تھیں اور آخری جملے پر ورشا اپنی ہنسی نہ روک سکی، لکھا تھا۔

''سنا ہے کہ آج کل ورشہوار جہانزیب کا پاؤں بھاری ہے۔'' ورشا نے ہنستے ہنستے وہ خط زیب کو دے دیا۔ دوسرے خط کی تحریر پر کچھ دیر کے لئے وہ حیران ہوئی پھر پڑھنے لگی۔ خط کی آخری سطروں پہ اس کے لب کپکپائے اور چہرے کا رنگ زرد ہو گیا، اس کے ہلتے ہوئے ہونٹ کہہ رہے تھے۔

''عطیہ آپا، عطیہ آپا۔'' اور اس کے بعد وہ کچھ نہ پڑھ پائی۔ جہانزیب نے گھبرا کر اسے لٹا دیا۔

''ورشا! میں ابھی سارے پردے بند کر دیتا ہوں۔ یہاں کوئی نہیں ہے۔'' لیکن آواز بہت دور سے آئی۔

''عطیہ آپا!'' اس کے آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے سارے

وجود کو کسی نے پانی میں بھگو دیا ہو۔ اس کا وہ افسانہ ''بھیگی رتوں میں'' جس کے شائع ہونے پر وہ گھبرا گئی تھی۔ کتنے دنوں تک وہ آکا میاں اور ماما گل سے نظریں چرائے رہی تھی اور پھر اس میگزین کو اس نے چھپا دیا تھا۔ آج چھپائے ہوئے میگزین کو اور زندگی کے تمام اوراق کو عطیہ آپا کے خط نے اس کے سامنے بکھیر دیا تھا وہ سمیٹ رہی تھی لیکن اس کے ذہن میں دھند چھانے لگی، پھر اسے ایسا لگا کمرے کی سبز مدھم روشنی میں جہانزیب کو تنہا چھوڑ کر ننگے پاؤں بادلوں میں اڑتی ہوئی اس چوکھٹ پر اتر گئی جہاں اس کے ساتھ عطیہ آپا تھی۔

☆☆

ننھے ننھے پرندے مدھر گیت الاپ رہے تھے اور وہ تتلیوں کے پیچھے بھاگ رہی تھی، سامنے سے آتی ہوئی عطیہ آپا نے اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

''یہ تو پھولوں میں اچھی لگتی ہیں۔'' انہوں نے اس کے ہاتھ سے تتلی کو آزاد کر دیا۔ نرم و نازک خیالات کی مالک عطیہ آپا اسے ڈھیر سا پیار کرتے ہوئے سمجھانے لگیں۔

عطیہ آپا کی بھینی بھینی خوشبو سے وہ مانوس تھی۔ رات اس وقت تک وہ نہ سوتی جب تک عطیہ آپا اسے کوئی کہانی نہ سناتیں۔ پہلی بار نناجی سے اسے پتہ لگا کہ عطیہ آپا کی ماما گل سگی ماں نہیں ہیں تب اس نے انہیں بہت پیار سے دیکھا اور گردن کے پیچھے سر چھپا لیا۔ کہتے ہیں۔ عطیہ آپا آکا میاں کی طرف سے بری کے جوڑے میں سج کر آئی تھیں اور پھر وہ اس گھر میں ٹک کر رہ گئیں۔ آکا میاں گھر داماد بنے اور عطیہ آپا زر خرید غلام، سارا سارا دن کام کرتیں لیکن آکا میاں کچھ زیادہ ہی جہاں آرا کی دولت سے متاثر تھے۔ عطیہ آپا ان کی زندگی سے یوں نکل گئیں جیسے کبھی وہ ان کے باپ ہی نہ تھے یا پھر اپنی ذمہ داریوں کا بوجھ جہاں آرا پر ڈال کر خود سبکدوش ہو گئے تھے اور جہاں آرا سیاہ سفید کی مالک بنی۔ عطیہ آپا کی جوانی کو چکی میں پیس رہی تھیں اور آکا میاں آنکھیں بند کئے سب کچھ دیکھتے اور خاموش رہتے۔ ان کے اندر اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ اپنی چہیتی بیگم کا ہاتھ پکڑ سکیں۔ ایک بار طیش میں آ کر بیگم کا ہاتھ پکڑا۔

''اس طرح تو کوئی جانور کو بھی نہیں مارتا۔''

اس پر جہاں آرا نے سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔ نناجی، عادل ماما چھوٹی خالہ سارے کے سارے محاذ پر

آ گئے تھے۔ جہاں آرا نے تو اپنے ہاتھ کی ساری چوڑیاں توڑ دیں۔ گویا وہ بیوہ ہیں۔ اس پر آ کا میاں سٹپٹا کر رہ گئے اور عطیہ آپا اپنی دکھتی ہوئی پیٹھ لیے باورچی خانے میں چلی گئیں۔ کھل کر رو بھی نہیں سکتی تھیں۔ پیاز کترنے کی آڑ میں دل بھر کر روئیں۔ دوپٹے سے اپنی آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے ان کی نظریں گلابی گلابی ورشا کے حیرت زدہ چہرے پر پڑیں تو انہوں نے اس سہمی ہوئی لڑکی کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

''پیاز کا پانی چلا گیا تھا۔''

سارا گھر ہی بھوکا تھا اور عطیہ آپا ماما گل کے بھیجے ہوئے حکم کے مطابق کھانے کی تیاریاں کرنے لگیں۔ عادل مما بار بار باورچی خانے کا چکر لگا رہے تھے۔ ننا جی نے ماما گل سے نظر چرا کر کہا۔

''چپ ہو جا بس کر۔'' تو عطیہ آپا کے آنسو ایک بار پھر نکل پڑے۔

''اگر نہیں روتے بنتا تو میں رلواؤں۔'' یہ الفاظ جہاں آرا کے تھے۔ عطیہ آپا نے اپنے آنسوؤں اور ناک کو صاف کیا پھر چاول چھننے لگیں۔ آ کا میاں بے بسی سے ٹہلتے ہوئے باہر چلے گئے۔ عطیہ آپا نے کھانا لگایا عادل مما مسکرا مسکرا کر کھاتے رہے۔ خود وہ باورچی خانے میں برتن دھوتی رہیں۔ معلوم نہیں کب تک انہوں نے کام کیا اور کب سوئیں۔ یہ تو عطیہ آپا کا معمول تھا۔ ہاں زیادہ رحم اس وقت ماما گل کو آتا جب عطیہ آپا ان کے بتائے ہوئے پیٹرن پر جھکی ہوئی سلائی کر رہی ہوتیں۔

''عطیہ کپڑے اچھے سیتی ہے۔'' تو آ کا میاں مسکرا کر جہاں آرا کی طرف دیکھتے اور عطیہ ہمدردی کا ایک بول سن کر اور تیزی سے مشین چلانے لگتی۔ آج بھی ورشا ننا جی کے موٹے سے روئی کے لحاف میں دبکی ہوئی ان سے کہانی سن رہی تھی کہانی خاصے ڈراؤنے حصے میں تھی۔ وہ اپنی سانس روکے ہوئے تھی۔ بھاری لحاف جو پتہ نہیں ننا جی کب سے استعمال کر رہی تھیں۔ جس کا وزن ہر سال بڑھ جاتا اور ننا جی اس کے پھٹے حصے پر دوسرے رنگ کا کپڑا چڑھا دیتی تھیں اور ہر سال اسی طرح اس کے وزن میں اضافہ ہو جاتا سانس روکے ہوئے ورشا ننا جی کے اور قریب ہو گئی۔ ایک زوردار آواز کے ساتھ کوئی چیز باورچی خانے میں گری اور پھر جہاں آرا کی آواز رات کی خاموشی میں سنائی دی۔ ننا جی رک گئیں۔ ورشا کی سانس بھی رک گئی۔ اس نے مشکل سے اس لحاف سے خود کو نکالا۔ باورچی خانے کے سامنے پیلے پیلے چاول بکھرے پڑے تھے جہاں آرا کے ہاتھ میں چمٹا اور دوسرے ہاتھ میں عطیہ

آپا کی چوٹی۔ ننا جی نے مشکل سے ہاتھ چھڑایا۔ جہاں آرا کی اجازت کے بغیر انہوں نے خاموشی سے ایک پلیٹ چاول نکال کر جہاں آرا کی پھوپھی کو دے دیئے تھے۔ بس یہ تھا قصور خود تو ماما گل، خوان بھر بھر تمام عمر دیتی رہیں لیکن آج یہاں اشرفیاں لٹیں کوئلوں پر مہر والی بات تھی۔ ورشا کو عادل مما پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ اداس تھی کہ عادل مما عطیہ آپا کی پٹائی پر ہنستے رہے۔ ننا کو اس نے تشکر کی نظروں سے دیکھا۔ جنہوں نے جہاں آرا کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ ماما گل بھی عجیب تھیں۔ مارتی بھی تھیں اور رونے بھی نہیں دیتی تھیں۔ عطیہ کو یوں آنسو بہاتے دیکھا تو ہاتھ پکڑ کر برآمدے سے باہر کر دیا اور اندر کے دروازے بند کر دیئے کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ اندر کا دروازہ کھول دے۔ عطیہ آپا باہر بیٹھی روتی رہیں۔ جب خود ہی خیال آیا تو نکل کر باہر آئیں دو چار دار لگاتے اور کہا۔

''چلو اندر تمہاری بہت لگی تھیں۔'' اور عطیہ آپا بغیر کچھ بولے ہوئے اندر آ گئیں۔ یہ مہربانی اس ننھی سی ورشا کی تھی جس نے رو رو کر اپنا برا حال کر لیا تھا۔ بس ایک رٹ تھی عطیہ آپا کو اندر لائیں ورنہ ان کو باہر جن لے جائے گا اور عطیہ کو دیکھ کر یوں لپٹ گئی جیسے برسوں کی بچھڑی ہوئی تھی۔ پھوپھی کو آ کا میاں نے پھاپھا کٹنی کا خطاب دیا تھا اس پر اکثر ماما گل ناراض ہو جاتی تھیں۔ لیکن آ کا میاں اکثر و بیشتر ان کی آمد پر یہ الفاظ دہراتے تھے۔

''مجھے پھاپھا کٹنی کا اس طرح گھر میں آنا پسند نہیں۔''

ورشا نے دیکھا کہ نفرتوں کے بیچ پھاپھا کٹنی اور عادل مما کچھ زیادہ ہی مہربان ہیں۔ پہلے تو وہ عادل مما سے سخت ناراض رہتی کہ عطیہ آپا کی پٹائی پر وہ ہنستے کیوں ہیں؟ لیکن اس نے کچھ دنوں سے محسوس کیا کہ وہ ہمدرد ہیں اور عطیہ آپا سے ماما گل کی غیر موجودگی میں اچھا سلوک کرتی ہیں اور عطیہ آپا ماما گل کی آنکھ بچا کر چاول، دال، آٹا وغیرہ پھاپھا کٹنی کو دیتی تھیں اور ہمیشہ جہاں آرا کی غیر موجودگی میں عادل مما کا سارا کام عطیہ آپا کیا کرتی تھیں جس پر کبھی ماما گل نے اعتراض نہیں کیا بلکہ ہمیشہ خوش رہیں۔ عطیہ آپا کے کئی رشتے آئے اور ماما گل نے ڈھنگ سے جواب بھی نہیں دیا بلکہ الٹا عطیہ آپا بہت دکھی لگتی تھیں۔ ننا جی ہمیشہ ہمدردی کے بول کہتی تھیں۔ آج کی رات بہت سرد تھی۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا بجلی کا نظام درہم برہم ہو گیا تھا۔ لوگ ٹھنڈ اور اندھیرے کے احساس سے جلدی گرم گرم لحافوں میں جا چکے تھے لیکن ورشا کو نیند نہیں آ رہی تھی۔

''عطیہ آپا رک کیوں گئیں؟ سنایئے نا وہ کہانی سنہرے بالوں والی شہزادی کی جس نے چندن کے پیڑ پر پناہ لے رکھی تھی۔''

''تم اب جلدی سے سونے کی تیاری کرو کہانی ختم۔''

''نہیں۔'' اس نے ان کی بانہوں میں اپنا سر چھپا لیا۔

''پھر کیا ہوا؟'' عطیہ آپا کو اس نے اپنی طرف کر لیا جو پتہ نہیں دوسری طرف اپنا چہرہ کر کے کیا سوچ رہی تھیں۔

''پھر ہونا کیا تھا لوگ آ کر کہتے رہے۔

سوناری سونا اتر کیوں نہ آ چندن پھول دھرے کملائیں۔'' عطیہ آپا پھر خاموش ہو گئیں۔

''آپا بتایئے ناں آگے کیا ہوا؟''

''بس یہی کہ چندن پیڑ بڑھتا چلا گیا اور آخر میں درخت سمیت شہزادی زمین میں چلی گئی۔'' تو درشا نے سہم کر اپنا سر ان کے قریب کر لیا۔

''سچ آپا۔'' اس نے اپنی سانس روکتے ہوئے پوچھا۔

''اچھا چلو جلدی سے سو جاؤ آنکھیں بند۔ ورنہ سامنے کھڑکی سے موٹا کالا جن جھانکے گا۔'' تو اس نے سہم کر آنکھیں سختی سے بند کر لیں اور عطیہ آپا بہت آہستہ سے اسے سلام کر کے چلی گئیں۔ اکثر رات کو عطیہ آپا اسے اسی طرح سلاتی تھیں اور وہ خوف سے آنکھیں بند کئے سو جاتی تھی۔ پھاپھا کٹنی پتہ نہیں کیا چپکے چپکے ننا جی سے اور پھر عطیہ آپا سے باتیں کرتیں۔ جس پر ہمیشہ عطیہ آپا کے چہرے پر رنگ آ جاتا۔ دھیرے دھیرے پھاپھا کٹنی زیور اور نقدی بھی حاصل کرنے لگی جس کا علم ننا جی کو تھا جس کے بدلے عادل مما کو تر لقمہ ملتا۔ ساری ملائی عادل مما کے حصے میں آتی۔ چپکے چپکے خاص چیز عادل مما کو کھلاتیں۔ جہاں آرا کو یہ بات بھلی لگتی کہ ان کا چھوٹا بھائی تر لقمے اڑا رہا ہے۔ اس پر عطیہ آپا سے کبھی باز پرس نہیں کی گئی۔ آنکھ بند کر کے عطیہ آپا، ننا جی، مما اور چھوٹی خلو پر لٹا سکتی تھیں۔ عطیہ آپا کو اب کم مار پڑتی۔ ہر کام وقت پر، پھر بھی کبھی نہ کبھی انہیں ناکردہ گناہوں کی سزا ماما گل دینے سے باز نہ رہتی تھیں اور عطیہ آپا اپنی پھوٹی قسمت پر آنسو بہا کر سو جاتی تھیں۔ جہاں آرا ہر برائی کو خاندانی جتلانے کی عادی ہو چکی تھیں اور آ کا میاں سننے کے لئے سر جھکائے رہتے۔ آج پھر عطیہ آپا کو کوئی دیکھنے کے

لئے آ رہا تھا۔ ننا جی نے ماما گل سے کہہ دیا تھا۔

''اب جو بھی ہے فیصلہ کر دو۔''

''ہاں اتنا آسان ہے کہ میں فیصلہ کر دوں۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے؟'' عطیہ آپا باورچی خانے میں کام کرتے کرتے رک گئیں۔ شاید انہوں نے ماما گل کا جواب سن لیا تھا۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا یہ ماما گل کا ذاتی معاملہ تھا کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

''درشا ماما گل کیا باتیں کر رہی ہیں؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' یہ کہتے ہوئے درشا نے ان کی بھیگی ہوئی آنکھوں میں جھانکا تو عطیہ آپا نے مرچ کا بہانہ کرتے ہوئے منہ دوسری طرف کر لیا۔ آج کا سورج بھی ناامیدی میں گزر گیا۔ ننا جی کی خاموشی اور عطیہ آپا کی اداسی سے پتہ لگتا تھا۔ عطیہ آپا کی بڑھتی ہوئی عمر دوسروں سے رحم کی طالب ہو رہی تھی لیکن ایک ماما گل تھیں کہ نہ کوئی غم نہ فکر بس ایک ہی جواب تھا کہ ایسی جلدی بھی کیا ہے عطیہ آپا وقت کی چکی میں سالوں پستی رہیں۔ عادل مما، ننا جی اور پھاپھا کٹنی کی محبتوں کا بھرم ایک دن کھلا گھر میں بہت خاموشی تھی۔ آ کا میاں ماما گل سے نظریں چرائے چرائے پھر رہے تھے اور ماما گل آتے جاتے عطیہ آپا کو جو منہ میں آ رہا تھا کہہ رہی تھیں۔

''تو یہ گل کھلائے بسورتی صورت نے۔'' عطیہ آپا ماما گل کے قدموں میں سر رکھے رو رہی تھیں۔

''ماما گل معاف کر دیں۔''

''دور ہو جا میری نظروں سے۔''

''ماما گل صرف ایک بار میری بات سن لیں۔''

''اگر دوبارہ تمہارے منہ سے عادل کا نام نکالا تو؟'' انہوں نے اپنے پیر ہٹا لئے۔ عطیہ آپا زمین پہ بیٹھی روتی رہیں۔ عطیہ آپا کا جرم ناقابل معافی تھا۔ پورے گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ عادل مما گھر سے غائب تھے۔ ننا جی نے اپنا دامن صاف بچا لیا تھا کہ انہیں کوئی علم نہیں۔ پھاپھا کٹنی کے گھر کے دروازے بند تھے۔ عطیہ آپا آج کے دن تنہا تھیں اور آج ماما گل کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں تھا۔ عطیہ آپا سہمی ہوئی ایک کونے میں بیٹھی تھیں۔ درشا نے عطیہ آپا کے پاس جانا چاہا تو ماما گل نے ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔

"یہ اس قابل نہیں ہے۔" درشا نے کونے میں سہمی ہوئی عطیہ آپا کو دیکھا جو اپنا سر جھکائے بیٹھی تھی۔
عطیہ آپا کے چہرے پر ماما گل کی انگلیوں کے نشان تھے اس دن اسے آکا میاں پر بہت غصہ آرہا تھا۔
جو بے بسی کے عالم میں برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ اس کا دل چاہا کہ عطیہ آپا سے وہ پوچھے کہ آج
آپ کا کون سا جرم ایسا ثابت ہوگیا لیکن وہ ماما گل کے خوف اور ماحول کی عجیب سی کیفیت کے تحت
ایسا نہ کرسکی۔ بس اسے اتنا پتہ تھا کہ آج عطیہ آپا نے خود بھی کوئی جرم قبول کرلیا ہے جس کی پاداش میں
ماما گل نے انہیں لہولہان کردیا ہے۔ اس رات گھر میں ایک خوف سا چھایا رہا۔ درشا سہمی ہوئی لحاف
میں گھس گئی۔ جب تک درشا جاگتی رہی۔ وہ ماما گل اور آکا میاں کی باتوں پر کان لگائے رہی۔ پسینے
سے اس کا برا حال تھا لیکن پھر بھی یوں ہی لیٹی رہی گویا وہ سورہی تھی۔ ماما گل کی آہستہ آہستہ آواز پر
کان لگائے لیکن پھر بھی اسے پتہ نہ لگ سکا کہ آج کیا ہوگیا ہے۔ عادل ماما لاپتہ تھے ہر کوئی عطیہ آپا کو
رحم کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ عطیہ آپا کے جبڑے سے نقاہت ٹپک رہی تھی۔ ماما گل نے انہیں ایک کونے
میں نعمت خانے کے پیچھے پرانی دری ڈال دی تھی۔ عطیہ آپا دن رات اب وہیں پر بیٹھی یا لیٹی رہتیں۔
درشا سے ماما گل پوچھا کرتیں۔

"عطیہ کو کوئی پوچھ رہا تھا۔"

"ہاں ماما گل سامنے والی خالہ پوچھ رہی تھیں۔"

"کیا؟"

"تمہاری عطیہ آپا کی کیا طبیعت خراب ہے؟"

"تو پھر تم نے کیا جواب دیا؟"

"میں نے کہا مجھے نہیں معلوم تو پھر کہنے لگیں کہ تمہارے عادل ماما کہاں ہیں؟"

"اچھا تو گویا سارا قصور عادل کا ہے۔ یہ خود بے حیا اور ڈھیٹ تھی۔" عادل ماما کی فکر سب سے زیادہ
ماما گل کو تھی۔

"عطیہ آپا عادل ماما کہاں ہیں؟"

"خدا کرے اسے موت آجائے جہاں بھی ہو۔" پہلی بار عطیہ آپا کے منہ سے ایسے الفاظ سن کر درشا
سوچ میں پڑگئی۔ گویا اس قصور میں عادل ماما بھی شامل ہیں۔ ورنہ عطیہ آپا اس طرح سے دامن

پھیلا کر نہ کوستیں۔ عطیہ آپا نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا لیکن ماما گل عادل پر ایک حرف بھی نہیں
آنے دے رہی تھیں۔ ماما گل کو عادل کی فکر کھائے جارہی تھی۔ عطیہ آپا ان کی سختی کی زد میں تھیں۔ ہر
آنے جانے والے کی نظر عطیہ آپا کو تلاش کرتی لیکن عطیہ آپا آج کل گوشہ نشین تھیں گھر میں افراتفری
تھی۔ کھانا ہوٹل سے آرہا تھا۔ سب کھانا کھا چکے تو آکا میاں کو ہاتھ دھوتے وقت پتہ نہیں کیسے عطیہ کا
خیال آگیا۔

"ارے اس بدنصیب کو بھی کچھ دے دو۔"

"ہاں رکو۔ ابھی اچھوانی کا پیالہ بھجواتی ہوں۔" آکا میاں کی نظریں جھک گئیں اور ماما گل نے نفرت
سے دیکھا۔

"اب جو ہوا درگزر کرو قصور دونوں کا ہے۔"

"ہاں یہ تو بہت بھولی تھی۔" آکا میاں دو بول کہہ کر بہت پچھتا رہے تھے۔ رات درشا پھر سانس
روکے لیٹی رہی ماما گل اور آکا میاں کی باتیں سننے کے لئے پتہ نہیں کیا بات آکا میاں نے آہستہ سے
کہی جس کے جواب میں ماما گل نے اپنا سر لحاف سے نکالتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو یہ پلان تھا۔ عمر بھر ہمارے سینے پر مونگ دلے گی۔ سوال ہی نہیں ہوتا میں اس کا عادل سے
بیاہ کردوں ایسا ہی ہے تو کسی کنجڑے قصائی کے ساتھ بیاہ دو۔"

"بکومت۔" جہاں آرا اتنی جلدی میاں سے ہار ماننے والی نہیں تھیں۔

"ارے اس کے کرتوت تو ایک ایک کو معلوم ہوچکے ہیں۔ سب کو جتلانے والی خود جہاں آرا تھیں۔ تھو
تھو ہورہی ہے۔"

"تو تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کروں؟"

"جو دل چاہے کرو لیکن اب وہ یہاں نہیں رہے گی میری بیٹی بڑی ہورہی ہے اس پر غلط اثر پڑے گا۔"

"میری بھی وہ بیٹی ہے۔ اس بدنصیب کے بارے میں سوچو جس نے تمہاری دن رات خدمت کی
ہے۔" جہاں آرا کا غصہ عروج پر پہنچ چکا تھا۔

"تو گویا وہ مظلوم ہے میں اس پر ظلم کررہی ہوں۔"

"آہستہ بولو۔" جہاں آرا کی آواز اور اونچی ہوگئی۔

''جہاں آرا خدا کے واسطے میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''ہرگز نہیں۔''

''تم لوگ جس خاندان کے ہو وہ تمہاری بیٹی نے ناک کٹوا کر بتا دیا ہے۔''

''جہاں آرا۔'' آ کا میاں کی آواز میں شدید غصے کی جھلک تھی۔

''جہاں آرا میں دیکھ سب سکتا ہوں لیکن کہہ نہیں سکتا۔''

''نہیں آج سب کہہ دو، جو کہہ نہیں سکے اپنی لاڈلی کی طرفداری میں۔''

''ارے اس بدنصیب کو تو میں نے برسوں سے پیار نہیں کیا۔ ہر وقت خادموں کی طرح باورچی خانے کی ہو کر رہ گئی تھی۔''

''ہاں ہاں وہی تو سارا گھر چلا رہی ہے۔'' جہاں آرا بہت زور سے چلائیں۔ لحاف میں دبکی ہوئی ورشا ان کی آواز پر کانپ گئی۔ جو عطیہ سے لپٹی ہوئی تھی۔

''جہاں آرا بیگم میں روز روز کی کل کل سے تنگ آ گیا ہوں۔''

''تو جاؤ اپنی چہیتی کو لے جاؤ جہنم میں جہاں دل چاہے۔'' آ کا میاں بہت غصے سے اٹھے۔

''آج میں قصہ ہی ختم کر دیتا ہوں۔'' انہوں نے اپنی دونالی بندوق اٹھائی۔

''میں اسے لے جا کر کسی ویرانے میں ختم کر دیتا ہوں۔'' جہاں آرا نے کوئی اہمیت نہ دی بلکہ بے یقینی سے شوہر کی طرف دیکھا جو غصے سے باہر نکل گئے تھے۔ ورشا نے سہم کر لحاف کے اندر عطیہ آپا کو پکڑنا چاہا لیکن وہاں ان کی جگہ تکیہ تھا وہ سہم کر لحاف سے لپٹ گئی۔ ''عطیہ آپا!'' اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ آہستہ سے اس نے باہر منہ نکالا۔ تو سامنے بائیں باغ میں کھلنے والی کھڑکی کے بائیں طرف کوئی اسے کھڑا نظر آیا۔ اس نے جلدی سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ آ کا میاں نے عطیہ آپا کو ہر جگہ تلاش کیا اور پھر تیزی سے باہر آواز کی سمت بڑھے لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے عطیہ آپا باؤنڈری پھلانگ چکی تھیں۔ آ کا میاں اپنی گن اٹھائے ہوئے چاروں طرف آواز دیتے رہے لیکن ان کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ اس نے ثنا کو آواز دی۔ ماما گل پہنچ چکی تھیں۔

''جہاں آرا دیکھو یہ خوف سے نیلی ہو رہی ہے۔''

''ارے کیا ہوا؟''

''وہ۔'' اس نے ماما گل سے لپٹتے ہوئے پردے کی طرف اشارہ کیا۔

''کہاں؟ یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔'' لیکن اس نے اپنی آنکھیں نہ کھولیں۔ لاکھ جہاں آرا نے کوشش کی لیکن وہ خوف سے نڈھال ہو چکی تھی۔ آ کا میاں سردی کے باوجود پسینہ پونچھتے ہوئے آ گئے تھے۔ جہاں آرا کی خوف سے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ ان کے انداز سے ایسا لگ رہا تھا جیسے آج وہ فیصلہ کر کے آ گئے ہیں۔ پھر آ کا میاں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا رکا ہوا سیلاب بہہ نکلا تو ثنا جی نے اپنا دل تھام لیا۔

''ارے ہے عطیہ کو مار دیا۔'' تو ورشا ماں سے اور زور سے لپٹ گئی۔ گھر میں عجیب سوگواری چھا گئی تھی۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ سردی کی لہر اور بارش کے شور نے آ کا میاں کے دل کی دنیا کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

''میں ایک بار پھر دیکھتا ہوں۔'' ٹارچ روشن کرتے ہوئے وہ جہاں آرا سے مخاطب ہوئے تو سب کی جان میں جان آئی کہ عطیہ آپا زندہ ہیں۔ پھر وہ اٹھ کر تیز ہواؤں میں نکل کر چلے گئے۔ جہاں آرا اب کچھ شرمندہ سی بیٹھ گئیں۔

''جہاں آرا اسے لٹا دو۔'' ثنا جی نے ورشا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اماں یہ بہت خوفزدہ ہے مجھے چھوڑ ہی نہیں رہی۔'' صبح تک سب لوگ جاگتے رہے۔ آ کا میاں ایک ایک گلی کوچے میں عطیہ آپا کو تلاش کرتے رہے۔ شاید خوف اور موسم کی خرابی کے باعث کسی کونے میں پناہ لے رکھی ہو۔ عطیہ آپا بائیں باغ میں کھلنے والی کھڑکی سے لگی ہوئی اپنی قسمت کے ہونے والے فیصلے کو سن رہی تھیں کہ وہاں دونوں کے درمیان گرما گرمی شروع ہو گئی۔ آ کا میاں کے ہاتھ میں گن دیکھ کر وہ تیزی سے اپنی جان بچانے کے لئے گھر سے باہر نکل گئیں۔ دروازے پر کھڑی وہ ابھی سوچ رہی تھیں کہ آ کا میاں کے قدموں کی آواز پر وہ دوڑ کر دوسری گلی میں چھپ گئیں۔ ٹارچ کی روشنی اور آواز پر وہ پیچھے مڑنے کے بجائے آگے بڑھتی چلی گئیں۔ بارش میں بھیگتی ہوئی چلی گئیں۔ کچھ ہی دور جا کر لوبان اور اگربتیوں کی خوشبو پر وہ چونک گئیں۔ سامنے ایوان چاندی نظر آیا۔ یہ جگہ وہ اپنے بچپن میں دیکھ چکی تھیں۔ انہوں نے اسی درگاہ سے لوگوں کی خاص طور پر عورتوں کی عقیدت دیکھی۔ وہ خود بھی بہت مرعوب تھیں۔ کئی بار بچا بچا کئی نے ذکر بھی کیا تھا۔

"ارے عطیہ تو کسی دن چاندی شاہ کے در پہ چل ہر مراد پوری ہو جائے گی۔ کیسے کیسے لوگ آتے ہیں اور مرادیں لے کر جاتے ہیں۔ میں کسی دن ان سے جا کر تیری بات کروں گی۔ وہ بس ایک چاندی کا چھلہ دیں گے بس پھر دیکھنا کہ جہاں آرا عادل کے لئے تجھے تیرے باوا سے مانگ لے گی۔" اور یہ الفاظ میٹھے سروں میں عطیہ کے دل میں اتر جاتے اور وہ اپنی نوازشیں تیز کر دیتی کہ عادل تو صرف اس کا ہے اور اسی لئے وہ دھوکا کھا گئی۔ دل میں عقیدت کا جذبہ جاگ اٹھا اور اس نے جھکتے ہوئے دو پٹے کو درگاہ شریف کے قریب کھڑے ہو کر نچوڑا اور سر پہ ڈال کر دروازے کی چوکھٹ پہ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ رات کافی ہو چکی تھی اس لئے پیر و مرشد جا چکے تھے۔ صرف مریدوں کے ذمے صفائی باقی تھی۔ لوبان اور اگربتی ٹھنڈی ہو چکی تھی لیکن ہوا میں ابھی تک اس کی خوشبو بس رہی تھی۔ دربارِ عام بند ہو چکا تھا اور دربارِ خاص کھلا ہوا تھا۔ جہاں پر پیر و مرشد کے اپنے اہلِ خانہ جمع تھے اور دن کا حساب کتاب ہو رہا تھا۔ پیر چاندی شاہ کی صبح ہو رہی تھی ان کی تو پانچ بجے صبح کو رات شروع ہوتی تھی اور دن پانچ بجے شام کو نکلتا تھا۔ کسی خادم نے جا کر اطلاع دی تو نیک سیرت اور بلند اخلاق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انہوں نے عطیہ کو اپنی چوکھٹ دربارِ عام پر بیٹھنے کا حکم دے دیا اور خود اہلِ خانہ میں گھرے ہوئے گھنٹے دو گھنٹے کے بعد انہیں خیال آیا تو وہ اس طرف گئے۔ عطیہ نیند سے بوجھل آنکھوں کو لئے دل میں ایک آس لگائے سہمی ہوئی تخت کے پائے سے لگی ہوئی بیٹھی تھی۔ پیر و مرشد نے اپنے سر پہ کلمے لکھی ہوئی سرخ ٹوپی رکھی اور اپنے پان سے رنگے ہونٹوں کو صاف کیا اور اندر دوسری سمت تشریف لے گئے۔ سہمی ہوئی عطیہ کھڑی ہو گئی اور پھر ان کے پیر پکڑ لئے اور منہ سے کچھ نہ بول سکی۔ صرف آنسو بولتے رہے۔ پیر چاندی شاہ نے عطیہ کو اپنے قدموں سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا خدا سے آس رکھ اور مجھ پہ بھروسہ کر۔" اور پھر کھڑی ہوئی خادمہ سے کہا۔

"اسے دربارِ خاص میں لے جاؤ اور اس کا خیال رکھو۔" کنیز نے حکم کی تعمیل میں گردن کو ہلایا اور چاندی شاہ نے اسے اشارے سے کچھ کہا۔ عطیہ بھیگے کپڑوں سے آنسو پونچھتی ہوئی اس کے ساتھ اندر چلی گئی اور کبھی نہ کھلنے والا دروازہ بند ہو گیا۔ عطیہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا لیکن اب اس بھول بھلیاں میں آ کر اسے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ راستہ کدھر سے جائے گا۔ ہوا میں لوبان وغیرہ کی خوشبو مہک رہی تھی رات کو مخروطی موٹی شمعیں روشن تھیں۔ سونے چاندی میں لدی پھندی کنیز خاص گھوم رہی تھی۔ جو

"دیوانِ عام" اور "دیوانِ خاص" کے درمیان رابطہ تھی۔ سخت قسم کا پردہ تھا کوئی نامحرم اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک دوسرے سے کنیزیں جو پیر چاندی شاہ کی مریدیں تھیں رابطہ رکھے ہوئے تھیں۔

☆☆

عطیہ کو یہاں آئے ہوئے چار دن گزر گئے تھے اس کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ پیر چاندی شاہ خود جب باہر کی محفل برخاست ہو جاتی تو براہِ راست اس سے گفتگو کرتے عطیہ کے لئے یہ سب سے محفوظ پناہ گاہ تھی اور وہ دل سے عقیدت مندوں میں شامل ہو چکی تھی۔ اسے عام مریدوں کی طرح یہ شرف حاصل ہو چکا تھا کہ پیر چاندی شاہ کے پیر دبائے۔ ان کے چھوٹے موٹے کام کرے۔ چاندی شاہ کی چاروں بیویاں اکٹھی ہوتیں تو پہلی خاندانی بیوی مسکرا کر تینوں کو دیکھتی اور وہ تینوں عطیہ کو نفرت سے اور پھر ان تینوں میں سے دوسرے نمبر والی رشیدہ کو پیر و مرشد نے طلاق دے دی۔ احکامِ شریعت کے مطابق چار سے زیادہ نکاح جائز نہ تھے۔ اس لئے انہوں نے طلاق دے دی اور اس طرح سے وہ گھر میں ایک نامحرم لڑکی کو نہیں رکھ سکتے۔ اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے انہوں نے عطیہ سے بھی نکاح کر لیا اور عطیہ بھی ان عورتوں میں شامل ہو گئی جنہیں حالات اور وقت نے خود چاندی شاہ کے قدموں میں لا کر ڈال دیا تھا۔ ضرورت مندوں اور حاجت مندوں کا ہجوم عطیہ کے لئے حیرت کا باعث تھا عطیہ کو سب سے بڑی بیوی تاج شاہ نے اپنے ہاتھوں سے دلہن بنا کر سجا کر دوسرے کمرے میں منتقل کر دیا۔ عطیہ کی بجائے آج سے وہ "زرشاہ" کے لقب سے پکاری جانے لگی۔ عطیہ بھی انہی دیوانوں میں شامل ہو گئی جو خود اپنا راستہ کھو دیتے ہیں اور اب یوں بھی اسے کہاں جانا تھا۔ صبر شکر کا دامن تھام کر اتی بدکی ہو کر رہ گئی۔ گھر سے باہر کوئی شخص نہیں نکل سکتا تھا۔ بس ساری ضرورت کی چیزیں گھر ہی میں حاضر کر دی جاتی تھیں اور گھر سے باہر یعنی "دربارِ عام" سے لے کر "دربارِ خاص" تک رابطہ کا ذریعہ وہ مرید عورتیں تھیں۔ جو شاہ جی کے کاروبار میں برابر کی شریک تھیں۔ بھیس بدل کر جو لوگوں کا دن رات ہجوم کی شکل میں آنا جانا لگا رہتا اور نیازوں میں چاندی سونے کے چھلوں کے ڈھیر لگ جاتے۔ جنہیں چاندی شاہ اپنے پیروں سے ہٹا دیتے اور خدا سے ہاتھ اٹھا کر حاجت مندوں کے لئے دعا کرتے اور یہی مقبولیت کا وقت خاص تھا جب چاندی شاہ آتی دولت کو ٹھوکر مارتے اور خدا کے آگے ہاتھ اٹھاتے۔ عطیہ آیا پر سارا بھرم کھلتا جا رہا تھا لیکن ان کے پر ایک بار پھر کتر گئے تھے۔ وہ

اڑنا بھی چاہتیں تو بھی نہیں اڑ سکتی تھیں۔ مجبوراً وہ اس در کی ہو کر رہ گئیں۔ کئی بار دل میں خیال آیا خود کشی کر لیں لیکن ہر بار اس گناہ کو وہ عملی جامہ نہ پہنا سکیں۔ وہ اس دنیا میں تو جلنے کے لئے تیار تھیں لیکن تمام عمر وہ عذاب خداوندی نہیں سہہ سکتی تھیں۔ وہ اللہ کی دی ہوئی نعمت زندگی کو نہیں جھٹلا سکتی تھیں۔ اس لئے وہ ساری اذیتیں برداشت کر رہی تھیں کہ کبھی تو خدا ان پر رحم کھائے گا اور اس کے علاوہ کہاں جا سکتی تھیں۔ نجانے عطیہ جیسی کتنی حالات کی ماری لڑکیاں پناہ لیتی رہتیں اور چاندی شاہ کی چوکھٹ جگمگاتی رہتی۔ آ کا میاں عطیہ کے یوں چلے جانے پر خاموش رہنے لگے۔ کئی بار سوچا کہ اخبار میں دیں لیکن عزت کی وجہ سے وہ خاموش رہے۔ جہاں آرا لوگوں کے سوالات کے جوابات دیتے عادی ہو چکی تھیں۔

''ارے خالہ عطیہ کہاں ہے؟''

''وہ اپنی پھوپھی کے گھر رہنے گئی ہوئی ہے۔''

''کب آئے گی؟''

''پتہ نہیں۔''

آ کا میاں نے ان دنوں بھابجا کنی کا گھر آنا بالکل بند کر دیا تھا۔ عادل ممابے غیرت کتے کی طرح وہ چار دن بعد دم ہلاتے آ گئے تھے۔ خلو ہر ایک کو اکساتی رہتیں کہ ورشا سے پوچھو کہ تمہاری عطیہ آپا کہاں ہیں؟

''ورشا تمہاری عطیہ آپا کہاں ہیں؟''

''آ کا میاں نے انہیں جنگل میں لے جا کر گولی سے مار دیا۔'' جہاں آرا جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی تھیں اور خلو کو گھور کر دیکھتیں تو وہ شرمندہ سی وہاں سے چلی جایا کرتی تھیں۔ ورشا ہر وقت ماں کے آنچل سے لگی رہتی۔ اسکول سے آ کر سہمی ہوئی پیچھے پیچھے ماما کل کے ساتھ ساتھ رہتی۔ آ کا میاں گود میں اٹھائے ہوئے پھرتے لیکن وہ اس کمرے کی کھڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتی جہاں اسے اس رات شدید بارش اور سردی میں موٹا کالا جن نظر آیا تھا۔ عطیہ آپا دنیا والوں سے رشتہ توڑ کر چاندی شاہ کی ہو کر رہ گئی تھیں۔ 15 صفر کو بڑے چاندی شاہ کی بہت دھوم سے گاگر بھری گئی۔ عقیدت مندوں کا ایک ہجوم تھا۔ لوبان اور اگر بتیوں کی مہک نے ماحول کو بہت پر اسرار بنا دیا تھا۔ سبز کپڑوں

سے ڈھکے ہوئے گھڑے جن کے منہ پر گوٹا بندھا ہوا تھا۔ لوگوں کے درمیان میں رکھے ہوئے تھے۔ لوگ عقیدت سے پھول اور چادریں بڑے چاندی شاہ کے مزار پر ڈال رہے تھے۔ خواتین برہنہ پا، بال کھولے ہوئے اس پر اسرار ماحول میں جھوم رہی تھیں۔ بڑے شاہ کی دیوانی چھیناں ملنگنی ہزار ہزار دانوں کی تسبیحیں اپنے گلے میں حمائل کئے جھوم جھوم کر لہک لہک کر گا رہی تھی۔ لوگ اس کے قدموں میں نچھاور ڈال رہے تھے۔ منتیں ماننے والوں میں امیر غریب ہر طبقے کے لوگ شامل تھے۔ عطیہ آپا اور دوسری بیگمات چلمن سے لگی بیٹھی تھیں۔ کبھی کبھار دھوئیں کا جھونکا سامنے آ جاتا تو عطیہ آپا اپنی آنکھیں اور ناک رگڑ ڈالتی تھیں پھر پتہ نہیں کیا ہوا عطیہ آپا کو جیسے سکتہ ہو گیا۔ سامنے جہاں آرا، ورشا کا ہاتھ تھامے چاندی شاہ کے قدموں میں نچھاور ڈال رہی تھیں۔ نناجی منت کا چھلہ باندھ رہی تھیں اس کے بعد عطیہ آپا کو ایک چکر آیا مگر وہ سنبھل گئیں۔

گریہ ملنگنی نے انہیں بیٹھنے کی جگہ دے دی اور جہاں آرا چلمن سے لگی بیٹھی رہیں۔ عطیہ کی طرف ان کی پیٹھ تھی ویسے بھی اب عطیہ آپا پہلے جیسی نہیں تھیں۔ جو آڑ سے پہچانی جاتیں۔ تمام مرید جا چکے تھے۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ روپے، پیسے، چاندی اور قیمتی چادروں کا ڈھیر تھا۔ صرف فدا حسین اور گھر کے لوگ رہ گئے تھے۔ چاندی شاہ آج کی دولت کا اندازہ لگا رہے تھے۔ باقی افراد تھک کر سو چکے تھے۔ عطیہ آپا کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ ان کے اوپر گزری ہوئی ہر رات بہت آہستہ گزر رہی تھی یا پھر ٹھہر گئی تھی۔ پتہ نہیں کس طرح صبح ہوئی۔

''گریہ!''

''جی بی بی زر شاہ حکم۔''

''رات تم نے بڑی درگاہ میں جن بی بی کو جگہ دی تھی۔''

''ہاں ہاں وہ جو اپنی چھوٹی بچی کے ساتھ آئی تھیں۔'' وہ سوال سننے سے پہلے ہی جواب دینے کے لئے تیار تھی۔

''تم انہیں جانتی ہو؟''

''ہاں بی بی وہ عقیدت مندوں میں سے ایک ہیں۔ بڑے چاندی شاہ کی مرید ہیں۔ آج بھی وہ چھوٹے شاہ کو مانتی ہیں۔ ان کی بیٹی پر جن کا سایہ ہے۔'' اور گریہ کو جتنی معلومات تھیں۔ سب عطیہ آپا

کو کہہ سنائی۔ ان کی نظروں میں سہمی سہمی ورشا سارا دن گھومتی رہی۔ جو جن کے سائے کے خوف سے جہاں آرا سے چھٹی ہوئی تھی۔ عطیہ آپا کو پھر اس قید خانے میں پچیس سال گزر گئے تھے۔ یہاں کے ماحول سے وہ نفرت کرتی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر کہنا چاہتی کہ لوگو جو مانگنا ہے خدا سے مانگو، یہ بت پرستی ہے کہ تم لوگ اپنے جیسے انسان کے قدموں میں سر رکھ کر مانگتے ہو، یہ کفر، یہ بت پرستی ہے۔ لوٹ آؤ لوگو لوٹ آؤ لیکن ان کی آواز لوبان کے دھوئیں اور اگربتی کی مہک میں دب جاتی تھی۔ اور اب وہ گوشہ نشین ہو چکی تھیں۔

ان کا حجرہ جو اس حویلی کی پچھلی طرف تھا۔ لوگوں کو اس چوکھٹ سے بھی عقیدت پیدا ہو چکی تھی۔ جہاں وہ یاد الٰہی میں مصروف تھیں۔ ان کی جگہ کسی اور ستم زدہ لڑکی نے لے لی تھی۔ تو ہم پرست لوگ جب ان کی چوکھٹ پہ ماتھے آتے تو وہ نعوذ باللہ پڑھتی تھیں۔ چیخ چیخ کر اب ان پر ہسٹریائی دورے پڑنے لگے تھے۔ کتنے سالوں سے وہ زندگی کا ایک ایک لمحہ اذیت میں گزار رہی تھیں لیکن پھر بھی زندہ تھیں۔ لوگوں کو وہ ہاتھوں سے پیٹ ڈالتیں، خدا کے عذاب سے آگاہ کرتی تھیں لیکن پھر بھی لوگ صرف ان کی ایک جھلک، ایک دعا کو اپنی قسمت سمجھتے۔ لوگ ان کی مار اور ڈانٹ کو اپنی خوش نصیبی تصور کرتے۔ شام سے ہی ان کے حجرے کی چوکھٹ پر لوگ جن میں زیادہ تر عورتیں تھیں جمع ہو جاتیں اور عطیہ آپا کے بند دروازے سے لوگ آس لگائے رہتے۔ مانگنے والوں میں ایک دن پھر جہاں آرا بھی شامل تھیں جن کی فریاد سے عطیہ آپا کے بند دروازے کھل گئے تھے۔ لوگوں کے ہجوم میں گھری ہوئی عطیہ آپا اتنی بدل چکی تھیں کہ یقین دلانے کے باوجود کوئی نہیں پہچان سکتا تھا۔ گریہ نے جہاں آرا کو تسلی دی۔

"حوصلہ بی بی حوصلہ! دیکھو تمہاری صدا پر دروازے کھل گئے اور تمہاری فریاد سن کر بی بی نے دروازے پھر بند کر لیے۔ اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا۔ آپ حوصلہ رکھیں۔" جہاں آرا کی اکلوتی بیٹی موت و زندگی کے درمیان میں تھی۔ یوں بھی دور رہ کر انسان مصیبت میں خدا کے بعد اس کے نیک بندوں کی طرف رجوع کرتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انسان اسے بت پرستی کا ذریعہ بنا لے۔ جہاں آرا کے جانے کے بعد عطیہ آپا بہت دیر تک اپنی جائے نماز پر بیٹھی خدا سے آنسوؤں کے درمیان مانگتی رہیں۔ وہ بھیک جو انہیں ابھی نہیں ملی تھی۔ آج وہ بہت زیادہ کمزور

اور تھکی ہوئی لگ رہی تھیں۔ پھر انہوں نے گریہ سے جہاں آرا کی اور تفصیلات سنیں اسے خود بھی حیرت تھی۔ پھر اس نے انہیں، دوسرے دن ورشا کا ایڈریس لا کر دیا۔ جہاں آرا کو گریہ نے ہمت دلائی۔

"دیکھو بی بی جی تم پر کتنی مہربان ہیں۔ یہ سب میری کوششوں کا نتیجہ ہے۔" خدا کی یاد میں وہ کتنی دیر تک آنسو بہاتی رہیں۔ یہ خدا کو معلوم تھا۔ اس لمحہ تو انسان کے محسوسات ہی نہیں ہوتے کہ وہ خود کو محسوس کرے۔ عطیہ آپا سخت بے چین سی لگتی تھیں تمام وقت وہ روتی رہیں۔ تہجد کی نماز میں وہ خدا کے حضور دعا کرتی رہیں۔ بس گریہ کو اتنا معلوم تھا کہ آج بی بی جی کوئی جلالی وظیفہ کر رہی ہیں۔ تب ہی اتنی پریشان ہیں۔ ورنہ وہ عشاء سے لے کر تہجد تک کبھی جائے نماز پر نہیں بیٹھی رہتی تھیں۔ عطیہ اپنے لمحوں کا حساب اسی نامہ اعمال پر لکھ رہی تھیں جو آج خدا کے سامنے دینا تھا اسی نامہ اعمال پر انہوں نے آخری بار نظر ڈالی اور دستخط کر دیے جو آج کے بعد ورشا کو اپنے شکنجے سے آزاد کر دے گا۔ انہوں نے خدا کے حضور اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور بہت آہستہ سے چلتی ہوئی اپنے پلنگ تک بہت مشکل سے آئیں۔ ہلکی ہلکی روشنی میں وہ بہت کمزور دکھائی دے رہی تھیں۔ پھر پتہ نہیں انہیں کس طرح سے نیند آئی۔ یہ تو گریہ کو بھی پتہ نہیں چلا۔ دن کے اجالے میں پھر لوگوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ لیکن اب عطیہ آپا اتنی کمزور ہو گئی تھیں کہ ان سے بیٹھا بھی نہیں جاتا تھا۔ اپنی خاص خدمت گزار کنیز گریہ سے وہ صرف اپنی ضرورت کی چیزیں لیتی تھیں۔ انہیں باہر کی دنیا اور چاندی شاہ کے دربار سے کوئی غرض نہیں تھی۔ بس یاد الٰہی یا صرف روتے رہنا ہی ان کا کام تھا۔ بعض اوقات تو سارا، سارا دن کھانا نہ کھاتی تھیں اور نقاہت کے باعث نہ اٹھ سکتی تھیں لیکن باہر کی آوازیں ان کے اندر سانپوں کی طرح لپٹی رہتی تھیں۔ وہ اندر ہی اندر جل رہی تھیں ان کے دل کی تپش روز بروز بڑھ رہی تھی۔ شاید ان کے امتحان کا وقت ختم ہونے والا تھا۔ خدا! ان کے دل پر لگی سب خراشیں چھٹنے والا تھا۔

☆☆

مدھم مدھم نیلی روشنی میں ورشا کے لب تھرتھرا رہے تھے۔ اس کے چہرے کی رنگت نیلی پڑ چکی تھی۔۔ اس نے سختی سے اپنے ہونٹ بھینچ رکھے تھے اور اس کے ہاتھ کی بند مٹھی میں عطیہ آپا کا خط تڑا مڑا تھا

اور وہ ہذیانی انداز میں اپنے ماضی کی باتیں سوچ کر چونکی تو کمرے میں گہری خاموشی تھی۔ جہاں زیب نے کمرے کے سارے پردے بند کر دیے تھے۔

''دیکھو ورشا ہوش میں آؤ میں ہوں۔ میرے علاوہ تمہارے پاس کوئی نہیں ہے۔ تم خود چل کر باہر دیکھ لو۔'' لیکن اب اس کی ضرورت نہیں تھی۔ ورشا نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور سامنے جہانزیب نظر آئے۔ اس نے اپنی بند مٹھی کے اس کاغذ کو پھر ایک بار دیکھا جس پر لکھا تھا۔

''ورشا میرا دل چاہ رہا ہے کہ وہ لمحے میں تمہیں لوٹا دوں جن کو میں نے پچیس سال سے تم سے چرائے رکھا ہے اور آج ایک بار پھر تمہاری عطیہ آپا اس احساس سے مرگئی کہ میں تمہاری مجرم ہوں شاید میری سزا کا یہ آخری لمحہ ہو جب تمہیں یہ خط ملے۔ میں ایک ایسی مجرم ہوں جس کو زندگی میں اپنی صفائی کا کبھی موقع نہ ملا۔ کچھ لوگ شاید یہ بات اپنی تقدیر میں ہی لکھوا کر لاتے ہیں۔ انہی بدنصیبوں میں سے ایک میں ہوں۔ جس نے ہوش سنبھالنے سے پہلے اپنی ماں کو کھو دیا تھا اور شعور کو پہنچنے سے پہلے اس نے یہ کسی سے نہیں سنا تھا۔ برائی گناہ کو جنم دیتی ہے بلکہ اس کو تو ایسے لوگ مل گئے تھے جنہوں نے اس کے راستے میں کانٹے بچھا دیے تھے۔ پھاپھا کٹنی اور دوسرے لوگ ہر وقت یہی احساس دلاتے کہ ماما گل آکا میاں کو ہر وقت میرے بارے میں بہکاتی رہتی ہیں اور یہ تجسس مجھے راتوں کو بستر سے اٹھا کر ماما گل کے دروازے تک لے جاتا تھا اور میں کواڑ کی آڑ سے سنتی۔ یہ عادت بچپن سے جوانی کی سرحد کو عبور کر گئی اور اس کا راز تو اس دن کھلا جب میں عادل جیسے انسان کی ہوس کا شکار ہو گئی۔ یہ بات نانا جی اور پھاپھا کٹنی کے علم میں تھی لیکن ہر شخص نے یکطرفہ فیصلہ دے کر مجھے تنہا چھوڑ دیا۔ اپنی اس بربادی اور ذلت کے باعث میں نے خود ہی آکا میاں کو اپنے مستقبل کی پیشکش لکھ کر دی تھی ماما گل اور آکا میاں کے درمیان ہونے والے سمجھوتے کو سننے کے لئے میں نے تم سے کہا تھا۔ یاد کرو ورشا اس رات کو جب تیز بارش کے سبب چاروں طرف اندھیرا تھا۔ اب تم اپنی آنکھیں بند کر لو اور یہاں سامنے ادھر مت دیکھنا ورنہ موٹا کالا جن نظر آئے گا اور میں تمہیں لحاف میں اندر چھپا کر خود دبے قدموں چل کر شیشے کی دیوار کے پیچھے پائیں باغ میں کھلنے والی کھڑکی کے ساتھ لگی کھڑی تھی تیزی سے لگتے ہوئے آکا میاں نظر آئے اور میں خوف سے اندر آنے کے بجائے پیچھے پلٹ گئی۔ دوسری بار چوٹ لگنے پر پتہ چلا کہ گھر کے

باہر پناہ گاہ کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ نجانے اپنے اس گناہ کی شدت آج زیادہ کیوں ہے؟ ورشا یاد کرو میں تھی صرف میں تمہاری عطیہ آپا اور یہ خوف میں نے ہی ہمیشہ تمہارے دل میں ڈالا تھا کہ کھڑکی کے باہر جن ہوتا ہے کبھی نہ دیکھنا اور تم یہ سن کر آنکھیں بند کیے ہوئے لیٹ کر سو جاتی تھی۔ ورشا اس رات جب تیز بارش اور ہواؤں کا شور اٹھا تھا تمہاری عطیہ آپا اپنے گھر کا راستہ بھول کر انجانے راستوں پر خوف سے نکل پڑی تھی اور پھر اس کی روح پر اتنی بھاری ضربیں لگی تھیں کہ ماما گل کے ہاتھوں سے دیے سارے زخم بھر گئے تھے اور میں پھر اس پناہ گاہ میں دوبارہ نہ آسکی جہاں تم تھیں۔ میں تمہارے گزرے ہوئے لمحے تو واپس نہیں کر سکتی لیکن اگر ہو سکے تو تم معاف کر دو۔ کچھ تو عذابوں میں کمی ہو جائے گی اور میں سکون سے مر سکوں گی۔

تمہاری عطیہ آپا''

اس نے گھبرا کر چاروں طرف بند کمرے میں دیکھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ ورشا کا بند کمرے میں دم گھٹنے لگا۔

''جہاں زیب میرے کمرے کی ساری کھڑکیاں کھول دو۔ سارے پردے ہٹا دو۔'' اس کا چہرہ بری طرح آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا۔ عطیہ آپا کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہ تھک گئی تھی یا ان کی اذیتوں کے لمحے اس کے دل میں دستک دے رہے تھے۔ جو اس کی بھیگی ہوئی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ جہانزیب نے حیرت سے ورشا کے اندر کی تبدیلی کو دیکھا اور سامنے سے پردہ ہٹا دیا۔

☆☆

ورشا کا خط آکا میاں لیے ہوئے اپنا دل تھامے بیٹھے تھے اور جہاں آرا کا چہرہ ندامت کے آنسوؤں سے تر تھا۔ ان کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ ورشا نے عطیہ آپا کی پوری کہانی لکھ بھیجی ہے۔ جہاں آرا اور آکا میاں دونوں ایک ساتھ چاندی شاہ کی درگاہ کی طرف جا رہے تھے۔ یہ تھوڑا سا فاصلہ میلوں کا لگ رہا تھا کتنے برسوں کی پرانی صلیب کو اتارنے کے لئے جا رہے تھے۔ جہاں آرا نے خود کو ہمیشہ عطیہ کا مجرم سمجھا اور آج وقت آگیا تھا کہ وہ اپنے گناہوں کی تلافی کر لیں۔ آج جہاں آرا کے پاس وقت تھا لیکن خدا نے عطیہ کے لمحوں کو مقید کر دیا تھا۔ وہ پابند حیات ہو چکی تھی۔ تمام دنیا کی تکالیف

سے نجات پانے کا نام ہی راحت ہے۔ شاید اسی لئے اس نے ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لی تھیں اور لوگوں کے ہجوم کو چیرتی ہوئی جہاں آرا آگے بڑھتیں تو لگا۔ عطیہ آپا کو آخری آرام گاہ تک لے جا چکے تھے۔ کاندھا دینے والوں میں آغا میاں بھی شامل تھے۔ عقیدت مندوں کے بیچ بیٹھی ہوئی جہاں آرا سوچ رہی تھیں کہ انہیں چند لمحوں کی آسودگی کے عوض کیا ملا؟ عقیدت مندوں کے لئے ایک نئے باب کا اور اضافہ ہو گیا تھا۔ لوگ کہہ رہے تھے بی بی پردہ کر گئیں۔ خاکی اور ویران، تنگ اور تاریک کٹیا کو لوگ دیکھنے جوق در جوق آ رہے تھے۔ جو حویلی سے بہت دور تھی۔ جہاں عطیہ آپا نے اپنی زندگی کا ایک طویل عرصہ گزارا تھا۔

☆☆

بارش سے بھیگے ہوئے گلاب اس کے صحن میں جھوم رہے تھے۔ تیز ہواؤں کا شور اور ہلکی ہلکی پھوار میں جھومتے ہوئے سرخ و سفید گلابوں کو آج اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ رت کے ان حسین لمحوں کو وہ اپنی آنکھوں میں بھر لینا چاہتی تھی کہ تیز بجلی کی چمک سے اس کا کمرہ روشن ہو گیا اور پھر اندھیرے چاروں طرف چھا گئے لیکن پھر بھی وہ اطمینان سے جہاں زیب کے ساتھ کھڑی ہوئی ان اندھیروں میں چمکتی بارش کے قطروں کو پہلی بار اپنے ہوش میں دیکھ رہی تھی۔ اس کے اطراف عطیہ آپا کے وجود کی بھینی بھینی خوشبو پھیل گئی۔ اسے ایسا لگا کہ وہ آج بھی دیکھ رہی ہے کہ عطیہ آپا کے لمبے لمبے بال شانوں پر بکھرے ہوئے ہیں اور وہ بارش میں کھڑکی کے پاس دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی ہیں اور بھیگے ہوئے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے لپیٹ رہی ہیں اور وہ سہمی ہوئی دیکھ رہی ہے کہ ایسی بھیگتی راتوں میں رونے والا کون ہے لیکن آج برسوں پہلے چھائی ہوئی وہ دھند آنکھوں سے چھٹ گئی تھی۔ ماحول میں ابھی تک اس کے سہمے ہوئے وجود کے احساسات کی مہک تھی۔ جہاں زیب خود بھی حیران تھے کہ یکا یک یہ چہرے کا خوف کیسے ختم ہو گیا۔ ننھے ننھے کرسٹل کے ذروں جیسے بارش کے قطرے اس کے سنہری بالوں میں ہوا سے اڑ اڑ کر اٹک رہے تھے۔ جو اس کے حسن کو اور بھی حسین بنا رہے تھے۔ سزا اور صبر کا ایک طویل دریا عبور کر کے وہ آج بہت خوش تھی اس نے عطیہ آپا کے سجدوں سے ایک دعا چن لی تھی۔

کہتے ہیں کہ رانا راتا سنگھ جو راجستھان کا حکمران تھا، اس کی ایک بیٹی بہت خوبصورت تھی جس کا نام میرا تھا ایک دن ماں سے پوچھ بیٹھی کہ اس کا ہونے والا دولہا کہاں ہے؟ ماں انگلی سے پکڑ کر اسے ایک کونے میں لے گئی اور کرشنا کی مورتی کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ ہیں گوپال۔'' میرا بڑی ہو گئی لیکن دھیان میں کرشنا کے لئے ناچتی اور گاتی رہی حتیٰ کہ اس کی شادی بھی چتوڑ کے حکمران بھوج راج سے ہو گئی لیکن من میں جو تصور بسائے ہوئے تھی وہی سمایا رہا من کا پریمی دوسروں کے آگے جھکنے نہ دیتا۔ وہ اس عہد کی میرا تھی لمحوں کا سماں بیت گیا وہ لمبے سے دھاگے کے سرے کو بار بار دانت سے کھینچ کر توڑتی، ہر بار دھاگہ الجھ جاتا۔ سرخ دوپٹے پر کرن لگانے کا کام اماں نے غازہ کو سونپا تھا اماں کی آواز آئی۔

''اب عید میں دن ہی کتنے رہ گئے ہیں؟'' سوئی کھینچ سے غازہ کی انگلی کے پار ہو گئی۔

''اماں اماں۔'' ثانیہ چیخنے لگی۔

''اماں بھیا جلدی آئیں۔'' غازہ کی انگلی سے خون نکل رہا تھا۔ اماں دوڑی چلی آئیں۔

ناصر نے غازہ کا ہاتھ پکڑ لیا تھا سرخ سرخ خون تیزی سے ٹپک رہا تھا ناصر پٹی باندھتے وقت پوچھ رہا تھا ''دھیان کہیں اور تھا ہاتھ دوپٹے پر چل رہے تھے۔'' وہ اس کی محبتوں میں آج بھی بھیگ رہی تھی پٹی کب کی بندھ چکی تھی لیکن ناصر ہاتھ چھوڑنا بھول گیا تھا یوں لگ رہا تھا راجکماری میرا، کرشن کے سامنے کھڑی ہے۔

''بھیا!'' ثانیہ نے طلسم توڑ دیا۔ ہاتھ چھوٹ گیا راج کماری جلدی سے آنکھیں ملتی ہوئی کمرے سے بھاگ گئی آنسوؤں پر اختیار کب تھا وہ بار بار ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار رہی تھی لیکن گرم گرم آنسو نکلے چلے آ رہے تھے۔ غازہ نے پلٹ کر دیکھا آئینے میں اس کی صورت نظر آئی 'میں کیوں اس کے سامنے ساکت ہو جاتی ہوں میں تو اس سرخ دوپٹے میں کرن نہیں اپنے خواب ٹانک رہی

تھی پھر بھی ہاتھ لرز گئے۔ چند دن بعد غازہ، جی تمہاری اس کہانی کا اختتام ہو جائے گا۔ وقت کب ٹھہرا ہے لیکن میں کتنی بدنصیب ہوں کہ بیتے ہوئے لمحوں کو سمیٹوں تو دامن جلتا ہے، ناصر کی طرف دیکھوں تو دل بھٹکنے لگتا ہے اور اپنی طرف دیکھوں تو خود کو ایسی پستی میں اترتے دیکھتی ہوں کہ جہاں سے ہاتھ بڑھا کر ناصر کو تھامنا مشکل ہی نہیں دشوار لگتا ہے۔ میں اپنی نظروں میں گر جاؤں گی۔ میری محبتوں نے ناصر کی امی سے ان کا بیٹا چھین لیا ہے وہ صرف میری خاطر یہ ملک چھوڑ کر جا رہا ہے۔ غازہ، اب ان آنسوؤں کی کوئی قیمت نہیں کوئی قدر نہیں ہم نے تو خود اس سرخ دوپٹے میں اپنی تقدیر کے تارے ٹانک دیئے ہیں۔

وہ کاریڈور سے گزر رہی تھی ناصر آج پھر ٹکرا گیا۔

''غازہ!''

''جی!'' وہ رک گئی۔

''کوئی احساس کوئی دکھ نہیں ہے تو مسکراتی رہا کرو۔ زندگی میں جو کچھ میرے پاس تھا وہ تمہارا تھا تمہارے لئے میں نے فراخ دلی سے لٹا دیا اب تہی داماں، تہی دست، طویل سفر کی مسافت تو تھکا ہی دے گی۔'' وہ اسے اداسی سے دیکھ رہا تھا۔

''غازہ! میں تو کسی نہ کسی موڑ پر پہنچ ہی جاؤں گا لیکن تم اتنی نازک ہو کہ وقت کا بوجھ نہ اٹھا سکو گی تم تنہائی کے راستے پر کسی جگنو کی تلاش میں کھو جاؤ گی۔'' وہ اپنے دانتوں سے ہونٹ کاٹتی رہی۔ آنکھیں بھیگتی رہیں وہ چپ رہی وہ بے بسی سے دیکھتا رہا ایک قدم آگے نہ بڑھ سکا۔ وہ چلی گئی وہ بھی مڑ گیا اور وقت گزر گیا اور وہ آہستہ آہستہ بیتے ہوئے وقت میں اترنے لگی۔ غازہ اور ماہین دو ہی بہنیں تھیں دولت نے ماہین کو خود سر، تو غازہ کو دل کا غنی بنایا تھا والد ایئر کریش میں جاں بحق ہو چکے تھے۔

''غازہ آنکھ کھولو دیکھو تو سہی کون آیا ہے؟'' لیکن وہ تھی کہ باپ کی جدائی میں ہلکان ہوئی جا رہی تھی سب کچھ ختم ہو گیا تھا زندگی کی اس بھیڑ میں غازہ، ماہین اور ماں تنہا رہ گئے تھے غازہ کا حساس دل ساکت ہو رہا تھا۔ جب ہوش آیا تو غازہ ماں کے سامنے سوال تھی۔

''ممی یہ سب ہمارے ساتھ کیوں ہوا؟ پاپا کیوں چلے گئے؟ یہ سب جھوٹ ہے۔'' اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کے پاپا اس حادثے میں بہت دور چلے گئے ہیں۔

''کاش غازہ ایسا ہی ہوتا۔'' ماہین نے امید کی ننھی سی کرن توڑ دی۔ ماں کے آنسو ابل رہے تھے غازہ بے بسی سے ماہین کے ساتھ لپٹی ہوئی تھی۔ آنے جانے والوں کی آہٹ سے بے نیاز وہ سر جھکائے بیٹھی تھی ماہین کو آنے والے اندیشوں سے خوف آ رہا تھا۔

''ممی پاپا کے بہانے ایسے ایسے لوگ آ رہے ہیں جن کو میں نے کبھی نہیں دیکھا۔''

''ایسے وقت میں سب ہی اپنے ہوتے ہیں ماہین چپ ہو جاؤ۔'' ممی نے دکھ بھری آواز میں کہا تھا۔

''نہیں ممی یہ لوگ لالچی ہیں اب جب پاپا نہیں ہیں سب اپنا حق جتانے آتے ہیں، جھوٹی ہمدردی ہمیں نہیں چاہئے۔''

''ماہین آپی ایسا مت کہیں۔'' غازہ نے آہستہ سے کہا۔

''تم چپ رہو، بہاؤ اپنی بے بسی پر آنسو، لیکن نہ تو میں بزدل ہوں اور نہ ہی میں کمزور، جو لوگ کل تک ہمارے نہیں تھے آج کیسے ہمدرد ہو گئے کل وہ ہمارے دعویدار ہو جائیں گے۔''

''نہیں ایسا نہیں ہوتا۔'' کسی عزیز نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر بٹھایا لیکن ماہین نے بھری محفل میں چچا کو وہ کھری کھری سنائیں کہ سارے رشتے دار دنگ رہ گئے۔

''آپ لوگ اسی وقت تشریف لے جائیں ہمیں کسی کی ہمدردی نہیں چاہئے ہم لوگ پاپا کے بغیر بھی جی سکتے ہیں یوں بھی ہمیشہ پاپا ملک سے باہر رہتے تھے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔'' ماں روتی رہیں لیکن ماہین اپنا وار مکمل کر چکی تھی۔ ایک ایک کر کے سارے رشتے دار چلے گئے۔

''ماہین تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔'' ماں کے آنسو بہہ نکلے۔

''ہاں کہئے پاپا کو برا کہئے کہ انہوں نے مجھے خود سر اور ضدی بنایا ہے۔''

''ماہین!'' ماں نے دکھ سے کہا۔ لیکن ماہین محبتوں کے احساس سے خالی، تکبر سے کھڑی ہو گئی۔ غازہ ماں سے لپٹی روئے جا رہی تھی۔ دن اسی طرح گزر رہے تھے۔ غازہ بہت اداس تھی۔

''ممی یہ ہر وقت کی سوگواری میرا دماغ خراب کر دیتی ہے یوں بھی پاپا کون سے ہمارے پاس بیٹھے رہتے تھے یہ سب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔''

''ماہین!'' ماں کو برا لگا اس لئے انہوں نے پلٹ کر ماہین کو دیکھا۔

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ممی، دیکھئے ناں آپ اور غازہ ہر وقت پاپا کے لئے قرآن پڑھتے رہتے ہیں

لنگ آ جا رہے ہیں میں بہت زیادہ ڈپریس ہوتی ہوں اس ماحول سے، اب تو پاپا کو ایک ماہ ہو گیا ہے۔" ماں اسے صرف دیکھ کر رہ گئیں اس کی بے حسی سے انہیں بہت افسوس ہوا تھا۔ غازہ سے اس سلسلے میں بات کرتی تو وہ روتے روتے نڈھال ہو جاتی۔

"ماہین آپی آپ کیسی باتیں کرتی ہیں مجھے تو یوں لگتا ہے کہ میں پاپا کے بغیر ایک پل اور نہ جی سکوں گی۔"

"لیکن ایک پل کیا اچھا خاصا ایک ماہ گزر گیا تم جی رہی ہو، دیکھو غازہ اب یہ ڈرامہ چھوڑ دو اور باہر نکلو۔"

"آپی آپ کیسی باتیں کرتی ہیں حالانکہ پاپا آپ سے زیادہ محبت کرتے تھے۔" غازہ نے اپنی آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"اسی لیے تو میں کہہ رہی ہوں کہ یہ ڈرامہ صرف ممی کو کرنے دو۔"

"کیا مطلب ہے آپی آپ کا؟" غازہ کو غصہ آنے لگا۔

"ممی اور پاپا میں کبھی انڈراسٹینڈنگ نہیں رہی لیکن اب ممی اس طرح سے یہ سب کچھ کیوں کر رہی ہیں جیسے وہ پاپا کو بہت چاہتی تھیں۔" ماہین نے یہ بات کہہ کر سختی سے ہونٹ بھینچ لئے تھے۔ غازہ کی آنکھوں سے اس وقت بھی آنسو بہہ رہے تھے۔

"یہ سب ڈھونگ ہے؟ ممی کتنی سیریس بیمار ہیں ان کی تو پوری کائنات پاپا ہی تھے باقی ان کی زندگی میں اور تھا ہی کیا؟"

"تم تھیں اور کوئی نہیں۔"

"آپی! کس بے رحمی سے ممی کو نشانہ بنا رہی ہیں خدا کے واسطے اب یہ سب ممی کے سامنے مت کہہ دینا پہلے ہی وہ بیمار ہیں اگر ممی نہیں رہیں تو کیا ہوگا آپی؟" غازہ کے آنسو تواتر سے بہہ رہے تھے پھوپھی جان جاتے جاتے ماہین پر مزید تیل چھڑک گئیں۔

"دیکھو ماہین پاپا کے بعد اب تم ہی سمجھدار ہو بھیا کو تو تمہاری ممی سے یہی شکایت تھی کہ وہ کم عقل ہیں غازہ تو چھوٹی ہے جو بھی فیصلہ ہو اپنی ماں کی عقل سے نہیں اپنی عقل سے کام لینا۔ دنیا والے مطلبی ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں پھوپھی جان پاپا نے کبھی ممی کو اہمیت نہیں دی۔ ممی اور پاپا کے خیالات بہت جدا تھے لیکن پھوپھی جان اب میں تنہا ہوں پہلے میں اور پاپا تھے اور اب غازہ اور ممی ایک ہیں غازہ اور

ممی اس وقت بھی پاپا کے خلاف رہتے تھے شاید اس لئے ممی اور غازہ بھی مجھ سے دور رہتے ہیں۔"

"خیر بیٹی اللہ تمہیں سلامت رکھے اب تم ہی ہمارے بھائی کی نشانی ہو۔" فرط محبت سے پھوپھی جان نے ماتھا چوما اور چلی گئیں۔

ماہین کی خود سری باپ کی غیر موجودگی میں مزید بڑھتی چلی گئی کسی کی اہمیت کا احساس نہ رہا۔ ماں تو اس کے لئے نہ ہونے کے برابر تھیں اس میں ماہین کا بھی کیا قصور تھا۔ نجم الحسن نے اس کی تربیت ہی اس انداز میں کی تھی نجم الحسن نے عائشہ بیگم کے حسن سے متاثر ہو کر ان سے شادی تو کر لی تھی لیکن تمام زندگی ان کی کم عمری اور حسن سے خائف رہے۔ قدم قدم پر ان کے شک اور طنز بھرے جملوں نے عائشہ بیگم کو بزدل بنا دیا تھا گھر میں ان کی کوئی حیثیت ہی نہ تھی کبھی کسی معاملے میں انہوں نے عائشہ بیگم سے مشورہ نہ کیا تھا شاید عائشہ بیگم نے اپنی زندگی سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ گھر کے ماحول میں اس گھٹن کی وجہ سے جو ماں اور باپ کے سرد تعلقات کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی ماہین خود سر ہو گئی تھی۔ غازہ سے انہیں پیار تو تھا لیکن وہ ہمیشہ ماہین کو اس پر فوقیت دیتے تھے ماہین کا لب ولہجہ احساس برتری اور انداز، وہ اپنے باپ کا پرتو تھی اور اسی بات پر نجم الحسن کو فخر تھا وہ ان کے لئے بیٹی نہیں، بیٹے کا درجہ رکھتی تھی، بی بی کا تو ان کی نظر میں نہ کوئی مقام تھا نہ اہمیت، جو کچھ تھی وہ ماہین تھی۔

غازہ بہت حساس طبیعت کی مالک تھی گھر کے ماحول نے اسے بزدل بنا دیا تھا کبھی وہ باپ کے سخت رویئے سے پریشان تو کبھی ماں کی خاموشی پر رو رو کر ہلکان ہوتی رہتی تھی لیکن ماہین اپنی ذات میں مگن رہتی۔ کالج سے آنے کے بعد سارا وقت ٹی وی یا فون پر لگی رہتی تھی تیز میوزک، ہنگامے اس کی زندگی تھے۔ خاموشی سے اسے وحشت ہوتی تھی۔ شاید اسی لئے وہ ماں سے کبھی قریب نہ رہ سکی۔ غازہ تو اس کے نزدیک ایک بزدل لڑکی تھی۔ جس کو ابھی تک ماں سے لپٹ کر سونے کی عادت تھی۔ حالانکہ وہ انٹر میں اور ماہین تھرڈ ایئر میں تھی۔ لیکن وہ غازہ سے کہیں زیادہ اسمارٹ اور ذہین نظر آتی تھی ماہین تو ہمیشہ غازہ کا مذاق اڑایا کرتی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی ضد تھیں ماہین مغرب تو غازہ مشرق۔ کالج میں بھی کسی کو یقین نہیں آتا تھا کہ دونوں بہنیں ہیں۔ ویسے بھی ان دنوں غازہ اور ماہین کی بات چیت بند تھی۔ غازہ نے ماہین کے بغیر پوچھے اس کے جوتے پہن لئے تھے بس گھر میں ایک قیامت آ گئی ماہین کو تو ایک بہانہ چاہئے تھا سونے پر سہاگہ کہ ماہین کو پتا چل گیا تھا کہ غازہ نے اس کے نوٹس بغیر اس

سے پوچھے تانیہ کو دے دیئے ہیں۔ پھر کیا تھا ماہین نے رو رو کر گھر سر پر اٹھا لیا۔

"یونو غازہ کہ میں ڈسپلن کو فالو کرتی ہوں میں تمہاری ان بکو اس عادتوں کو برداشت نہیں کر سکتی ہوں تمہیں جرات کیسے ہوئی کہ تم میری وارڈ روب کھولو؟"

اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا غازہ صفائی پیش کر رہی تھی لیکن ماہین نے ایک نہیں سنی اس نے اپنی چیزیں بیگ میں جمع کیں اور گھر چھوڑ کر چلے جانے کی دھمکی دے دی۔

نجم الحسن کے انتقال کو ابھی صرف دس ماہ ہی گزرے تھے کہ ماہین کی اس دھمکی نے ممی کو نڈھال کر دیا انہوں نے ماہین کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔ لیکن ماہین نے انتہائی بدتمیزی اور خود سری سے انکار کر دیا۔ عائشہ بیگم ساری زندگی شوہر کا غصہ اور مزاج بھی برداشت کرتی آئی تھیں، بیٹی کی خود سری سے انہیں اتنا دکھ پہنچا کہ وہ بے ہوش ہو گئیں۔ انہیں ہسپتال لے جایا گیا عائشہ بیگم کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔

غازہ کا رو رو کر برا حال تھا ماہین بھی اب شرمندہ اور پریشان تھی لیکن اپنی بات پر اڑی تھی کہ اس کی چیز غازہ نے کیوں استعمال کی اس کی چیز کوئی استعمال کرے تو وہ اسے پھینک دیتی ہے۔

پھر یہی ہوا کہ ماہین کو جب غازہ نے نوٹس لا کر دیئے تو اس نے ان کو آگ لگا دی۔ غازہ اس کے اس طرح کے رویے کی عادی تھی اسے خود بھی احساس تھا کہ غلطی ہوئی لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا۔

عائشہ بیگم جب گھر آ گئیں تو ماہین نے سوری تو ضرور کی لیکن یہ بھی کہا کہ سارا قصور غازہ کا ہے اور یہ آپ کی غلط تربیت کی وجہ سے اس طرح کی ہوئی ہے یہی بات نجم الحسن کہا کرتے تھے۔

بچپن کے وہ چھوٹے چھوٹے جملے جو نجم الحسن نے ماہین کے ذہن میں ڈالے تھے ناسور بن کر اب گھر کے ماحول میں بگاڑ پیدا کر رہے تھے۔

ماہین کو ماں کی قدامت پسندی سے نفرت تھی وہ دور جدید کے تقاضوں کے مطابق زندگی گزارنا چاہتی تھی جب کہ عائشہ بیگم اس کے لئے ایک دیوار تھیں۔

"دیکھو ماہین تم اس طرح ہارون کے ساتھ مت جایا کرو آخر کو تم کو ایک دن اس کے گھر جانا ہے آج نہیں تو کل۔" ممی نے بڑے پیار سے ماہین کو سمجھایا۔

"آپ یہ مشورہ غازہ کے لئے سنبھال کر رکھئے مجھے آپ کے مشوروں کی ضرورت نہیں۔" ماہین نے خود سری سے کہا۔

"میں کالج سے ہارون کے ساتھ پھوپھو کے گھر چلی جاؤں گی۔ غازہ کے لئے ڈرائیور بھیج دیجئے گا۔"

ماہین نے چابی کو اچھال کر پکڑا اماں دیکھتی رہ گئیں ماہین گزر گئی۔

شوخ چنچل سی ماہین گھر کے اندر کیا تھی یہ بات گھر کے باہر کوئی بھی نہ جان سکا عائشہ بیگم ہمیشہ کی طرح خاموش رہیں۔ لب نہ کھولے۔

ماہین نے صاف کہہ دیا تھا کہ یہ زندگی اس کی ہے وہ جس طرح چاہے بسر کرے کسی کو کچھ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یوں بھی عائشہ بیگم اب بالکل شوہر کی طرح بیٹی سے ڈرنے لگی تھیں غازہ نے کئی بار کہا۔

"ممی آپ اس قدر آپی سے کیوں کتراتی ہیں؟" ان کے پاس ایک ہی جواب تھا کہ اس کا غصہ بہت خراب ہے جوان ہے میں ڈرتی ہوں۔

عائشہ بیگم ان دنوں بیمار تھیں کافی رات ہو گئی تھی ماہین ابھی تک گھر نہیں آئی تھی عائشہ بیگم بار بار ماہین کا پوچھ رہی تھیں۔

رات کے بارہ بج رہے تھے ہارون کی آواز پر غازہ نے بالائی گیٹ کی طرف نظر ڈالی ماہین ہارون بھائی کے ساتھ تھی۔

گیٹ کھلا کار اندر آئی ماہین اپنے بڑے سے پرس کو کندھے پر لٹکائے جھومتی ہوئی بڑھ رہی تھی۔ غازہ نے دکھ سے آنکھیں موند لیں کوئی علاج، کوئی مسیحا نہیں تھا جو ان دکھوں کو دور کرتا۔ ماہین بہت آگے نکل چکی تھی۔

عائشہ بیگم نے کئی بار اس طرح دیر سے گھر آنے پر باز پرس کی لیکن ماہین نے ہر بار اتنا ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ بالآخر غازہ کو کہنا ہی پڑا۔

"ممی آپ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیجئے ورنہ آپ کو کچھ ہو جائے گا۔"

"کس طرح میں یہ کروں آخر یہ میری بیٹی ہے اس کی بربادی میری موت ہوگی۔ ہارون کے ساتھ اتنی رات گئے گھر سے باہر رہنا مناسب نہیں ہے کیا یہ تمہاری پھوپھو کو نظر نہیں آتا۔" ممی کے آنسو بہہ رہے تھے۔

لیکن ماہین ہمیشہ سے ہنگاموں سے بھرپور زندگی گزارنے کی عادی تھی باپ کی دی ہوئی آزادی آج

بہت آگے لے گئی تھی جہاں سے واپسی کا سفر مشکل نظر آتا تھا۔

عائشہ بیگم نے ایک دن ماہین کو بہت رسان سے سمجھایا تھا۔

''ماہین میری جان! ہارون تمہارا حق ہے تم اس کے گھر جاؤ گی لیکن جو کچھ تم کررہی ہو یہ اچھا نہیں ہے یہ ایک دن تمہارے لئے طعنہ بن جائے گا۔''

''کیا اچھا ہے، کیا برا ہے، میں یہ آپ سے بہتر جانتی ہوں آپ ہارون کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ کہئے گا ہارون پاپا کا انتخاب ہے ویسے بھی وہ میرا کزن ہے کوئی غیر نہیں۔'' ماہین نے ممی کو توہین آمیز لہجے میں پلٹ کر جواب دیا تھا۔

''پھر بھی میں تم سے یہی کہوں گی کہ ماہین جو تم کررہی ہو یہ تمہاری تباہی کا باعث بن سکتا ہے۔'' عائشہ بیگم نے شکست تسلیم نہیں کی تھی۔

''آپ تو منحوس باتیں زبان سے نکالنے کی عادی ہیں آپ کی ان ہی باتوں نے پاپا کی جان لے لی یہ قدامت پسندی آپ غازہ کو سکھایئے۔ ہم تو صرف آپ کی نفرتوں کے طلبگار ہیں۔''

''ماہین میری بات سمجھنے کی کوشش کرو صرف چند ماہ کی بات ہے پھر ہارون تمہارا ہے۔'' عائشہ بیگم نے لجاجت سے کہا۔

''یہ میں خود بھی جانتی ہوں اس میں آپ کی کیا مہربانی ہے کہ ہارون چند ماہ بعد میرا ہوگا۔''

''ماہین تم جس گھر میں جانے والی ہو وہاں کا ماحول کو ذہن میں رکھو بہت ممکن ہے کہ آنے والی زندگی میں تمہیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑے آنے والا وقت تمہیں معاف نہیں کرے گا۔'' ممی کا لہجہ دھیما پڑ گیا۔

ماہین زور سے ہنس پڑی۔

''ممی میں جس معاشرے میں رہ رہی ہوں وہاں کی دنیا آپ کی قائم کردہ دنیا سے بہت مختلف ہے۔'' اس کا اشارہ گھر کے ماحول کی طرف تھا۔

''لیکن بیٹی معاشرہ عورت کی غلطی کو کبھی معاف نہیں کرتا عورت کل بھی عورت تھی اور آج بھی عورت ہے مشرقی اقدار کا پاس کرنے والی گھر کی عزت کا بوجھ اسی کے کاندھوں پر ہے۔''

''آخر اتنی لمبی چوڑی گفتگو سے آپ کا مطلب کیا ہے؟ آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں کہ میں ہارون کو چھوڑ دوں۔ گھر میں بیٹھ جاؤں ہرگز نہیں میں اور وہ ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے اور وہ کوئی غیر نہیں۔

میں آپ کی کوئی بات اس سلسلے میں نہیں سنوں گی۔'' ماہین غصے سے پیر پٹختی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

عائشہ بیگم جو کچھ کہنا چاہ رہی تھیں، وہ سمجھ ہی نہ سکی۔

نجم الحسن کے انتقال کے دو سال بعد نوبت یہاں تک پہنچی کہ ماہین سیاہ سفید کی مالک بن گئی تمام اختیارات کی مالک باپ کی جگہ اب ماہین ہی تھی اس کی مرضی کے بغیر غازہ یا عائشہ بیگم کچھ کر بھی نہیں سکتی تھیں۔

اس دن جب غازہ کالج سے گھر لوٹی تو ماہین چند لوگوں کے ساتھ بڑے ہال میں نظر آئی۔ غازہ جلدی سے اوپر والی سیڑھیوں کو عبور کرنا چاہ رہی تھی کہ ماہین کی آواز نے قدم روک دیئے۔

''غازی!'' اس نے حیران ہوکر دیکھا آج ماہین کے لہجے سے پیار چھلک رہا تھا لبوں پر بھی مسکراہٹ اتر آئی تھی۔

''یہ ہیں میری چھوٹی بہن غازہ اور غازہ یہ ہیں نئے کرایہ دار ناصر۔'' غازہ نے حیران ہوکر ماہین کی طرف دیکھا اور پھر اپنے فیملی وکیل شہاب دانش کی طرف جو نجم الحسن کے ایڈوائزر تھے ایک پل میں وہ ساری بات سمجھ گئی۔

پھر ماہین نے خود ہی تفصیل سے تعارف کرایا اور بتایا کہ ناصر ہارون کے دوستوں ہی میں سے ہیں ان کی فیملی نے ہماری ساتھ والی کوٹھی کرایہ پر لے لی ہے۔ آج ایگریمنٹ سائن ہونا ہے اس لئے میں نے شہاب انکل کو بلایا ہے۔ غازہ نے انکل کی طرف دیکھا تو ناصر کے ساتھ بیٹھی ہوئی ایک نازک سی جانی پہچانی لڑکی مسکرا رہی تھی۔

''ارے تانیہ تم۔'' وہ بے ساختہ اس کی طرف بڑھی وہ بھی کھڑی ہوگئی۔

''کمال ہے میں نے تو نام سے ہی جان لیا تھا تم اب پہچان رہی ہو۔'' غازہ نے اشارے سے ناصر کے بارے میں پوچھا۔

''چپ۔'' تانیہ نے اشارے سے چپ کرایا پھر سختی سے ہاتھ دبا کر بولی۔

''میرے بھائی جان ہیں۔'' وہ غازہ کا اشارہ سمجھ گئی تھی کہ وہ جاوید کے بارے میں پوچھ رہی ہے جس کے قصے تانیہ سنایا کرتی تھی۔ تانیہ اس وقت کچھ نروس سی لگ رہی تھی۔ ماہین نے بہت پیار سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ غازہ نے ماہین سے تعارف کرایا۔

"آپی یہ تانیہ ہیں اسکول میں ہم دونوں ایک ساتھ ہوا کرتے تھے۔" ایک لمحے کے لئے جو کوفت ماہین کے یک طرفہ فیصلے سے ہوئی تھی وہ ختم ہوگئی۔

غازہ نے ابھی تانیہ کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا کہ وہ شرارت سے مسکرا کر بولی

"بھائی جان یہ ہیں غازہ علی۔" ناصر نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا ان کی نظریں ملیں یک دم غازہ کو محسوس ہوا کہ جیسے وہ برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔

تانیہ شرارت سے ناصر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ نظریں چرا کر شہاب انکل سے مخاطب ہو گیا

"ناصر صاحب یہ تو اور بھی اچھا ہے کہ آپ لوگ غازہ کو جانتے ہیں اس طرح اب آپ سے ہم تین حیثیت سے ملیں گے سب سے پہلے ہارون کے دوست، دوسرے ہمارے کرایہ دار اور تیسرے غازہ کی دوست تانیہ کے بھائی ہیں۔" ماہین کتنی نرم آواز میں بول رہی تھی لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ وہی ماہین ہے۔ شہاب انکل جا چکے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ناصر اور تانیہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ غازہ نے خدا حافظ کہا اور وہ لوگ کل کا آنے کا کہہ کر چلے گئے تو وہ بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں جانے لگی۔

"غازہ۔"

"جی۔" وہ رک گئی۔

"میں نے جب تمہیں آواز دی تھی تو تم رک کر کیا سوچ رہی تھیں؟" ماہین کی آواز میں تلخی تھی۔

"اتنے اہم معاملات میں آپ کو ممی کو بھی شامل کرنا چاہئے تھا اتنے بڑے بڑے فیصلے خود ہی نہیں کر لینے چاہئیں۔" وہ اپنے ردعمل کو چھپا نہ سکی۔ صاف گوئی سے کہہ دیا۔

ماہین کو شاید غازہ سے ایسے جواب کی توقع نہ تھی وہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔

"ممی جسمانی طور پر ہی نہیں ذہنی طور پر بھی بیمار ہیں۔"

"جی نہیں، وہ نہ کبھی بیمار تھیں اور نہ اب بیمار ہیں آپ آئندہ ممی کے لئے یہ لفظ استعمال نہ کیجئے گا اور ہاں آپی یہ کوٹھی جو آپ نے کرایہ پر دی ہے شاید آپ کو یاد ہو یہ میرے نام ہے آئندہ کوئی بھی فیصلہ کرتے ہوئے مجھ سے نہ سہی ممی سے ضرور پوچھ لیجئے گا۔"

برسوں کا لاوا پھٹ گیا تھا ماہین کو تو حیرت تھی ہی اسے خود بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ ماہین کے روبرو یہ گفتگو کر رہی ہے اس کی کیا کسی کی مجال نہیں تھی کہ ماہین کے کیے ہوئے فیصلے کو رد کر سکے یہ حوصلہ اور

اختیار پاپا نے ماہین کو دیا تھا۔

وہ بچپن سے ماں کی ہر بات کو رد کرتی چلی آ رہی تھی اور اس میں پاپا کی مرضی شامل ہوتی تھی۔

ممی کی ہر بات غلط تھی وہ کہتیں۔

"اس وقت مت کھیلو۔"

لیکن پاپا کہتے "نہیں یہی درست وقت ہے کھیلنے کا۔" عائشہ کو ہر قدم پر رد کیا جاتا تھا اس طرح وہ ذہنی طور پر ابنارمل سی لگنے لگی تھیں۔

غازہ اور ماہین ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہوتے ہوئے بھی بٹ کر رہ گئیں۔ ماہین کی سرشت آگ سے بھری ہوئی تھی اور غازہ مٹی سے بنی ایک بزدل لڑکی لمحہ لمحہ محبتوں کے لئے مرنے والی لڑکی۔ اسے قدم قدم پر بزدلی کا طعنہ ملتا۔

شوخ و شریری ماہین باپ کی آنکھ کا تارا تھی اور غازہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی خاموش تھی۔

ماہین دھڑ دھڑ کرتی اوپر چلی گئی لیکن اس کے قدموں کی دھمک ابھی تک غازہ اپنے دل کے اندر محسوس کر رہی تھی۔

کتنے دن ہو گئے ماہین نے بات تک نہ کی۔ نئے کرایہ دار آ چکے تھے۔

تانیہ ان کے گھر کے حالات سے ناواقف تھی۔ ماہین اپنی دنیا میں مگن تھی کب یونیورسٹی سے آتی اور کب جاتی کسی کو علم نہیں تھا اس کی لاتعلقی امی کو اکثر رلا دیتی تھی۔ امی ماہین کے اردگرد بسنے والے لوگوں سے واقف تھیں لیکن ماہین کے نزدیک سب اچھے اور اونچی کلاس کے لوگ تھے۔

تانی کے بارے میں ماہین کا خیال تھا کہ ہمارے اور ان کے درمیان ایک فاصلہ ہونا چاہئے اس دن اس نے غازہ کو روک لیا۔

"غازہ۔" وہ حیران رہ گئی کیونکہ ماہین اس سے بہت کم مخاطب ہوتی تھی۔

"مجھے ہر وقت تانیہ کا تمہارے ساتھ رہنا پسند نہیں۔"

"جی یہ آپ کہہ رہی ہیں؟" غازہ نے جواب دینا سیکھ لیا تھا۔

"ہر انسان الگ مقام رکھتا ہے ٹھیک ہے وہ تمہاری دوست ہے یوں تو میں بھی ناصر کو اچھی طرح جانتی ہوں لیکن ہم میں اور ان میں جو فرق ہے اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔"

ماہین نے بالوں کو برش کیا اپنی کاجل بھری آنکھوں کو آئینے میں دیکھا ۔غازہ نے پوچھا

''کیوں؟''

''میں جو کہہ رہی ہوں یہ کافی نہیں ہے؟'' ماہین نے آئینے میں نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''آپی تانی میری بچپن کی دوست ہے۔'' غازہ نے احتجاج کیا۔

''میں جانتی ہوں یہی ناصر ہے ناں جو تمہیں کارڈ اور پوسٹر بنا کر تانیہ کے ہاتھ بھیجا کرتا تھا۔'' وہ معنی خیز نظروں سے اسے دیکھ کر بولی۔

''جی ہاں پھر؟'' غازہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے یہ بات پسند نہیں ہے۔'' ماہین نے سختی لہجے میں کہا۔

''آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں؟''

''میں تمہیں یہ بتانا چاہ رہی ہوں کہ اپنے اسٹیٹس کے لوگوں سے ہی دوستی اچھی لگتی ہے۔''

''ہارون بھائی کا کیا اسٹیٹس ہے؟'' اس کے منہ سے غیر ارادی طور پر یہ نکل گیا۔

ماہین اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ہر وقت ڈری سہمی غازہ اس سے بھی کوئی سوال کر سکتی ہے۔ ماہین کا ہاتھ بے اختیار اٹھا اور غازہ کے چہرے پر پانچ انگلیوں کے نشان چھوڑ گیا۔

''وہ پاپا کی چوائس ہے اور میرا کزن۔'' غازہ ہکا بکا کھڑی تھی ماہین جا چکی تھی۔ وہ دیر تک اندھیرے میں بیٹھی رہی دل بھر کر روتی رہی اس بات پر نہیں کہ ماہین نے اسے تھپڑ مارا تھا بلکہ اس کی سوچ، اس کے انداز پر جو اس نے پاپا کے بعد اپنا لیا تھا کل تک ناصر کی تعریفیں اور آج کیا ہو گیا وہ دیر تک روتی رہی۔

رات کا سیاہ دامن پھیلا ہوا تھا غازہ نے اٹھ کر کھڑکی سے باہر دیکھا رات کا سیاہ اندھیرا دور تک پھیلا ہوا تھا۔ تب ہی ماہین ہارون بھائی کے ساتھ اپنے کمرے سے نکلی وہ کسی پارٹی میں ہارون بھائی کے ساتھ جا رہی تھی۔ سیاہ شلوار اور میرون لمبے کرتے میں وہ بہت پرکشش لگ رہی تھی وہ گاڑی میں بیٹھ کر چلی گئی۔

غازہ کتنی دیر اندھیرے میں یونہی کھڑی ان گھنے درختوں کو تکتی رہی جو اس کے سامنے اتنے بڑے ہو گئے تھے۔

تانیہ دبے قدموں چلتی ہوئی اس کے کمرے میں آ گئی تھی اس نے دونوں ہاتھ اس کی آنکھوں پر رکھ دیئے اور غازہ نے اس کی مہک سے بتا دیا کہ تانی ہے تانیہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

غازہ بہت اداس تھی آنکھیں نم تھیں سو بے اختیار چھلک پڑیں اس نے چہرہ چھپا لیا لیکن تانی نے اسے لپٹا لیا۔

''ارے ارے غازہ کیا ہوا کیوں رو رہی ہو؟'' تانی پریشان ہو گئی اس نے غازہ کو ہمیشہ ہنستے ہوئے ہی دیکھا تھا۔

وہ سسک سسک کر روتی رہی وہ وجہ پوچھتی رہی لیکن غازہ اسے کچھ نہ بتا سکی۔ ماہین آپی کا رویہ کیسا بھی تھا وہ اس کی بہن تھی۔ اب وہ تانی کو ماہین کی خودسری کے بارے میں کیسے بتاتی کہ وہ تمہارے اور میرے درمیان فاصلہ کی قائل ہیں وہ کیسے بتاتی کہ پاپا کے بعد اب ماہین آپی ممی کا سکون چھین رہی ہیں اس نے آنسو پونچھ لیے۔

''کچھ نہیں تانی پاپا یاد آ گئے تھے۔'' وہ اٹھ کر باہر آ گئی تانی سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔

ماہین، باپ کی چھوڑی ہوئی دولت کو لٹا رہی تھی۔ یہ بات غازہ اور ممی جانتی تھیں یا نہیں کتنا پیسہ بینک سے نکال رہی ہے لیکن خاموشی کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ امی کو صرف ہارون کے ساتھ گھومنے پھرنے پر اعتراض تھا۔ آج بھی ماہین بہت دیر سے گھر آئی تھی۔ ممی نے ہارون کی آواز سنی سامنے والے کلاک کی سوئیاں ایک بجا رہی تھیں۔ ماہین بہت تیزی سے زینہ طے کرتی ہوئی اپنے بیڈروم کی طرف جا رہی تھی لیکن امی اس سے پہلے اس کے بیڈروم میں جا چکی تھیں۔

''ماہین!'' امی کی آواز نے اس کے قدم روک دیئے۔

''جی فرمایئے کوئی مذہبی لیکچر۔'' اس کے لہجے میں بیزاری تھی۔

''ماہین تم جس راستے پر چل رہی ہو وہ تمہیں ایک دن اتنی دور لے جائے گا کہ واپسی کا سفر بہت دشوار ہو جائے گا تم کیوں نہیں سمجھتی ہو۔'' امی نے دھیمے لہجے میں کہا تھا گویا وہ ماہین کے سامنے اپنی شکست تسلیم کر چکی تھیں لیکن ماہین نے کوئی جواب نہیں دیا وہ مسکرا کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''سوری ممی رات بہت ہو گئی ہے آپ صبح بات کیجیے گا۔''

''ماہین!'' ممی کی آواز میں اب سختی تھی۔

''تم اخلاقی حدود کو توڑ رہی ہو میں یہ کبھی برداشت نہیں کروں گی کہ تم ہارون کے ساتھ اتنی رات تک باہر رہو۔''

''آپ آہستہ بات کیجئے میں اس لہجے کو سننے کی عادی نہیں ہوں۔'' اور اس کے ساتھ ہی آج پہلی بار ایک تھپڑ ماہین کے گالوں پر پڑا تھا۔ ماہین ہونقوں بچکارہ گئی۔

''آپ مجھے نہیں روک سکتیں آپ ہوتی کون ہیں؟ میں اپنی زندگی کی مالک ہوں روکنا ہے تو غازہ کو روکئے اور یہ زہر سب ناصر کا پھیلایا ہوا ہے مجھے معلوم ہے کہ آج وہ آیا تھا آپ کی جو حیثیت پاپا کے سامنے تھی آپ اسی دائرے میں رہیے۔''

''آپی۔'' غازہ نے ماہین کو بولنے سے روک دیا ماہین نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر دیکھا۔

''آج جو کچھ ہوا ہے اس کی وجہ ناصر ہے۔'' ماہین نے ڈریسنگ ٹیبل کو ٹھوکر ماری۔

''ناصر؟'' غازہ نے حیرت سے ماہین کی طرف دیکھا لیکن امی نے کہا۔

''ہاں مجھے ناصر نے سب کچھ بتا دیا ہے لیکن ماہین یہ یاد رکھنا کہ واپسی کا سفر دشوار ہوتا ہے۔'' اور ہوا بھی یہی کہ واپسی کا سفر ماہین کے لئے بہت دشوار ہو گیا ماہین جن راستوں پر چل رہی تھی اس کا انجام یہ ہونا تھا غازہ کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو گیا؟

ماہین امی سے رو رو کر کہہ رہی تھی۔

''میں تو ایک انجکشن بھی نہیں لگوا سکتی تو پھر یہ سب کیسے برداشت کروں گی؟ آپ کوئی حل بتائیں۔'' لیکن اخلاقی حدود کو پار کرنے والوں کے لئے کوئی حل ہی نہیں تھا اس کے علاوہ بے بس ہو کر رہ گئی تھیں۔

صرف ایک ہی حل تھا کہ امی، پھوپھو کے پاس جائیں اور ان سے کہیں کہ جلد از جلد شادی کر لیں۔

لیکن پھوپھو نے تو الٹا ماہین آپی کے کرتوت کھول کر رکھ دیے اور صاف لفظوں میں کہہ دیا۔

''ماہین کے بارے میں تو ہارون کبھی ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور مجھے تو غازہ پسند ہے۔''

''پھوپھو!'' غازہ نے برہمی سے دیکھا جو صرف ماہین آپی کو موردِ الزام ٹھہرا رہی تھیں ہارون بھائی کو بالکل بری الذمہ قرار دے رہی تھیں۔

''آپ پہلے ہارون بھائی سے تو معلوم کیجئے۔''

''میں ہارون کو زیادہ بہتر جانتی ہوں اس کی سوچ میری سوچ سے مختلف نہیں ہے ماہین اس قابل نہیں ہے کہ ہمارے خاندان کی بہو بن سکے اور نہ ہارون نے کبھی اسے اس نظر سے دیکھا ہے یہ ماہین کی اپنی کمزوریاں ہیں کہ وہ نہ جانے کن کن دوستوں سے ملتی پھرتی ہے۔ ہارون تو صرف اس کو ڈراپ کرتا تھا وہ بھی اس لئے کہ ماہین تم لوگوں سے خوفزدہ تھی اگر تم لوگوں کو رشتہ قائم رکھنا ہے تو میرا انتخاب غازہ ہے۔'' غازہ اور امی دونوں انہیں حیرانگی سے دیکھ رہی تھیں جنہوں نے تمام ظاہری خلاف ایک پل میں اتار دیے تھے۔

ماہین جس دلدل میں اتر چکی تھی اس سے نکلنا بہت مشکل تھا جب وہ ان راہوں پر چل رہی تھی کسی کی ایک نہ سنی اور جب واپس لوٹ کر دیکھا تو ساتھ چلنے والے مشرقی لبادوں میں بہت بلندی پر بیٹھے تھے اور ماہین بہت پستی میں کھڑی تھی۔

امی اور غازہ بہت پریشان تھیں لیکن ماہین تو بہت جلد نارمل ہو گئی تھی وہ جس سوسائٹی میں موو کر رہی تھی وہاں ایسے مسائل کا حل موجود تھا۔

امی کو زیادہ پریشان دیکھا تو بہت ندامت سے بولی تھی۔

''نو پرابلم ممی میں سب کچھ کر لوں گی آپ پریشان نہ ہوں۔ رہا ہارون کا مسئلہ تو کوئی غم نہیں ایسے ایسے ہارون تو ہماری ایک نظر کے منتظر رہتے ہیں۔'' حالانکہ ایسی بات نہیں تھی ماہین اندر سے ٹوٹ چکی تھی بظاہر انا کا لباس پہنے ہوئے وہ خود کو مطمئن ظاہر کرنے کے لئے اور امی کو پریشانی سے بچانے کے لئے کہہ رہی تھی۔ غازہ نے اسے غور سے دیکھا تو وہ خوف زدہ سی ہو گئی اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

آج کل ماہین بہت چپ چپ رہنے لگی تھی اور زیادہ تر وہ گھر پر ہی رہتی تھی غازہ جب یونیورسٹی سے گھر آئی تو امی اور ماہین لاہور جانے کا طے کر چکی تھیں۔

ماہین اور امی دو ہفتے کے بعد واپس آ گئی تھیں۔ امی بیمار تھیں ماہین بہت کمزور اور خاموش رہتی تھی۔

اس دن ماہین کلب جانے کے لئے تیار ہو کر آئی تو غازہ نے دیکھا اس کی آنکھوں میں نمی تھی اور وہ بہت بجھی بجھی نظر آ رہی تھی۔

''آپی آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تو کیوں جا رہی ہیں؟'' غازہ نے نرمی سے کہا۔

''مجھے کیا ہوا ہے میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' اس کی آواز میں نقاہت تھی وہ چلی گئی۔

امی اب غازہ کی طرف سے خوفزدہ رہتی تھیں انہیں ڈر تھا کہ کہیں غازہ بھی ماہین کی راہ اختیار نہ کر لے یونیورسٹی میں ذرا دیر ہو جاتی تو وہ پریشان سی ہونے لگتی تھیں۔

''غازہ ایک لمحے بھی دیر مت کیا کرنہ بلکہ اب یہ سمسٹر مکمل ہونے کے بعد تم گھر پر رہو گی۔'' غازہ جانتی تھی کہ وہ کیوں خوفزدہ ہیں؟

''ممی ہر لڑکی اتنی کمزور نہیں ہوتی اور میں تو بہت مضبوط ہوں۔''

''پھر بھی غازہ۔'' وہ کہتے کہتے رک گئیں۔

''کیا کہنا چاہتی ہیں ممی آپ۔'' غازہ نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر ان کی آنکھوں میں جھانکا آنسوؤں کا ریلا بہہ نکلا تھا۔

''ماہین کو دنیا نے جس طرح لوٹا ہے میں نہیں چاہتی کہ تم بھی اسی طرح برباد ہو جاؤ۔''

''امی آپ رو رہی ہیں آپ فکر نہ کریں جو آپ کہیں گی میں وہی کروں گی۔''

''تو پھر ناصر سے مت ملا کرو۔''

''ناصر سے؟ وہ صرف ایک کرایہ دار اور پڑوسی کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔'' لیکن امی کو تسلی نہیں ہوئی تھی۔

''مجھے ہر انسان سے خوف آتا ہے۔''

غازہ پریشان ہو گئی اس نے لاکھ یقین دلایا لیکن وہ امی کو مطمئن نہ کر سکی۔ وہ ہر وقت افسردہ اور خائف رہتیں۔ ممی کے دکھ کا اندازہ تانی کو بھی ہو گیا تھا اس دن وہ بھائی کی شادی کا ذکر لے بیٹھی۔

''غازہ امی نے بھیا کو جو لڑکی دکھائی تھی وہ انہوں نے ناپسند کر دی ہے۔''

''ہو گی وہ ایسی ہی۔'' غازہ نے ہنس کر اسے چھیڑا۔

''جی نہیں، بہت اچھی سی، پیاری سی ڈاکٹر تھی۔''

''ہائے پھر بھی مسیحا نہ بن سکی۔'' غازہ تانی کی بات ہنسی میں اڑانا چاہ رہی تھی۔

''مجھے معلوم ہے کہ بھیا کے دل پر کس کی حکمرانی ہے؟''

''کسی ملک کی شہزادی کی؟''

''جی ہاں غازہ علی کی، صرف وہی ان کی مسیحا بنے گی ورنہ ......؟''

''وہ تمام عمر یوں ہی تنہا رہیں گے۔'' تانی مسکرائی۔

''افسوس غازہ علی کے پاس ابھی وقت نہیں ہے۔'' غازہ نے مسکرا کر کہا۔

''ٹھیک ہے یہ وقت ممی اور میں نکالیں گے۔''

''نہیں تانی ابھی نہیں امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ بہت اپ سیٹ ہیں۔''

''وہ تمہاری وجہ سے ہیں، دیکھنا یہ خوشی کی خبر سن کر وہ فٹ فاٹ ہو جائیں گی۔'' زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں گزرنے کے بعد کس قدر اہم بن جاتی ہیں خوابوں کی طرح دل کی دنیا میں آباد رہنے والے لمحے مدھر مدھر گیتوں کی طرح مچلتے رہتے ہیں ان لمحوں کی کہانی اپنی کہانی ہوتی ہے کس موڑ پہ یہ لمحے آ کر مل جائیں کچھ خبر نہیں، کس لمحہ بے قراری بڑھ جائے کون جانے کس لمحہ آنکھ بھی تو بھیگ سکتی ہے غازہ علی کی آنکھوں میں نمی تھی نہ کوئی مدھر گیت نہ کوئی لمحہ جو مچل کر ہاتھ چھڑا کر بھاگ جائے۔ سب کے سب آنکھوں کے اردگرد بکھرے پڑے ہوئے تھے۔ ہر لمحہ اپنی کہانی تھی۔ لمحوں کے وہ ننھے ننھے جگنو وہ سیاہ رات میں چمکتے ہوئے تارے مدھر مدھر ہنسی کی آواز فون پر کھنک رہی تھی انگ انگ میں سرشاری، گزری محبتوں کا خواب ناصر کی محبت کے گلاب جو ابھی تازہ تھے وہ گیت جو تانی نے سنائے تھے وہ گزری ساعتیں جن میں ناصر کی چھیڑ چھاڑ تھی وہ تانی کے ذومعنی جملے جن کی زد سے وہ ہر بار بچ جاتی تھی کبھی رکی نہیں گزر گئی، کبھی جان کر روٹھ گئی کبھی مان گئی۔ کبھی ہنس کر ٹال گئی، وہی لمحوں کی کھنک وہی بازگشت، وہی ساعت میں ٹھہرے جملے، وہی بصیرت میں ٹھہرے خواب۔

''پلیز غازہ سیریس ہو جاؤ میری بات تو سنو میں اور اماں کہیں جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔'' تانی کی آواز میں شہد کی مٹھاس تھی۔

''خوشی سے جاؤ میری جان لیکن صرف تھوڑا سا وقت مجھے دے دو، ورنہ کل میں نہ مل سکوں گی۔''

''کیوں کل رخصت ہو رہی ہو کیا؟''

''شاید۔''

''یہ لمحہ بھی آ جائے گا لیکن کل نہیں۔'' تانی نے چھیڑا۔

''تم ابھی اور اسی وقت ساتھ چلو گی۔'' غازہ نے ضد کی۔

''غازہ پلیز اس وقت نہیں۔''

''ابھی اور اسی وقت ورنہ......!'' غازہ نے وارننگ دی تھی۔

''آخر کہاں جانا ہے؟''

''افوہ۔بے وقوف کیا تجھے خبر نہیں کہ میری کیونکس میچ نہیں کر رہی۔'' آخر اس نے ہنس کر بتا ہی دیا۔

''میرے خدا آخری لمحے میں یاد آئی۔''

''تم جلدی سے باہر آؤ میں نیچے اتر رہی ہوں اور کچھ نہیں۔'' غازہ نے ریسیور رکھ دیا۔وہ نیچے اتر رہی تھی تو ماہین کہیں سے آ رہی تھی غازہ نے رک کر پوچھا۔

''آپی میں شاپنگ کرنے جا رہی ہوں آپ چلیں گی؟''

''نو'' ماہین کا لہجہ بجھا بجھا سا تھا غازہ تیزی سے اترتی چلی گئی ساتھ والے گیٹ پر تانی کھڑی تھی اس کے چہرے کی شوخی اس کے انداز کچھ اور تھے اور اس کے انگ انگ سے شرارت پھوٹ رہی تھی۔

''اتنا بتا دوں اماں نے تاکید کی ہے کہ میں جلدی لوٹ آؤں۔'' اس نے کھلے آسمان پر نظر ڈالی دور تک سیاہ بادل تھے اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے۔

''کیا چاند ڈھونڈ رہی ہو؟'' غازہ نے بے ساختہ کہا۔

''نہیں وہ تو مل گیا ہے۔''

''کوئٹہ کے پہاڑی علاقوں میں نظر آ گیا کیا؟''

''ابھی تک تو اعلان نہیں ہوا۔''

''لیکن ملا جی کل عید کروا کر ہی چھوڑیں گے اس لیے سوچا کیوں نہ شاپنگ مکمل کر لی جائے۔''

''تو کیجئے ہماری تو شاپنگ مکمل ہے اور کل ہم عید ضرور منائیں گے۔ارے غازہ کا ررو کو تم تو بہت آگے آ گئیں۔'' تانی نے کہا۔

''چھوڑ و یار کیونکس کا تو بہانہ تھا ورنہ اماں نکلنے نہ دیتیں مجھے تو شکارپور کی قلفی کھانی تھی واہ کیا قلفی ہے۔''

تانی نے اپنا سر پیٹ لیا ''تمہیں خبر ہے کہ میں کتنے اہم کام کر رہی تھی صرف اماں نے اجازت اس لئے دی تھی کہ تم اکیلے جاؤ گی؟''

''میں بھی تمہیں آج ایسا سرپرائز دوں گی کہ یاد رکھو گی زندگی بھر کہ کس لڑکی سے پالا پڑا تھا'' غازہ نے آسمان پر نظر ڈالی نہ چاند، نہ تارے صرف ارد گرد اس قدر رش اور آوازوں کا شور لوگ عید کی شاپنگ

میں مصروف تھے۔

مہندی اور چوڑیوں کی دکانوں میں رنگ برنگے موسموں کی برسات، مہندی کی مہک، دوڑتے بھاگتے لوگ کتنا اچھا لگ رہا تھا ہاتھوں میں کھنکتی ہوئی چوڑیاں، رنگوں کی برسات کی طرح لگ رہی تھیں وہ سب کچھ کتنا خوبصورت تھا پھر وہیں اعلان سنا کہ چاند نظر آ گیا ہے کل عید ہے۔

جب وہ گھر لوٹ رہی تھی تو آنکھ میں ہلکی ہلکی نمی اتر رہی تھی کبھی یونہی بابا دہ اور ماہین آتے تھے زندگی کتنی مطمئن تھی اور آج ادھوری سی زندگی، تانی کو گھر جانے کی جلدی تھی جب کہ رش میں گاڑی پھنس چکی تھی وہ کس قدر بے قراری نظر آ رہی تھی اور غازہ اس ہجوم اور رونق سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

جب وہ واپس آئیں تو رات کا ایک بج رہا تھا تانی غصہ میں پھولی بیٹھی تھی حسب معمول ممی پریشان بیٹھی تھیں ماہین اپنے کمرے میں تھی۔

''تانی کی اماں بھی بہت پریشان ہیں تم لوگوں نے بہت دیر لگا دی۔'' ممی نے بتایا۔

''بس ممی رش بہت تھا گاڑی پھنس گئی تھی۔'' غازہ نے ممی کو جواب دے کر مطمئن کر دیا۔

''لیکن وہ لوگ ابھی تھوڑی دیر میں آنے والے ہیں۔'' غازہ نے پلٹ کر دیکھا آنکھوں میں تجسس سے ممی نے جان لیا کہ وہ بے خبر ہے۔

''غازہ مجھے ناصر بہت پسند ہے وہ لوگ تمہارے لئے کہہ رہے ہیں۔'' غازہ نے نظریں جھکا لیں

''جو آپ فیصلہ کریں ممی۔''

''ناصر کو میں نے تمہارے لئے پسند کر لیا ہے اس غرض سے وہ لوگ آج شب کو آ رہے ہیں تمہیں حق حاصل ہے کہ چاہو تو انکار کر سکتی ہو۔'' چہرے کے رنگ نے اندر کے موسموں کا حال بتا دیا۔

موسم بہار کی پہلی رت آج اتری تھی۔

پھولوں کے ٹوکروں میں سے جھانکتی ہوئی ہری ہری مہندی اس کی بھینی بھینی مہک چاروں طرف پھیل رہی تھی سبز سرخ چوڑیاں، کمخواب کے دوپٹے سے پھوٹنے والی کرنیں۔گلاب کے گجروں کی مہک لازوال رشتوں کی محبت کی مہک من میں سرشاری سی بھر رہی تھی۔

ناصر کی اماں، تانی اور چند خواتین کو لے کر آئیں تھیں اتنی جلدی، اتنا اچانک کہ وہ حیران سی کھڑی رہ گئی۔

کسی طلسم گھر کا در کھلا اور وہ مہک بن کر کسی پھول میں سما گئی۔ رنگ، خواب اور تاروں بھری رات کا سحر سب کچھ تابع تھا زندگی رنگ پھول اور خوشبو کی طرح تھی امی خوش تھیں اور دوپٹا نہیں کہاں تھی۔

ماہین کے علم میں یہ بات تھی کہ ناصر اور وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں لیکن یہ سب اتنا اچانک تھا کہ امی اسے کچھ نہ بتا سکیں نہ ماہین کو۔

ماہین نے ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر بیگانوں کی طرح ممی سے مخاطب ہو کر بولی۔

''ممی میری کیا ضرورت تھی؟''

''کیوں نہیں ماہین تمہارے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔'' امی نے پیار سے ماہین کو دیکھا لیکن ماہین کہیں اور دیکھ رہی تھی۔

تانی اور مہرو نے کتنے پیار سے ہاتھوں میں گجرے باندھے، نازک سی ڈائمنڈ کی رنگ پہنائی ہری ہری مہندی پہلی بار اس کی ہتھیلی پر نکھری۔ لیکن یہ رنگوں کی برسات بہت زیادہ دیر نہ رہ سکی سب لوگوں کے چلے جانے کے بعد ماہین چیخ چیخ کر امی سے کہہ رہی تھی۔

''یہ سب کچھ مجھے جلانے کے لئے کیا گیا ہے آپ مجھے شکست دینا چاہتی ہیں آپ ثابت کرنا چاہتی ہیں کہ غازہ آپ کی انگلی پکڑ کر منزل پا سکتی ہے اور میں نے راستہ کھو دیا ہے۔ یہ سب آپ دونوں کی چال ہے پہلے مجھ سے چھپایا اور اب سب کے سامنے بلا کر مجھے تماشا بنایا آپ کا خیال ہے کہ میں ہارون کے غم میں پاگل ہو جاؤں گی دنیا چھوڑ دوں گی یا کوئی روگ لگا کر گھر میں بیٹھ جاؤں گی اس سے پہلے کہ ناصر غازہ کی زندگی میں آئے میں قانونی طور پر اپنا حصہ الگ کر لوں گی ناصر کی نظریں غازہ پر نہیں اس کی دولت پر ہیں امی آپ سے میرا رشتہ آج سے ختم۔'' وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

امی ساکت کھڑی کی کھڑی رہ گئیں ماہین غصے میں پاگل ہو رہی تھی۔ غازہ آنسو بھری آنکھوں سے ماہین کو دیکھ رہی تھی سب رنگ، ساری خوشبوئیں اڑ چکی تھیں، امی ساری رات سو نہ سکیں ماہین کا کوئی علاج ان کے پاس نہ تھا۔

دوسرے دن عید تھی امی نے آ کر اسے اٹھایا اس کے چہرے پر گہرا اضمحلال تھا وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ بڑی نظر آ رہی تھیں۔ صبح سے مہمان آنے شروع ہو گئے تھے ماہین کمرے میں بند تھی۔

غازہ دبے قدموں اس کے کمرے میں گئی وہ تکیہ میں منہ چھپائے لیٹی تھی قدموں کی آہٹ پر آنکھیں کھول کر دیکھا غازہ نے آہستہ سے انگلیاں اس کے بالوں میں الجھا دیں ماہین اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''پلیز ماہین آپی آج عید ہے آپ باہر آئیں سب لوگ پوچھ رہے ہیں۔''

''میری تعزیت کرنے کے بعد ان کو تم اپنی خوشی کی نوید سنا کر رخصت کر دو۔'' ماہین کی آواز میں اتنی نفرت تھی کہ وہ سن ہو گئی۔

''پلیز آپی معاف کر دیں۔ بخدا ہم لوگ بالکل لاعلم تھے تانیہ نے خاص طور پر سرپرائز دیا تھا آپ اٹھیں بڑے ہال میں آیئے ورنہ لوگوں کو شک ہوگا۔'' ماہین کے وجود میں ایک کرنٹ سا دوڑ گیا اس نے غور سے غازہ کی آنکھوں میں جھانکا۔

''کس بات کا؟''

''وہ کل رات۔'' غازہ گھبرا گئی۔

''نہیں جو کچھ تم کہنا چاہتی ہو میں سب سمجھ چکی ہوں۔'' ماہین کے لہجے میں آگ بھر گئی۔ وہ سکتے کی کیفیت میں بیٹھ گئی۔

''نہیں آپی ایسا کچھ نہیں ہے اب آپ نارمل ہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا اور آپی آج تو ویسے بھی عید ہے میں نے اور آپ نے ہمیشہ پاپا کی موجودگی میں ایک رنگ کی چوڑیاں پہنی ہیں۔'' غازہ نے اپنے ہاتھوں پر نظر ڈالی اور پھر ساری چوڑیاں اتار کر ماہین کے ہاتھوں میں ڈال دیں۔ ماہین نے زہر بھری نظروں سے غازہ کو دیکھا اور چوڑیاں اتار کر پھینک دیں۔

''غازہ تم یہ بات اچھی طرح جانتی ہو کہ میں نے کبھی اترن کو ہاتھ لگانا پسند نہیں کیا۔'' فرش پر دور تک چوڑیوں کے ٹکڑے بکھرے تھے جنہیں کل رات تانیہ غازہ کی کلائی میں ڈال کر گئی تھی۔

ناہموار راستوں پر چلتے چلتے ماہین محبتوں سے بہت دور جا چکی تھی خود غرضی اور خود پسندی نے اسے اندر سے کمزور اور بظاہر دوسروں سے لاتعلق کر دیا تھا دوسروں کو دکھ اور اذیت دے کر وہ مطمئن نظر آتی تھی۔

ماہین دو دن سے گھر نہیں آئی تھی نہ جانے کہاں تھی امی کا پریشانی سے برا حال تھا لڑکی کا معاملہ تھا وہ کسی سے کہہ بھی نہیں سکتی تھیں ماہین کی دوستوں کو فون کیا کہیں سے کوئی سراغ نہ مل سکا۔ آخر تھک ہار کر امی نے ناصر کو سب کچھ بتا ہی دیا اگرچہ بتاتے ہوئے ان کی زبان لڑکھڑا رہی تھی لیکن ناصر کے علاوہ اور کوئی ہمدرد نظر نہیں آ رہا تھا پھر دو دن بعد ناصر نے بتایا کہ آپی شادی کر کے امریکہ جا چکی ہیں۔

''شادی کس سے؟'' غازہ اور امی ساکت کھڑی رہ گئیں امی کو یقین نہیں آ رہا تھا ان کی حالت یکدم بگڑنے لگی۔ غازہ نے انہیں سنبھالا اور سمجھایا۔ اگرچہ جب ناصر نے یہ اطلاع دی تو وہ ناصر سے نظریں بھی نہ ملا سکی تھی یہ بھی نہ پوچھ سکی تھی کہ یہ اطلاع کہاں سے ملی اور کس نے دی اور شادی کب اور کہاں ہوئی؟

ناصر نے ساری تفصیل بعد میں بتائی تھی یہ شادی اعتزاز کے دوست کی کوٹھی میں ہوئی تھی اور دوسرے ہی دن ماہین ہنی مون منانے ملک سے باہر چلی گئی تھی۔

اعتزاز کا نام سن کر امی کو ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا اعتزاز ایک جاگیردار کا عیاش بیٹا تھا اس کا باپ ابو کا قریبی دوست تھا غازہ نے ڈیڈی کے ساتھ اسے زمینوں پر دیکھا تھا اور اس سے مل کر وہ کچھ اچھا تاثر قائم نہ کر سکی تھی۔ اعتزاز کا یونیورسٹی میں عمل دخل زیادہ ہی تھا وہ اکثر وہاں آتا رہتا تھا پھر ناصر سے ہی معلوم ہوا تھا کہ وہ مختلف لوگوں کے لئے مختلف کام کرتا تھا اور یہاں صرف اپنے آلہ کاروں کی تلاش میں آتا ہے۔

جرائم کی دنیا میں اس کا نام سرفہرست تھا یونیورسٹی میں ہونے والی ہر واردات میں وہ ملوث ہوتا تھا ہارون کا وہ قریبی دوست تھا لیکن ماہین کے کب اور کس طرح وہ اتنے قریب آیا کہ وہ اس کا شریک حیات بن گیا؟ غازہ اور امی کو ماہین کی اس حرکت سے زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ وہ اعتزاز کے ساتھ ہے لحہ لحہ زہر ان کی رگوں میں سوچوں میں اتر رہا تھا امی پہلے سے زیادہ پریشان اور فکرمند رہنے لگی تھیں وہ غازہ کے چہرے کو کھوجتی رہتیں کہیں وہ بھی ماہین کی طرح انہیں رسوائیوں اور بدنامیوں کی دلدل میں تو نہیں دھکیل جائے گی غازہ خود تنہا یہ اور ناصر سے دور دور رہتی وہ اپنی نظروں میں خود ہی گر گئی تھی ناصر کو دیکھتی تو کترا جاتی

''غازہ۔'' غازہ کی سانس رکنے لگی یقیناً ماہین کی ہی کوئی بات ہو گی کوئی خبر کوئی دکھ ہو گا۔

''اس میں میرا کیا قصور ہے میں کتنا حصہ دار ہوں غازہ۔'' وہ دکھ سے پوچھ رہا تھا غازہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے وہ چپکے چپکے روتی رہی ناصر اسے دوسری طرف لے گیا اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا بے بسی، خوف، احساس ذلت اسے لگتا تھا کہ سب لوگ ماہین آپی کو ڈھونڈ رہے ہیں کوئی دوست دور سے نظر آتی تو وہ کترا کر گزر جاتی۔

''غازہ، میری طرف دیکھو، ہمارے درمیان جو رشتہ ہے وہ اتنا کمزور نہیں کہ ماہین کی کوئی لغزش ہماری محبتوں کے درمیان حائل ہو جائے۔ ہم ایک دوسرے کے لئے ہیں ہمارے دکھ سکھ ایک ہیں اگر ماہین تمہاری بہن تھی تو میری بھی کچھ تھی مجھے دکھ ہے کل تائی بھی کہہ رہی تھی کہ تم اس سے بات نہیں کرتی ہو اماں بھی پریشان ہیں تم خود کو سنبھالو ماہین وہاں خوش ہو گی۔'' وہ محبت سے سرشار نظر آ رہا تھا اس کے مضبوط ہاتھوں میں غازہ کے نازک ہاتھ پسینے سے بھیگ رہے تھے۔

''غازہ۔'' اس نے ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا آنکھیں نمکین پانی سے لبالب بھری تھیں

''یہ سب کس لئے؟'' وہ اس کی آنکھوں میں ڈوب گیا۔

''پتہ نہیں؟'' غازہ نے آنسو چھپانا چاہے لیکن وہ بے بس ہو گئی۔

''ناصر! دکھ سے زیادہ بے عزتی کا احساس ہے یوں لگتا ہے کہ پورے شہر کو خبر ہے۔'' اس کے آنسو بے اختیار بہنے لگے۔

''پگلی۔'' ناصر نے انگلیوں کی پوروں میں لرزتے قطروں کو سمیٹا اور پھر مسکرایا۔

''جینا سیکھو ہمت کرو اور سب سے کہہ دو کہ ماہین کی شادی بہت جلدی میں ہوئی ہے اس لئے کسی کو نہ بلا سکے۔ اب وہ ہنی مون منانے باہر گئی ہے۔''

''اور وہ۔'' غازہ کہتے کہتے رک گئی۔

''کون اعتزاز؟'' ناصر بھی چپ ہو گیا۔

''وہ ماہین اور اعتزاز جانیں یہ ان کا مسئلہ ہے کہ زندگی کس طرح گزاریں گے؟''

''لیکن ماہین آپی کی طرح اگر اعتزاز نے بھی ہماری زندگی اور گھر میں دخل دیا تو کیا تم اتنے مضبوط ہو کہ مجھے بچا سکو گے؟'' ناصر مسکرایا۔

''آخر وہ ہماری زندگی میں دخل دینے والا کون ہوتا ہے؟''

''پھر بھی ناصر نجانے کیوں میں ڈرنے لگی ہوں یوں لگتا ہے کہ جس دن ماہین آپی اعتزاز کے ساتھ آئیں گی تو ایک نیا طوفان لے کر آئیں گی ہر چند کہ امی اور میں اب ان کے اس احمقانہ فیصلے کو قبول کر چکے ہیں تا کہ ان کو شکایت کا موقع نہ مل سکے پھر بھی۔''

''غازہ مضبوط ارادے سچی محبتوں کو زندگی عطا کرتے ہیں تم میرے اندر زندگی کا احساس بن کر زندہ ہو۔

پھر اعتزاز اتنا طاقتور بھی نہیں کہ وہ ہمارے دلوں سے احساس کو چھین سکے۔ جسم تو کوئی بھی تسخیر کر سکتا ہے لیکن احساسات چرانا کسی کے بس کا کام نہیں۔ پھر تم کیوں خوف اور ڈر سے لرز رہی ہو؟''

''غازہ ریزہ ریزہ ہو جائے گی تو کیا تم تب بھی اسے سمیٹ لو گے؟'' وہ نہ جانے کن طوفانوں سے خوف زدہ تھی۔

''میں بکھرے ہوئے ریزوں سے غازہ علی کا وہی مجسمہ بنا لوں گا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا غازہ سمٹ گئی۔

''اچھا اب تم تانی سے بات کر لو اس نے تمہارے سوگ میں پورے گھر کو سوگوار کر رکھا ہے اماں بھی پریشان رہتی ہیں کہ غازہ دکھی ہے تو یوں لگتا ہے کہ میری کوکھ جل رہی ہے۔'' اس نے غازہ کی سرخ آنکھوں کو مسکرا کر نہ جانے کس جذبے سے دیکھا کہ اس کی ہنسی کے جل ترنگ بج اٹھے ننھی ننھی سیپیاں ہونٹوں کے درمیان مسکرانے لگیں۔

ہر وقت ایک نیا طوفان کھڑا کرنے والی ماہین ایک دن گھر آ گئی نہ شرمندگی نہ احساس جرم بلکہ الٹا ہاتھوں میں قانونی نوٹس لئے کھڑی تھی۔

''امی یہ قانونی نوٹس ہے میں شادی کر چکی ہوں اور ڈیڈی کی وصیت کے مطابق میں اس جائیداد کی وارث ہوں آپ سے ہمارا وکیل بات کرے گا۔'' اس نے مڑ کر اس شخص کی طرف اشارہ کیا جو اس کے پیچھے کھڑا تھا امی جامد تھیں اور غازہ ماہین کو دیکھ رہی تھی جو آگ پر چلنے کے باوجود مطمئن سی کھڑی تھی۔ بے نیازی اور خودسری اس کے انگ انگ سے جھلک رہی تھی کہنے اور سننے کے لئے کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا امی نے صرف اتنا کہا تھا۔

''میری تربیت میں تو کوئی کمی نہیں تھی شاید یہ میری قسمت ہے ماہین ورنہ تم یوں آج سر اٹھا کر اپنے گناہوں پر پردہ ڈال کر بات نہیں کر سکتی تھیں۔'' ان کے لہجے میں شدید کرب تھا۔

''مجھے نصیحت نہیں چاہئے صرف اپنا حق چاہئے۔''

''ماہین آپی آپ کو جو چاہئے وہ مل جائے گا پھر اس سب کی کیا ضرورت ہے؟'' غازہ نے ان کے ساتھ کھڑے ہوئے وکیل کی طرف دیکھ کر کہا۔

''مجھے خیرات نہیں اپنا حق چاہئے۔'' غرور اور نفرت اس کی آنکھوں سے چھلک رہی تھی الگ نہیں رہا تھا

ایک بیٹی ماں سے مخاطب ہے امی نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے قانونی طور پر میں تمہارا حق دے دوں گی لیکن تم میری نظروں کے سامنے سے چلی جاؤ۔''

''میں جا رہی ہوں مگر جس جگہ آپ کھڑی ہیں شاید کل آپ کو یہاں سے جانا پڑے۔'' ماہین جس طرح داخل ہوئی تھی اسی انداز میں تیزی سے مڑی غازہ نے آگے بڑھ کر اسے روکنا چاہا مگر ماہین نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

''مجھے ہمدردی نہیں چاہئے میں کمزور نہیں ہوں اور نہ کسی سے محبت خیرات میں مانگتی پھرتی ہوں۔'' ایک پل میں ماہین ہاتھ چھڑا کر چلی گئی امی دل تھامے بیٹھی تھیں نوکر حیران تھے غازہ امی کو تسلی دیتی یا اپنی بہن کا ماتم کرتی۔ کچھ بھی تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا پورا دن اسی طرح گزر گیا رات کافی گزر چکی تھی لیکن امی ابھی تک جاگ رہی تھیں۔

''امی آپی ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں آج نہیں تو کل آپ نے ان کو یہ دینا ہی تھا اور پھر پاپا نے تو ان کو بیٹا بنا کر یہ خودسری عطا کی تھی آپ کو کس بات کا دکھ ہے جائیداد کی تقسیم کا یا ان کی تکلیف دہ باتوں کا؟'' جواب میں امی کے آنسو بہتے رہے۔

پھر چند مہینوں بعد وہ سب کچھ ہو گیا جس کا غازہ نے زندگی میں تصور بھی نہیں کیا تھا سب کچھ ماہین آپی کی مرضی کے مطابق طے کیا گیا قانونی طور پر وہ کوٹھی جس میں زندگی کے اچھے برس [illegible] گزارے تھے خالی کرنی پڑی یہ کوٹھی پاپا نے اپنی زندگی میں انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے ماہین کے نام کر دی تھی۔ ہینڈ لوم فیکٹری بھی ماہین کے نام تھی باقی کچھ حصہ امی کے نام اور غازہ کے نام تھا تمام حالات سے ناصر اور تانی واقف تھے بلکہ تمام قانونی کارروائی ناصر نے ہی کرائی تھی۔

پندرہ دن کے اندر اندر یہ کوٹھی خالی کرنی تھی ظاہر ہے اب انہیں کسی اور جگہ منتقل ہونا تھا امی سوچ رہی تھیں کہ دوسری کوٹھی جس میں ناصر کے گھر والے رہ رہے تھے خالی کرا لیں کیونکہ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا لیکن ناصر سے کہنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ آخر ایک دن ناصر کی امی نے خود ہی بات کی انہوں نے بتایا کہ ناصر دوسرا گھر تلاش کر رہا ہے۔

''غازہ تو اب آپ کی ہے کیوں نہ اس کوٹھی کو چھوڑنے سے پہلے میں اس کو رخصت کر دوں یہ رخصت ہو کر اپنی کوٹھی میں چلی جائے گی میرا کیا ہے میں کہیں بھی رہ لوں گی ناصر بیٹے سے کہہ دیں کہ وہ

دوسرے گھر کی تلاش میں کیوں ہے؟"

"یہ آپ کی محبت ہے لیکن ناصر نے کرایہ پر دوسرا گھر لے لیا ہے ہم لوگ بس ایک دو دن میں چلے جائیں گے غازہ یوں رخصت ہو کر آئے ہم کو یہ بات پسند نہیں، اور پھر ویسے بھی ابھی اسے ملازمت نہیں ملی ناصر کسی صورت نہیں مانے گا آپ خود بات کر کے دیکھ لیں میں کسی طور بھی بچوں کی خوشیوں میں دخل نہیں دوں گی۔"

رات کسی طوفان کی طرح بھری کھڑی تھی صبح سب سامان پیک کرنا تھا ناصر کا سامان جانے والا تھا اور اس کوٹھی میں وہ ایک مالک کی حیثیت سے داخل ہونے والی تھی۔ یہ کیسا سودا تھا جو آپی طے کر گئی تھیں تانی خوش تھی اسے دکھ نہیں تھا۔

"لو بھلا اس میں رونے کی کون سی بات ہے کیا رخصت ہو کر آ رہی ہو اس گھر میں جو یوں ٹپ ٹپ آنسو گرا رہی ہو۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اب صبح سویرے دیدار نہ ہو سکے گا۔" اس نے چھیڑا۔

"پلیز تانی۔ زخموں پر نمک مت چھڑکو تمہیں نہیں معلوم کہ تنہائی کا احساس کتنا بڑھ جائے گا۔" غازہ اداس تھی اسے معلوم تھا کہ تانی بھی اداس ہے لیکن خودداری اور محبتوں کے بھرم کبھی کبھی ایسے بھی رکھے جاتے ہیں۔ البتہ آنٹی آنسو پونچھ رہی تھیں۔

"غازہ لو آ گئے وہ۔" غازہ نے سر اٹھایا ناصر آ رہا تھا۔

"اب بھیا ہی ان آنکھوں کے سیلاب پر بند باندھ سکیں گے میں تو چلی۔" وہ شرارت سے چلی گئی۔

"غازہ!" وہ مڑی ہی تھی کہ رک گئی۔

"اس میں رونے کی کون سی بات ہے؟" اس کے خشک ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ تھی۔

"میں تو اس دربدری کا عادی ہوں بے وقوف لوگ گھر بناتے ہیں عقلمند رہتے ہیں۔ خیر جی بھر کر رو لو پھر بات کریں گے۔"

"آخر آپ ممی کی بات کیوں نہیں مان لیتے؟" غازہ کی آواز رندھ گئی ناصر نے اس کی ٹھوڑی کو اٹھایا۔

"غازہ!" نہ جانے کن پربتوں سے آواز آئی غازہ میں ہمت نہ تھی کہ وہ آنکھ اٹھا کر دیکھ سکے اور جب اس نے آنکھ اٹھا کر اس کی پیشانی کی طرف دیکھا تو آنکھوں میں اس کا عکس تیر رہا تھا۔ وصل کی شب اور اتنی کالی ناصر کی آنکھوں کے سحر سے کب باہر آتی؟ لمحوں کا وہ پرکشش طلسم ساتھ ساتھ آنچل سے

لٹکا رہا بھلا اس وقت کیا عالم تھا؟ دید کا موسم، قرار کا موسم، جو ایک پل میں محبتوں کے سارے راز افشا کر گیا اور جب سکوت ٹوٹا تو یوں لگا غازہ علی کسی گہری جھیل میں ناصر کا ہاتھ تھامے ڈوب رہی ہے۔ تمام دنیا کی روشنی سے دور بہت دور آکاش تلے صرف نیلے پانی کی جھیل میں ڈوب گئی لیکن آواز کی بازگشت نے واپس لا پھینکا۔

"غازہ میری بات سنو مجھے نظروں میں گرانا چاہتی ہو تو میں گرنے کے لئے تیار ہوں لیکن غازہ یہ محبت نہیں ہو گی صرف سودا ہو گا اگر تم چاہتی ہو تو میں یہ آنسو پونچھ سکتا ہوں ورنہ بہنے دو، میں ایک اور کرائے کے مکان میں چلا جاؤں گا اور تمہارے انتظار کے لمحوں کی بازگشت سنوں گا ملازمت مل گئی تو یہ انتظار ختم ہو جائے گا ویسے بھی میں تنہا نہیں ہوں ایک عدد بہن بھائی اور ماں کا بوجھ میرے کاندھوں پر ہے میں تمہیں اپنی قوت بازو سے حاصل کروں گا۔"

"کٹ سین ختم۔" ناصر اور غازہ نے چونک کر دیکھا تانیہ کھڑی تھی۔ تانی نے اپنے آنچل سے اس کی آنکھوں کے پھیلے ہوئے کاجل کو پونچھتے ہوئے کہا۔

"وصل کی شب اور اتنی کالی۔" تانیہ کی آنکھیں بھیگ گئیں لحہ لحہ ہنسانے والی تانیہ گلے لگ کر رو رہی تھی اس رات ساون دل کھول کر برسا تھا من میں آگ تھی اور باہر برکھا تھی۔

کوٹھی خالی ہو چکی تھی برسوں کی آنکھ مچولی کا کھیل ایک پل میں ختم ہو گیا تھا۔

غازہ اور امی اپنے ہی گھر میں بیگانوں کی طرح رہ رہے تھے ساتھ والی کوٹھی سرکاری طور پر لاک تھی چابیاں ماہین کے پاس تھیں ایک دن سنا کہ وہ کوٹھی ماہین نے بیچ دی۔ امی سارا دن روتی رہی تھیں روئی تو غازہ بھی تھی جس کوٹھی میں بچپن گزرا جہاں اس کے قدموں کے نشان تھے۔ جہاں گزرے لمحوں کی کہانیاں تھیں وہ اب کسی اور کی منتظر تھی۔

ماہین نہ کبھی آئی اور نہ امی اور غازہ اس سے ملیں غازہ کا جب سمسٹر مکمل ہوا تو وقت کاٹنا اس کے لئے دشوار ہو گیا۔ کبھی تانی یا ناصر سے فون پر بات ہو جاتی انتظار اور امید میں وقت گزر رہا تھا پلٹ کر دیکھا تو دو سال کا عرصہ گزر گیا تھا ان دو سالوں میں ناصر اور قریب آ چکا تھا تانی بے حد عزیز ہو چکی تھی آنٹی تو غازہ کو دیکھے بغیر رہ ہی نہیں سکتی تھیں۔ امی دل کی مریضہ تھیں غازہ جب بھی ذرا بیمار ہوتی آنٹی اسے آ کر لے جاتیں کہ یہاں کون دیکھ بھال کرے گا؟ ناصر کو اچھی گورنمنٹ جاب مل چکی تھی انتظار کی

گھڑیاں ختم ہونے کو تھیں کہ ایک دن اچانک ماہین آ گئی وہ بہت پریشان لگ رہی تھی امی سے لپٹ لپٹ کر رو رہی تھی معافیاں مانگ رہی تھی۔

''کیسی ہو غازہ؟''

''ٹھیک ہوں آپی آپ بہت یاد آتی تھیں۔''

''بس کیا کروں زیادہ وقت ملک سے باہر گزر گیا ابھی بھی اعتزاز ملک سے باہر ہیں جانا تو میں بھی چاہ رہی تھی لیکن رک گئی۔'' ماہین بالکل بدلی ہوئی لگ رہی تھی اور یہ جان کر تو غازہ خوشی سے پاگل ہو گئی کہ ماہین آپی رہنے آئی ہیں۔

''سچ آپی جب دوسروں کی بہنوں کو میکے آتے دیکھتی تھی تو آپ بہت یاد آتی تھیں۔'' ماہین مسکرا دی۔ ماہین نے ناصر سے ملنے سے انکار کر دیا تھا۔

''کیوں آپی؟''

''بس یونہی پرانے زخم لو دینے لگتے ہیں میری بربادی میں ناصر کا بہت زیادہ دخل ہے۔'' غازہ نے موضوع بدل دیا۔

''آپی ناصر کو جاب مل گئی ہے۔'' ہزاروں محبتوں کے پھول غازہ کی آواز میں مہک رہے تھے۔

''میں نے بھی سنا تھا۔'' ماہین لاپرواہی سے بولی۔ غازہ چپ ہو گئی وہ جانتی تھی کہ ماہین ناصر کو پسند نہیں کرتی ماہین بہت چپ چپ رہتی تھی ایک دن امی کے سامنے اس نے اپنے دکھ کہہ دیئے۔

''ممی! اعتزاز دوسری شادی کی دھمکی دیتا رہتا ہے کہتا ہے کہ۔'' ماہین کہتے کہتے رک گئی اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

''کیا کہتا ہے؟'' امی نے بے چین ہو کر پوچھا۔

''آپ تو جانتی ہیں کہ میں ماں نہیں بن سکتی حالانکہ وہ پہلے سے جانتا تھا لیکن پھر بھی اس نے شادی کی، اور اب ہر وقت یہ احساس دلاتا رہتا ہے کہ میں قصوروار ہوں میری وجہ سے یہ ہوا۔ اسے وارث چاہئے۔ وہ جاگیردار ہے اس کے لئے جائیداد کا وارث ہونا بہت ضروری ہے ورنہ وہ دوسری شادی کر لے گا۔'' ماہین آپی سسک سسک کر روتی رہی غازہ اس کے دکھ پر روتی رہی امی دکھی سی بیٹھی تھیں۔

ماہین دس دن ان کے ساتھ رہی غازہ تائی کے پاس گئی ہوئی تھی امی اور آپی اکیلی تھیں جب وہ رات واپس آئی تو امی نے بتایا کہ ماہین بغیر بتائے ہوئے نہ جانے کہاں چلی گئی ہے۔ بات خاصی تشویش کی تھی جب غازہ اپنے کمرے میں آئی تو شیلف اور الماری کے پٹ کھلے ہوئے تھے اس نے جلدی جلدی دیکھا لیکن وہاں کچھ نہیں تھا ماہین زیورات اور نقدی سب کچھ لے کر چلی گئی تھی بکھری ہوئی چیزیں اس کا راز افشا کر رہی تھیں۔

وہ کہاں گئی کچھ پتہ نہ چل سکا پولیس تک رسائی ان کی اپنی ذلت تھی۔

امی کی آخری پونجی بھی لٹ گئی یہ دکھ بھی وہ جھیل گئیں۔

لیکن امتحان کی گھڑی ان کے سامنے تھی جب امی کو تیسرا ہارٹ اٹیک ہوا زندگی کی آخری سانسوں میں غازہ ان کے پاس کھڑی تھی ناصر، تائی اور آنٹی بھی موجود تھیں لیکن امی کی روح کا ناطہ ایک پل میں ٹوٹ گیا وہ ایک طوفانی شب تھی جب غازہ ساکت بیٹھی تھی اور ناصر ماہین سے رابطہ کر رہا تھا تب ہی پتہ چلا کہ ماہین امریکہ میں ہے اسے اطلاع مل گئی تھی وہ فون پر کہہ رہی تھی کہ وہ بہت جلد وطن لوٹ رہی ہے ماہین کی آمد کی خبر نے غازہ کو ساکت کر دیا امی دکھوں سے نجات پا گئیں شاید ابھی اس کے امتحان باقی تھے اس کے دکھوں میں اضافہ کرنے کے لئے ماہین ایک ہفتے بعد ہی آ گئی غازہ نے اسے دیکھ کر نفرت سے منہ موڑ لیا ماہین کے چہرے پر کوئی ندامت یا اداسی کا احساس نہیں تھا گھر میں موجود عزیز و اقارب ماہین کے اصل روپ سے ناواقف تھے یہ بات وہ خود بھی جانتی تھی چند ہی گھنٹوں میں اسے یہ احساس ہو گیا کہ غازہ ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب ہے اس لئے ملنے جلنے والوں پر پابندی عائد کر دی گئی ماہین براہ راست اس کی زندگی میں مداخلت کرنے لگی اس کے احتجاج پر ماہین نے اسے ذہنی مریضہ بنا دیا۔

''تم ابھی میچور نہیں ہو تم نے زندگی کو اس رخ سے دیکھا ہی نہیں ہے اب تم ناصر سے نہیں ملو گی ممی اور تمہاری سوچ غلط تھی تم تو صرف ممی کا آنچل انگلی سے پکڑ کر چلنے والی لڑکی ہو تمہاری قسمت کا فیصلہ میں کروں گی ناصر آج سے یہاں نہیں آئے گا۔'' جتنا غازہ نے احتجاج کیا ماہین کی سختی بڑھتی گئی غازہ نے اسے گھر سے چلے جانے کو کہا تو ماہین نے انکار کر دیا۔ غازہ نے گھر چھوڑنے کی دھمکی دی تو ماہین نے کمرے میں بند کر دیا۔ ٹیلی فون منقطع اور ملازم نکال دیئے گئے۔ غازہ قید تھی غازہ نے رو رو کر ماہین کے پیر پکڑ کر منت کی۔

"آپی آپ کو جو چاہئے آپ لے جائیں صرف مجھے یہاں سے جانے دیں۔" غازہ التجا کر رہی تھی ماہین ہنس رہی تھی۔

"تمہارے جانے سے تمہارا جن اتر تھوڑی جائے گا۔"

"جن؟"

"ہاں جن، وہ جن، وہ عشق جو تم پر غالب ہے ناصر کی محبت سے تم اتنی آسانی سے دستبردار نہیں ہوسکتیں۔" وہ طنزیہ مسکرائی۔

"اگر یہ میرا امتحان ہے تو میں ناصر سے دستبردار نہیں ہوسکتی۔" غازہ نے بھی کہہ دیا۔

"تمہارے راستے میں بہت خار آئیں گے باز آجاؤ غازہ۔"

"میں برداشت کی حد سے گزر جاؤں گی۔" پھر یہی ہوا غازہ نے ہر ظلم برداشت کیا لیکن جھکی نہیں ہر دن انتظار میں گزرا لیکن ناصر نہیں آیا کیوں نہیں آیا، وہ یہ جان نہ سکی وہ قید تھی اور اعتزاز کے رحم و کرم پر۔ اسے اعتزاز کی صورت سے نفرت تھی وہ واقعی ذہنی دباؤ کا شکار ہوگئی۔ کھانے پینے سے انکار نے لاغر اور بیمار کر دیا جو بھی ڈاکٹر اعتزاز کے ساتھ آتا اسے ذہنی مریضہ اور پاگل سمجھتا غازہ چلاتی تو وہ انجکشن دے دیتا۔ وہ سو جاتی سو کر اٹھتی تو پھر التجا اور فریاد لیکن سننے والا کون تھا ملازم اور پہرے دار اسے پاگل سمجھتے تھے اور وہ اپنی بے بسی پر روتی۔

ایک دن ماہین کہہ رہی تھی کہ تم اسی طرح چیخ چیخ کر مجھے ڈسٹرب کرتی رہیں تو میں تمہیں پاگل خانے میں داخل کرا دوں گی۔"

"کرا دو، تمہاری قید سے وہ پاگل خانہ بہتر ہوگا۔"

"اگر تم یہی چاہتی ہو تو ایک دن یہ بھی ہو جائے گا مجھے تو تمہاری صورت دیکھ کر ترس آجاتا ہے۔"

"ان پیپرز پر دستخط کر دو۔" ایک دن ماہین نے کہا۔

"یہ کس چیز کے کاغذات ہیں؟" غازہ نے پوچھا۔

"اچھا ابھی اتنا ہوش ہے میں تو سمجھتی تھی کہ تم بغیر دیکھے سائن کر دو گی۔ خیر، دیکھا و کیا ہے یہ تمام کاغذات ڈیڈی کی اس جائیداد کے ہیں جس کی ای مالک بنی بیٹھی تھیں اور یہ کاغذات تمہاری اپنی ہی کوٹھی کے ہیں ان پر تمہیں دستخط کرنے ہیں۔"

"میں یہ دستخط نہیں کروں گی۔"

"تو رہائی ناممکن ہے۔" غازہ رہائی کے لئے کچھ بھی کر سکتی تھی وہ راضی ہوگئی۔ اس نے ان کاغذات پہ دستخط کر دیئے اسے معلوم تھا کہ ماہین یہ کوٹھی بیچ رہی ہے اس کا خیال تھا کہ شاید اس کوٹھی کے ساتھ اسے بھی رہائی مل جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا ماہین اپنے وعدے سے پھر گئی احتجاج پر کہنے لگی۔

"تم نارمل نہیں ہو اس لئے میں نے تمہیں جھوٹی تسلی دی تھی۔" غازہ کی آخری امید بھی ختم ہوگئی اس نے شور مچایا، دروازے پیٹے پڑوسیوں کو آواز دی مدد کے لئے پکارا تو ماہین نے اعتزاز کے ساتھ آ کر کہا۔

"اعتزاز تمہاری چچی جس پاگل خانے میں قید ہیں وہیں اس کو بھی پہنچا دو جب اس کے دماغ سے احتجاج اور ناصر دونوں نکل جائیں گے تو واپس لے آنا۔"

ڈاکٹر کو اعتزاز لے آیا ماہین نے زبردستی اسے انجکشن لگوایا وہ ڈاکٹر سے کہتی رہی کہ پلیز اس نمبر پہ رنگ کر کے میری کیفیت بتا دیں لیکن ماہین نے اسے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا، وہ ڈاکٹر کو بتا رہی تھی کہ اس کی یہ کیفیت ممی کے انتقال کے بعد سے ہے اسی طرح کے دورے ممی کو بھی پڑتے تھے یہ موروثی بیماری ہے ڈاکٹر نے اسے انجکشن لگا دیا غازہ کو یوں لگا کہ وہ جیسے کسی گہرے غار میں گرتی جا رہی ہو آنکھ کھلی تو وہ کسی اور جگہ تھی اور ایک عورت زنجیر کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔

وہ حیران تھی کہ یہاں کیسے آئی؟ اس عورت نے بتایا کہ جب وہ یہاں لائی گئی تھی تو بے ہوش تھی

"تم کون ہو؟"

"میں ایک بے بس اور انصاف مانگنے والی عورت ہوں۔"

"تمہیں یہاں کس نے قید کیا؟"

"اعتزاز نے۔"

"کس جرم میں؟"

"میرے شوہر کے انتقال کے بعد اعتزاز نے میری بھی موت کا جھوٹا سرٹیفکیٹ دے کر میری جائیداد پہ قبضہ کر لیا تھا میں نے عدالت میں بیان دیا کہ میں زندہ ہوں تو اس نے مجھے قید کر دیا میں یہاں دو سال سے قید ہوں میں موت مانگتی ہوں تو وہ کہتا ہے کہ اتنی آسانی سے رہائی ممکن نہیں خود سسک سسک کر مرو اور قانون کو آواز دو۔"

"یہ کون سی جگہ ہے؟"

"یہ گاؤں ہے اور اعتزاز کی اپنی جیل ہے۔" وہ ایک ان پڑھ اور مظلوم عورت تھی ان دونوں کے دکھ ایک تھے دولت کی ہوس نے انہیں یہاں قید کر رکھا تھا۔

اعتزاز دو دن بعد آیا وہ اس کی منحوس صورت دیکھنے کی بھی روادار نہ تھی پھر بھی اس نے اس کی منتیں کیں

"پلیز مجھے جانے دیں آپ جو بھی کہیں گے وہی کروں گی۔"

"تمہیں اب آزادی دینا میرے اختیار میں نہیں رہا کل تک یہ ماہین کا معاملہ تھا اب ملک اعتزاز حسن کے قید خانے میں ہو یہاں سے ایک پرندہ بھی اڑ کر باہر نہیں جا سکتا یہ شہر نہیں یہاں دور دور تک ہمارے پہریدار ہیں زندان کے سات دروازے ہیں لیکن ہر دروازے پر پہرہ دار موجود ہے چاہو تو اس زندان کا چکر لگا لو واپس اسی در پر لا کر ڈال دے گا تمہاری آزادی ہمارے لئے خطرہ ہے اور تم ماہین کی امانت ہو۔" وہ خباثت سے ہنسا اور دروازے پر کھڑا رہا اس کے چہرے پر جو شیطانیت نمایاں تھی اس سے وہ لرز گئی وہ اسے غور سے دیکھتا رہا۔

"تم بہت خوبصورت ہو۔" وہ مکروہ انداز میں ہنسا وہ عورت اس کو دیکھ کر کوسنے لگی، وہ چند لمحے کھڑا رہا پھر چلا گیا غازہ رات بھر نمازیں پڑھ کر دعائیں مانگتی رہی۔

ایک دن اچانک اس زندان میں ہلچل مچ گئی بوڑھی عورت نے کان لگا کر سنا پھر بولی۔

"ذرا تم بھی غور سے سنو آج یہاں کچھ ہونے والا ہے۔"

اعتزاز کی آواز آئی۔ "سندھ میں فوجی آپریشن کا رخ اس طرف ہے اور بھاری تعداد میں کمانڈوز ایکشن ہوگا اس لئے یہاں قائم تمام کیمپ گاہیں ختم کر دی جائیں چرس اور ہیروئن گھروں میں منتقل کر دی جائے۔ تمام ملازموں کو چھٹی دے دی جائے تمام داخلی راستوں سے گارڈ ہٹا دیئے جائیں کیٹل فارم میں دوبارہ گھوڑے داخل کر دیئے جائیں یہاں پر کوئی نشان نہ ہو۔" اس کی سانس پھول رہی تھی۔

دوسرا ساتھی جو پولیس وردی میں تھا کہہ رہا تھا "سر ہم آپ کے پرانے خادم ہیں آپ کی اترن یہ وردی ہے بھلا ہم کیسے اطلاع نہ دیتے۔ جتنی جلدی ہو سکے اسلحہ یہاں سے ہٹوا دیا جائے۔"

"لیکن یہ نشاندہی کس نے کی ہے؟ بغیر ثبوت کے کچھ نہیں ہو سکتا فوج کا ان گھنے جنگلوں میں پہنچنا ناممکن تھا پھر یہ کیسے ہوا؟"

"سر ہمارے ذرائع کے مطابق ناصر نام کا کوئی جرنلسٹ ہے جس نے ان خفیہ ٹھکانوں کی نشاندہی کی ہے۔"

"ناصر!" وہ غصے سے بڑبڑایا غازہ ہٹ گئی۔

"ناصر۔" تو ناصر جانتا ہے کہ میں یہاں قید ہوں لیکن اس نے بہت دیر کر دی۔

جب غازہ علی ریزہ ریزہ ہو گئی تب وہ اسے ڈھونڈنے آ رہا ہے جھوٹی صحافت کے ٹھیکے داروں میں ناصر نے خود کو منوا ہی لیا لیکن کیا وہ اتنا طاقت ور ہے کہ سیاست دانوں کے مقابل، جاگیرداروں، وڈیروں صنعت کاروں اور بیورو کریٹس کا مقابلہ کر سکے گا فوجی آپریشن کے ذریعے ملک سے کیا یہ قید خانے مٹا دیئے جائیں گے جہاں ہر دن ایک غازہ خاک ہوتی ہے ڈھول تک نہیں ملتی کتنی برق رفتاری سے یہاں موجود اسلحہ اور ہیروئن غائب کی جا رہی ہے۔

تب ہی قید خانے کا بالائی دروازہ کھلا اور بھاری قدموں کی آواز سنائی دی سامنے اعتزاز کھڑا تھا۔ اس کی بھاری آواز گونجی۔

"آخر مجنوں نے لیلیٰ کو ڈھونڈ ہی لیا لیکن کیا تو اسے زندہ بولتی ہوئی ملے گی؟ ہرگز نہیں ملے گی۔" اس نے پیچھے کھڑے ہوئے ملازموں کو اشارہ کیا جو اسلحہ سے لیس کھڑے تھے۔

"لے جاؤ اس کو اور کسی بیابان میں لے جا کر گولی مار دو آج رات یہاں چھاپہ پڑے گا اس کو ایسی جگہ گولی مار، کہ اس کا نشان بھی نہ ملے۔" وہ یہ سن کر ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئی۔

صبح کی تیز روشنی اس کی آنکھوں پر پڑی تو اسے احساس ہوا کہ وہ سو رہی تھی پھر اسے احساس ہوا کہ وہ آزاد ہے وہ اٹھ گئی۔

سورج سر پر چڑھ آیا تھا وہ اٹھی تو نقاہت سے لڑکھڑا گئی حلق خشک ہو رہا تھا وہ چلتی ہوئی لب سڑک آ گئی چاروں طرف دیکھا اور پھر ایک سمت چلنے لگی کسی کا دروازہ کھلا دیکھا تو اس نے دستک دی ایک عورت نمودار ہوئی تو وہ کچھ نہ کہہ سکی بس آنسوؤں سے چہرہ بھیگ رہا تھا اس نے لاکر دس کا نوٹ تھما دیا۔ غازہ نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا پھر بولی۔

"پلیز آپ صرف پانی پلا دیں۔" وہ نقاہت سے گر گئی۔

پانی پی کر جب ہوش آیا تو کافی عورتیں جمع ہو چکی تھیں غازہ نے اپنی انگلی کی انگوٹھی اتار کر کہا

''پلیز اس کو بیچ کر پیسے لا دیں اور مجھے کراچی کے لئے بس میں بٹھا دیں میں آپ لوگوں کی شکر گزار رہوں گی۔''سب نے اسے تسلی دی''تھوڑی دیر آرام کر لو، اور یہ انگوٹھی بھی تم واپس پہن لو ہم لوگ سب خود کر دیں گے تم آج ہماری مہمان ہو۔''

''نہیں پلیز اب میں جانا چاہتی ہوں صرف آپ لوگوں کی دعا اور رہنمائی چاہیے۔''تمام راستے وہ اپنا چہرہ چھپائے رہی کہیں کوئی مل نہ جائے کہیں اعتزاز اس کے پیچھے نہ آ رہا ہو اندیشوں میں گھری غازہ دوسرے دن کراچی پہنچ گئی۔ بھول وصال غازہ علی پاؤں میں زخموں کو سجائے اب کس ڈیوڑھی کو پار کرے؟ اس اندھیرے میں کوئی جگنو نہیں کہ وہ اس کی سمت دوڑ کر کسی آنگن میں اتر جائے۔ کسی کنج میں اڑتی ہوئی تتلی کو پکڑنے کی خاطر وہ دوڑتی دوڑتی دور نکل جائے تھک کر آئے تو امی کے آنچل میں چھپ جائے۔ وہ چلتے چلتے رک گئی آنسو تواتر سے بہنے لگے آبلہ پا جب منزل مقصود پر پہنچی تو پتا چلا کہ ناصر یہ گھر بھی چھوڑ کر کہیں جا چکا ہے البتہ اسے ناصر کے آفس کا پتہ مل گیا تھا وہ تھکی ہاری اس سمت چل دی۔

''غازہ!''ناصر اسے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ یوں غازہ ایک دن خود اس کے سامنے آ جائے گی آج پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ وہ بات کرنا چاہ رہی تھی لیکن آنسوؤں نے گلا بند کر دیا تھا وہ کوشش کے باوجود کچھ نہ کہہ سکی ناصر کو اس کی حالت کا اندازہ ہو گیا۔

''ٹھیک ہے غازہ تم فوراً میرے ساتھ آؤ۔''وہ اس کا بازو پکڑے ہوئے آفس سے باہر لے آیا غازہ پیروں کے نیچے خلاء محسوس کر رہی تھی اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ گر جائے گی۔

جب اس نے کار اسٹارٹ کی تو وہ غازہ سے مخاطب ہوا۔

''ٹیک اٹ ایزی اب تم مل گئی ہو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''دل کا بھرا سمندر ناصر کے سامنے پھٹ رہا تھا ایک لمحہ کی چھاؤں نے برسوں کی دھوپ کو بکھیر دیا تھا وہ تمام راستے آنسو بہاتی رہی ناصر دلاسا دیتا رہا وہ جس کہانی کے اختتام پر برس گزر گیا تھا وہ ناصر کو سنا رہی تھی۔

''مجھے سب معلوم ہے غازہ۔''ناصر کہہ رہا تھا۔

''پھر بھی تم نے اتنی دیر کر دی؟ ناصر! میں مر گئی ناصر لمحہ لمحہ تمہارے انتظار میں کہ تم آؤ گے۔''

''کوئی راستہ کوئی سراغ نہ ملا کہ تم کہاں ہو ہر بار ماہین نے لوٹا دیا ہر بار اس نے کہا کہ وہ تم سے ملنا نہیں

چاہتی میں مایوس ہو گیا لیکن غازہ محبت کبھی مایوس نہیں ہوئی مجھے یقین تھا کہ تم مجھے ضرور ملو گی۔''

''بس ناصر اب میں تمہاری محبت نہیں ہوں میں جس آگ میں جل چکی ہوں اس نے ہمارے درمیان ایک خلیج حائل کر دی ہے اب ہم دریا کے دو کنارے ہیں جو کبھی نہیں مل سکتے۔''وہ آنسو صاف کر رہی تھی۔

''خیر تم بہت تھکی ہو مزید ذہن پر بوجھ مت ڈالو۔''''گھر آ گیا تھا وہ گھر میں داخل ہوتے ہی ٹھٹھک گئی آئی اس حالت میں دیکھ کر واپس نہ نکال دیں کہیں تانی، وہ تانی نہ رہے پھر ہزاروں اندیشوں میں گھری جب وہ داخل ہوئی تو سب کچھ وہی تھا وہ اماں سے لگی رو رہی تھی تانی بھی لپٹ لپٹ کر رو دی تھی

''اماں میں غازہ نہیں اب دھول ہوں۔''

''اماں غازہ بہت تھکی ہوئی ہے اسے آرام کی سخت ضرورت ہے۔''ناصر نے کہا غازہ نے بوڑھی آنکھوں کی طرف ڈرتے ڈرتے دیکھا وہی محبت، وہی نرمی تھی وہ مجرم کی طرح سر جھکائے بیٹھی تھی۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا تم آرام سے یہاں رہو یہ گھر آج بھی تمہارے لئے ہے۔''وہ نیم جان سی گرنے والی تھی کہ ناصر اور تانیہ نے تھام لیا۔

جب کچھ طبیعت بحال ہوئی تو اس کا ایک ہی سوال تھا۔

''ناصر تمہیں کیسے خبر ہوئی کہ میں وہاں ہوں؟''ہر بار وہ ٹال گیا اس نے گھر میں بھی کہہ رکھا تھا کہ غازہ کو یہ پتہ نہ چلے کہ ماہین کہاں ہے ورنہ اسے دکھ ہو گا ابھی وہ کمزور ہے لیکن اس کہانی کا ایک دن اس کے سامنے اختتام ہو گیا۔

اسے معلوم ہو گیا کہ ماہین ہیروئن اسمگل کرتے ہوئے پیرس ایئرپورٹ پر گرفتار کر لی گئی اس نے ناصر کے نام خط لکھا تھا جس میں اپنے گناہوں کا اعتراف کیا تھا اور اپنی مجبوریوں کے بارے میں بھی بتایا تھا کہ اعتزاز نے غازہ کو قید کر کے ماہین کو دھمکی دی تھی کہ اگر ماہین نے اسمگلنگ میں اس کا ساتھ نہ دیا تو وہ غازہ کو مار ڈالے گا اس نے غازہ پر کی گئی زیادتیوں کا حساب اس طرح چکایا تھا کہ اس قید خانے کی تفصیلات حکومت پاکستان اور ناصر کو بھیج کر خود سزائے موت کے لئے تیار تھی۔

ملک اعتزاز فائرنگ میں مارا گیا۔ تنہا غازہ کے لئے یہ دکھوں اور رسوائیوں کی داستان تھی ماہین کے ماتھے پر لگنے والے جرم اس کے جرم تھے وہ [illegible] سے خوف زدہ تھی کہ وہ اسے نہ جانے کیا سمجھتے ہوں

گئے اس نے پناہ ضرور اس گھر میں لی تھی لیکن تمام محبتیں اسے رحم اور ہمدردی لگتی تھیں تانیہ اور ناصر کے منع کرنے کے باوجود اس نے فائن آرٹ اسکول میں جاب کر لی۔

نارمل تو وہ ہوگئی لیکن اس کے زخموں نے اسے پہلے سے زیادہ حساس بنا دیا تھا وہ اپنی انا کے خول میں بند ہو کر رہ گئی تھی اس کے دل کا دروازہ ناصر کے لئے بھی بند ہو گیا تھا بار بار لمحوں نے دستک دی وہ نظر انداز کر گئی ایک سال گزر گیا وہ ساکت مجسمہ کی طرح پتھروں میں رنگ بھرتی رہی۔

ایک دن اُس نے اماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہہ ہی دیا۔

''اماں اب میں وہ غازہ نہیں رہی میں آپ کی محبتوں کے قابل نہیں ہوں'' ''تم ناصر اور تانی کی خوشی ہو مجھے اپنی اولاد کی خوشی سے بڑھ کر کچھ بھی عزیز نہیں ہے۔'' اماں نے اسے پیار سے گلے لگا لیا۔

''یہ آج اتنا پیار اور ناز برداریاں کس لئے ہو رہی ہیں؟'' ناصر نے دیکھ لیا تھا اماں تو چپ رہیں البتہ تانیہ بول اٹھی۔

''کچھ نہیں بھیا بے جان مجسموں میں رنگ بھرتے بھرتے یہ ہمارے احساسات کو جھٹلا رہی ہے اسے ہماری محبتوں پر اعتبار نہیں رہا۔'' تانیہ منہ پھلا کر غصے کا اظہار کر رہی تھی۔

غازہ بالکل خاموش تھی نہ کوئی جواب اور نہ ہی کوئی سوال گھر میں خاموشی چھا گئی ناصر ناشتہ کی میز سے اٹھ گیا۔

''اچھا میں تو اب چلا۔'' اس نے کوٹ پہنا غازہ بھی کھڑی ہوگئی غازہ کو وہ اسکول ڈراپ کرتا ہوا آفس جاتا تھا۔

''غازہ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔''

''کہئے۔'' اس نے نظریں اٹھائیں۔

''آخر تم ہمیں کس بات کی سزا دے رہی ہو کیوں تم نے ماحول کو اتنا سنجیدہ بنا دیا ہے تم اپنی دنیا میں کیوں قید ہو کبھی اس دنیا سے باہر نکل کر بھی دیکھو۔''

''پلیز ناصر! میں اس موضوع سے اب تھک گئی ہوں تم کسی بھی لڑکی سے شادی کر لو بہت خوش رہو گے۔''

''میں اس دل کا کیا کروں جسے تمہارے سوا کوئی اچھا نہیں لگتا اور دیکھو ناں تمہاری موجودگی میں کون

لڑکی لفٹ دے گی؟ جب سے تم اس گھر میں آئی ہو محلے کی تمام لڑکیوں نے لفٹ کرانی بند کر دی ہے اب بھلا ان حالات میں کون ناصر کو دیکھے گا؟'' اس نے گاڑی کے مرر میں اپنی شکل دیکھی۔

''نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں اور بال بناؤں کس کے لئے؟

یہی ہے ناں؟'' اس نے غازہ کے چہرے پر نظر ڈالی وہ بالکل سپاٹ چہرے کے ساتھ بیٹھی تھی ناصر نے یکدم تیزی سے بریک لگائے غازہ نے اس کی طرف دیکھا، وہ ہنس رہا تھا کبھی اس کی اس حرکت پر غازہ اسے فوراً گھور کر دیکھتی تھی ناراض ہوتی تھی لیکن آج وہ اسے خالی خالی نظروں سے دیکھ رہی تھی ناصر بولتا رہا اور وہ سنتی رہی۔

وہ ڈراپ کر کے چلا گیا اس نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ مئی کی چلچلاتی سہ پہر تھی جب وہ اسکول سے گھر پہنچی آواز اماں کی ہی تھی۔

''ناصر آخر کب تک انتظار کرو گے؟ اگر وہ اپنی ضد پر قائم ہے تو تم اپنی ضد چھوڑ دو۔''

''نہیں میں کسی دوسری لڑکی کو قبول نہیں کر سکتا اگر آپ مجھے عمر بھر دکھی دیکھنا چاہتی ہیں تو آپ کی مرضی ورنہ میں کسی صورت تیار نہیں ہوں۔''

''لیکن ناصر یہ لڑکی خود غازہ نے بتائی ہے اور ہم سب کو بھی ایک نظر میں پسند آگئی ہے۔''

''تو پھر اسے کہئے کہ وہ بھی خود اپنے لئے کیوں نہیں دانش کو پسند کر لیتی؟''

''یہ دانش کون ہے؟''

''وہ آرٹ اسکول کا مالک جس نے غازہ کو پرپوز کیا ہے۔'' غازہ سن سی رہ گئی ناصر کو یہ بات کیسے پتہ؟ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

''جائیے اسے کہئے کہ وہ پہلے دانش کا انتخاب کرلے پھر میں بھی تیار ہوں۔'' وہ غصے سے اٹھا اور تیزی سے اوپر کا زینہ طے کرنے لگا لیکن آخری سرے پر غازہ کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔

''غازہ!'' آواز میں نہ جانے کیسا تحکم اور جلال تھا کہ غازہ ٹھہر گئی اسے لگا کہ وہ زمین سے چپک گئی ہے۔

''دانش کو کس دن ہاں کہہ دوں صرف تمہاری اجازت کی ضرورت ہے؟''

''جی۔'' وہ لرز گئی غصہ اور جلال سے پر آواز آئی۔

''اپنے قیمتی مشورے اپنے پاس رکھا کرو، آج سے ناصر تمہارے آگے کبھی دست سوال دراز نہیں کرے گا اگر کسی پسند یا چوائس کا حق ہے تو وہ میری ماں کو جس کو میں خوش دیکھنا چاہتا ہوں اس بہن کو جو مجھے سب سے پیاری ہے ان کا فیصلہ محبتوں سے کیا گیا فیصلہ ہوگا تم کو یہ کس نے حق دیا کہ تم میرے لئے کسی لڑکی کا انتخاب کرو شاید دانش کی نظروں کا سامنا نہیں کر سکیں یا اس کی مدد کر رہی ہو کس لئے تم نے اس کی بہن کو اماں اور ثانیہ سے ملوایا ہے کیا لے جاؤں اماں اور ثانیہ کو کہ میں نے اس دانش کو غازہ کے لئے منتخب کر لیا ہے لیکن میں ایسی حماقتوں میں کیوں پڑوں کون ہوتا ہوں میں تمہارا؟ آج سے ناصر تم سے کوئی طلب نہیں رکھے گا۔'' وہ غصے سے پیر پٹختا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا غازہ نے ناصر کا غصہ پہلی بار دیکھا تھا وہ لرز گئی۔

دوسرے دن ناصر آفس نہیں گیا سب پریشان تھے وہ بار بار اس کے کمرے کے چکر کاٹ رہی تھی اکیلے کیسے جائے؟ ماحول میں سوگواری طاری تھی اماں کئی بار اس کے کمرے کے چکر لگا چکی تھیں لیکن وہ کمرے میں بند تھا وہ اماں کے سامنے مجرم سی بنی بیٹھی تھی نہ بولی اور نہ اسکول جا سکی۔ وہ اس گھر میں آج پہلی بار محسوس کرنے لگی کہ وہ ایک بوجھ ہے وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

''غازہ تمہاری وجہ سے بھیا ہرٹ ہوتے ہیں آخر ان کی ضد ٹوٹ گئی اور تمہاری ضد نے ہمارے دلوں کی وہ خوشی چھین لی ہے جس کا ہم نے برسوں انتظار کیا تھا پتا ہے غازہ ان کی نظر انتخاب کس پر گئی ہے اور انہوں نے کس کا نام لیا ہے؟'' ثانیہ کہہ رہی تھی۔

''کس کا؟'' وہ ہمہ تن گوش تھی۔

''نزہت افتخار کا۔''

''نزہت۔'' غازہ کو بھی چکر آ گیا۔

''لیکن صرف نزہت ہی کیوں؟''

''وہ گرین کارڈ ہولڈر ہے شاید بھیا اسی کے ذریعے یہ ملک چھوڑ دیں گے اماں راضی ہیں ہماری خوشیاں تمہاری ایک ہاں میں تھیں غازہ لیکن تم نہ جانے کیوں اپنی ضد پر اڑی ہوئی ہو۔ خیر ہماری دوستی قائم رہے گی اگر ناصر بھیا چلے گئے تو ہم لوگ تنہا کس طرح رہیں گے غازہ؟'' وہ رو رہی تھی۔

''مجھے نزہت بالکل پسند نہیں ہے اسے اپنی دولت پر غرور ہے اور شکل تو دیکھو کس طرح غرور سے بات

کرتی ہے مجھے تو اسی دن معلوم ہو گیا تھا کہ یہ بھیا کو پھنسانے کے چکر میں ہے کس طرح اٹھلا اٹھلا کر باتیں کر رہی تھی تمہیں بھی تو اندازہ تھا اب تو خوش ہو کل اماں نے ہاں کہہ دینی ہے غازہ۔'' وہ رونے لگی۔

ماحول اس قدر سنجیدہ ہو جائے گا اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا۔

اور آج تو مکمل دستبرداری کا دن تھا اماں نے ہاں کہہ دی تھی لڑکی والے مطمئن تھے لیکن یہ کیسا اضمحلال تھا جو آج سب پر طاری تھا ناصر پہلے والا ناصر ہی نہیں تھا خاموشی اور چپ نے سارے گھر کو اپنے حصار میں لے لیا تھا ثانیہ خاموش رہتی تھی اماں اداس نظر آتیں اور غازہ، جو اندر سے ٹوٹ گئی تھی اپنی انا کو باقی رکھنے کے لئے مسکراتی تو یوں لگتا کہ وہ سب کے زخموں پر نمک چھڑک رہی ہے کتنی بے کیف زندگی ہو گئی تھی۔ وہ مجرم کی طرح سر جھکائے داخل ہوتی اور خاموشی سے اپنے کمرے میں لیٹی رہتی اس میں اب ہمت نہیں تھی کہ وہ ناصر کا سامنا کرتی وہ ہر روز ناصر سے پہلے نکل جاتی اور ناصر سے پہلے ہی گھر واپس آ جاتی۔

''آخر کب تک ناصر سے چھپ کر زندگی بسر کرو گی دیکھ لیا اتنا آسان نہیں محبتوں کو جھٹلانا تم نے بچوں کا کھیل سمجھا تھا آج کیا ہوا تم اس گھر میں اب کہاں جاؤ گی ننگے پاؤں چلتے چلتے تمہیں اس دھوپ میں ایک درخت کا سایہ بھی میسر نہ آئے گا۔'' یہ کیسا درد تھا جو جاگ اٹھا تھا اس نے آنکھیں بند کیں تو ناصر کا سراپا سامنے کھڑا نظر آیا اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں ناصر کے کمرے سے ہلکی میوزک کی آواز آ رہی تھی وہ دکھ سے تڑپ گئی دو قدم کے فاصلے نے ابھی سے اتنا لمبا آگ کا دریا پھیلا دیا میں کیسے عبور کروں گی؟

''آج تم نہیں تمہاری روح سسک رہی ہے جسم و جان کی تقسیم میں یہی ہوتا ہے غازہ بیگم۔'' اس نے باتھ روم میں جا کر ٹھنڈا ٹھنڈا پانی آنکھوں پر لگایا لیکن جلن کم نہ ہوئی آئینے نے اس کی آنکھوں کے رنگ واضح کر دیئے۔

وہ ناشتہ کر کے بہت جلدی کے انداز میں گھر سے نکل گئی۔ وہ اپنی آج کی سوچ کو سب سے چھپا لینا چاہتی تھی۔ وہ مجرم تھی اس محبت کی اس چاہ کی جو بغیر کسی صلے کے اسے مل رہی تھی۔ آج اسے یہ ڈراما ختم کرنا تھا کہ ہر روز وہ ناصر سے پہلے نکل جائے اور جلدی گھر لوٹ آئے۔ غازہ استعفیٰ دے کر

باہر نکلی۔ ابھی دو چار قدم ہی چلی تھی کہ ہارن کی آواز نے روک دیا۔ وہ جہاں تھی کھڑی رہ گئی۔ ناصر نے دروازہ کھول دیا۔ وہ بغیر کچھ کہے بیٹھ گئی۔ دل اس وقت اپنی ناقدری پر رونے کو چاہ رہا تھا لیکن وہ برداشت کر گئی۔ اس کے جذبات سن گلاس کے پیچھے چھپے ہوئے تھے۔ آخر اسی نے سکوت بھی توڑ دیا۔

''ناصر! کیا ضرورت تھی تمہیں اس طرح آنے کی؟'' ہونٹ خشک ہو گئے۔ دل بھی دھڑک اٹھا۔ اپنے ہی جھوٹ پر وہ نادم تھی حالانکہ جب وہ باہر نکلی تو دل نے یہی طلب کی تھی کہ کاش وہ آ جائے اور جب آ گیا تو اس نے اپنے جذبات کی نفی کر دی۔

''ناصر! اب تمہیں ایک محتاط زندگی گزارنی ہے۔ اس طرح تمہارا آنا بہت ممکن ہے کسی الجھن یا تکلیف کا باعث بنے۔'' ناصر کے ہونٹ بھی خشک تھے۔ اس نے اس کے اداس چہرے پر نظر ڈالی اور طنزیہ بولا۔

''جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں''

وہ ایزی ہو کر بیٹھ گئی۔ ناصر اداس تھا۔ اس کے وجود میں اس کی اداسی آہستہ آہستہ اتر رہی تھی۔ محبتوں کا چارہ گر اداس تھا۔ مایوس نظر آ رہا تھا۔

''تو آج آپ کا آخری دن تھا۔''

''جی!'' وہ اچھل پڑی۔ ''آپ کیسے جانتے ہیں؟'' وہ حیرت سے ناصر کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

''آج میرا بھی آخری دن ہے۔''

''کیا مطلب؟'' وہ حیران تھی۔

''آج لیلیٰ نظر نہیں آئی میں تو بہت دیر سے کھڑا ہوں۔''

''تو گویا آپ ناصر۔'' وہ بوکھلا گئی۔

''لیلیٰ سے ملنے آئے تھے۔''

''جی نہیں لیلیٰ مجھ سے ملنے آئی تھی کل فون پر بات ہوئی تو میں نے نزہت کے بارے میں بتا دیا۔ بس بے چاری کا دل ٹوٹ گیا۔ میں نے بتایا ہے کہ دماغ میں ٹیومر کے علاج کے لئے امریکہ چلا جاؤں گا۔''

''ایسا مذاق نہیں کرنا چاہئے تھا آپ کو۔''

''آپ سے کس نے کہا کہ میں مذاق کر رہا تھا؟''

''ناصر!'' اس نے پکارا۔ وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

''اگر آپ سیریس تھے تو پھر نزہت کا انتخاب کس لئے؟ لیلیٰ کہیں بہتر لڑکی تھی۔''

''اس لئے کہ وہ دانش کی بہن ہے۔''

''پلیز ناصر مجھے یہ مذاق اچھا نہیں لگتا۔ میں اس سے تنگ تھی۔ آج میں نے ریزائن کر دیا۔''

''مقابلہ کی ہمت نہیں تھی غازہ جی! کس کس دانش سے ہمت ہار دوگی۔ کون سی ایسی جگہ ہے جہاں دانش نہیں ہوگا۔ پروپوزل برا نہیں تھا اگر تم یہ بات مان جاؤ تو اماں سے بات کر لوں گا۔''

''یہ آپ کی ذمہ داری نہیں ہے۔'' وہ تلملا گئی۔

''لیکن میں سمجھتا ہوں۔''

''صرف آپ اپنے بارے میں سوچئے۔''

''وہ تو سوچ لیا ورنہ یوں نہ میں زندگی کو داؤ پر لگاتا۔''

''یہ آپ کی اپنی چوائس اور رضا تھی۔''

''آپ کی بھلائی اسی میں تھی۔''

''کیا نزہت سے ہماری رشتہ داری ہے؟''

''نہ سہی لیکن ایسی لڑکی تمہیں گھر میں نہیں برداشت کر سکتی جس کو حالات کا علم ہو۔ اسی لئے تو دور چلا جاؤں گا۔''

''دور جانے سے خیالات واحساسات نہیں بدل جاتے ہر چیز ساتھ ہوتی ہے۔''

''میں صرف اپنے جذبات کی تسکین چاہتا ہوں۔''

''جذبات اور احساسات کبھی الگ نہیں ہوتے ناصر!''

''یہ تمہاری سوچ ہے۔''

''نہیں ناصر! یہ سوچ دوسروں کی بھی ہو سکتی ہے۔''

''یہ مت کہو غازہ! اپنی ذات کے علاوہ بھی کچھ دکھ اور سوچیں ہوتی ہیں۔ جن کے بارے میں سوچ لینا دانش مندی ہے۔''

''آپ کس ذات کی بات کر رہے ہیں؟''

"اسی ذات کی جو میری روح کا حاصل تھی۔" غازہ چپ ہو گئی۔

"پوچھا نہیں کہ وہ کون ہے؟" اس نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بھی دکھ سے بھیگ رہا تھا۔

"غازہ! نزہت کا انتخاب میں نے اس لئے کیا ہے کہ تم میرے بعد غیر محفوظ ہو جاؤ گی۔ تم کہاں جاؤ گی؟ کوئی دوسری لڑکی جب ہماری زندگی میں آئے گی تو وہ ایک دن کے لئے بھی یہ برداشت نہیں کرے گی۔"

"نزہت اور اس میں کوئی فرق نہیں۔"

"ہے، بہت فرق ہے، میں اس ملک سے دور چلا جاؤں گا۔ تم اسی گھر میں رہو گی۔ تم ہماری ذمہ داری ہو۔" وہ ناصر کو نہ جھٹلا سکی۔

"ناصر! کیا تم کبھی نہیں آؤ گے؟"

"کبھی کبھی آتا رہوں گا۔"

"لیکن یہ ظلم ہے۔"

"کس پر؟" اس نے غازہ کو گھورا۔

"تم پر۔"

"کس نے کیا ہے؟"

"خود تم نے۔"

"بے وقوفی کی باتیں نہ کرو ناصر! مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"جو ہونا تھا۔ وہ ہو چکا ہے۔ تم نے جو چاہا کر دیا۔ اب تم اطمینان رکھو، ناصر تمہارے در پر کبھی نہیں آئے گا۔"

"تمہارے فیصلے نے مجھے اپنی نظروں میں گرا دیا ہے ناصر!"

"میں اپنے فیصلے میں تبدیلی نہیں چاہتا۔"

"لیکن دکھ تو ہے ناں!"

"کس بات کا؟"

"کہ آپ خود کو سزا دے رہے ہیں۔"

"یہ سزا ہمارا مقدر ہے۔"

"یہ فیصلہ تم بدل بھی سکتے ہو ناصر!"

"یہ کوئی کھیل نہیں۔"

"یہ اتنا مشکل بھی نہیں۔ لیلیٰ اچھی لڑکی ہے۔"

"جواب میرا یہی ہے کہ ناصر سے بہتر دانش ہے۔"

"یہ میری توہین ہے۔ محبت ایک بار ہوتی ہے۔" وہ نجانے کیسے کہہ گئی۔ ناصر نے اس کی طرف دیکھا۔

"اس کے بعد جو ہوتا ہے۔"

"وہ سمجھوتا ہوتا ہے۔"

"میں کسی بھی سمجھوتے پر پہنچنے کے لئے آپ کی رائے یا تصدیق کا طلب گار نہیں ہوں۔ میں سمجھوں گا۔ محبت کی ہی نہیں تو پھر آپ کو دکھ کس بات کا ہے، ناصر رہے یا مرے۔"

"اللہ نہ کرے ناصر جو ایسے ہو۔"

"ایسا بھی ہو سکتا ہے۔"

"ناصر پلیز!" وہ روہانسی ہو گئی۔

"غازہ!" اس نے کار روک دی۔

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔" وہ خاموش تھی۔

"میں آج کے بعد تم سے کبھی نہیں ملوں گا۔ ورنہ وقت گزارنا اور اپنے کیے فیصلے پر قائم رہنا اتنا آسان نہیں غازہ۔"

"اتنا مشکل بھی نہ ہو گا ناصر! صرف حوصلہ کی ضرورت ہے۔"

"لیکن میں حوصلہ ہار رہا ہوں غازہ!"

"گھر آ گیا ناصر!" غازہ کہہ رہی تھی۔ ناصر ہارن دینا بھول گیا تھا۔ دونوں گھر میں داخل ہوئے۔ وہ دبے قدموں اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ناصر اسے جاتا دیکھتا رہا۔

آج کی رات تو پھول، رنگ، حنا اور گجروں کی رات تھی۔ گھر میں ہر طرف رونق قہقہوں کی بارش اتر رہی تھی۔ ان لمحوں میں غازہ علی سب سے زیادہ خوش نظر آ رہی تھی۔ بات بے بات اس کے قہقہے ناصر کا دل جلا رہے تھے۔ اس کے چہرے پر کوئی دکھ، ملال نہیں تھا۔ وہ تانیہ سے زیادہ خوش نظر آ رہی تھی۔ تانیہ اس غازہ کو دیکھ رہی تھی جو مسکرانا بھی بھول گئی تھی۔ جو مٹی کے مجسموں میں رنگ بھرتے بھرتے خود بھی بے جان سی لگنے لگی تھی۔ آج اسے کیا ہو گیا تھا، وہ اوپر سے نیچے بھاگتی پھر رہی تھی۔ آج مہندی کی رسم تھی۔ ابھی رات کا کافی حصہ پڑا تھا۔ صرف آٹھ بج رہے تھے۔ وہ کاٹن کا کالا چونا پٹری کے بلاک کا سوٹ پہنے کتنی پرکشش لگ رہی تھی۔ ہر ایک کی توجہ کا مرکز بنی تھی۔ خالہ جان نے آواز دی وہ دوڑ کر گئی۔

''جی خالہ جان!''

''ذرا اس پر استری کر دینا۔'' انہوں نے دوپٹہ اس کی طرف بڑھایا۔

''ابھی لائی۔'' وہ بھاگتی ہوئی کوریڈور میں لگے استری اسٹینڈ تک گئی۔ ناصر سامنے سے آ رہا تھا۔ وہ پھر ایک بار چوری ہو گئی۔

''سب سے زیادہ تو آپ خوش نظر آ رہی ہیں۔ ظاہر اور باطن میں اتنا تضاد۔'' اس نے غازہ کا بغور جائزہ لیا۔ برسوں پرانی غازہ چھم چھم کرتی ہوئی اسے آواز دے رہی تھی۔ وہ رکا رہا۔ وہ دوپٹہ استری کرتی رہی۔

''ہر لمحہ ناصر مر رہا ہے غازہ اور تم اس کے زخموں پر کس طرح نمک چھڑک رہی ہو۔''

''ناصر پلیز! آج بہت اہم دن ہے اس کی خوشیاں میرا حق ہیں۔''

''لیکن تم نے مجھ سے میرا حق چھین لیا۔''

''غازہ! غازہ!'' اماں آواز دیتی اسی طرف آ رہی تھیں۔

''جی آئی اماں جی!'' اس نے دوپٹہ کو تہہ کیا اور چلی گئی۔ نیچے روشنیوں کا سماں تھا۔ ہر طرف مہندی اور مہندی کی تیاریاں، ڈھیروں گجرے تھالوں پر دھرے تھے۔ لڑکیاں دلہن والوں کے استقبال کے لئے مشق کر رہی تھیں۔ کچھ لڑکے ناصر کے لئے اسٹیج سجا رہے تھے۔ لڑکیاں گھیرا ڈالے ڈھولک پر گیت گا رہی تھیں۔ کبھی رک جاتیں اور کبھی پھر کوئی شرارتی جملہ یا گیت شروع کر دیتیں۔ ان سب میں غازہ

نمایاں شخصیت کی مالک الگ نظر آ رہی تھی۔ اسٹیج کے قریب لڑکوں کی بھی ٹولیاں ہر گانے کو بے سرا بنا رہی تھیں۔ زلیخا کو اس کے کزن شبیر نے شرارت میں پھول پھینک کر مارا تھا۔ پھول عین چھوٹی پھوپھی کے جا لگا۔ وہ شرما گئیں۔ لڑکیاں ہنس ہنس کر بے حال ہوئی جا رہی تھیں۔

''لیجئے سب تو یہاں موجود ہیں اور مہمان خصوصی نواب زادہ ناصر علی کہاں تشریف رکھتے ہیں؟'' ان کے ایک کزن نے ان کو ڈھونڈا۔

''وہ تو مایوں بیٹھے ہیں۔'' شبیر کہہ رہا تھا۔ لڑکے ہنس رہے تھے۔

''ناصر بھائی کے بغیر کوئی محفل محفل نہیں ہے۔'' پھر آخر لڑکے ناصر کو اوپر سے لے ہی آئے۔

''بھئی، ابھی تو انجوائے کرو میرے یار! جب لڑکی والے آئیں گے تو دوبارہ تمہیں دوپٹہ ڈال کر لے آئیں گے۔''

''نہیں ناصر بھائی! اگر آپ یوں آ گئے تو نور نہیں اترے گا۔'' مریم کہہ رہی تھی۔

''اب تم لوگ فیصلہ کرو، واپس جاؤں یا رکوں؟'' وہ شرارت سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں سامنے بیٹھی غازہ پر جم گئیں۔ گرم گرم نظروں کے تیر اس کے چہرے پر برس رہے تھے۔

''ناصر بھائی! ایک بات پوچھوں؟'' منزہ پوچھ رہی تھی۔

''لڑکیوں کو سوگوار دیکھا ہے لیکن آپ پر کیوں یہ سوگواری طاری ہے؟'' ناصر تو مسکرا دیا البتہ کسی لڑکے نے جواب دیا۔

''رخصت ہو کر امریکہ جا رہے ہیں۔ اللہ جانے کب لیکر واپسی ہو۔ امریکن سسر کلنٹن جی اجازت دیں یا نہ دیں؟'' زوردار قہقہے پڑے۔ غازہ کو سانس لینی مشکل ہو رہی تھی۔ ہر طرف سے ناصر کی نظروں کی زد میں تھی۔ گزری ساعتوں، بچھڑی محبتوں اور آنے والے عذابوں کا دکھ اس کی نگاہوں کی گرمی سے اسے جھلسا رہا تھا۔ وہ ہنستے ہنستے چپ ہو گئی۔ لڑکیاں اس سے گانے کی فرمائش کر رہی تھیں۔

''غازہ باجی! سنائیں ناں وہ ادھوری غزل۔''

''کیا ہوا تھا کل؟ میں تو جلدی چلی گئی تھی۔'' مریم نے منزہ سے پوچھا۔

''پتہ نہیں غازہ باجی گا رہی تھیں۔ تانیہ آپی رونے لگیں بس رنگ میں بھنگ ہو گیا تھا۔ ساری محفل درہم برہم ہو گئی۔''

"لیکن تانیہ کیوں ڈر گئی تھی؟"

"لڑکی کی نہ صورت نہ سیرت۔ کالی کلوٹی ہے۔ صرف گرین کارڈ کا چارم ناصر بھائی کو بنا گیا ہے۔"

آواز غازہ نے بھی سنی۔ دل دکھ سے رو دیا۔

"دیکھو بھائی، اچھی طرح پریکٹس کرو۔ جیت کر نہ جائیں۔"

"کل ہم تو ہار کر آ گئے۔" خالہ جان لڑکیوں کو جوش دلا رہی تھیں۔

"چلو یہ والا گاتے ہیں۔" ثروت نے ڈھول سنبھالی

جب نام اس کا آیا کھٹ میں نے ہاں کر دی

"نہیں یہ گاتے ہیں۔"

مریم ڈھول کی دھاپ پر لہک لہک کر گا رہی تھی۔

"میرا پیا گھر آیا ہو لال نی
پیا گھر آیا میرا جیا لہرایا
لاؤ ری لاؤ میری مہندی لاؤ
چاند ستاروں سے میری مانگ سجاؤ"

ناصر کی نظریں غازہ کے چہرے پر تھیں۔ مریم نے ٹھوکا دیا۔

"غازہ باجی! گائیں۔"

"کیا ہوا غازہ؟" ثروت اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے دیکھ کر پوچھ رہی تھی۔ وہ کیا بتاتی کہ ناصر گزری ساعتوں کو اس کے اندر ڈھونڈ رہا ہے۔ موتیے کے کنگن اس کی نازک کلائی میں پسینے سے بھیگ رہے تھے۔ اس نے ماتھے کا پسینہ پونچھا۔ کسی نے ٹھوکا دیا۔

"ناصر کہاں ہو؟" وہ کسی دشت تنہائی کے موڑ پر آ گیا۔

"گائیں ناں کیوں چپ ہیں؟" اماں نے کہا تھا۔

"ناصر کا نام آیا کھٹ ہاں کر دی۔"

لیلیٰ جھوم جھوم کر گانے لگی۔ غازہ کا بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ ناصر کی آنکھوں کی تپش اسے پگھلا رہی تھی۔ وہ اٹھ کر بھاگنا چاہتی تھی کہ تانیہ نے ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ ندامت سے پانی پانی ہو رہی تھی کہ ناصر اس کی وجہ سے

یہ قربانی دے رہا ہے۔ اس کے تحفظ کے لئے اپنا ملک، اپنوں کو چھوڑ دیا ہے۔ رات دو بجے تک گجروں کی کچی کلیاں بھی کھل اٹھیں۔ پیالوں میں مہندی بھیگی رکھی رہی۔ لڑکیاں تھک گئیں۔ آخر کو اماں بولیں۔

"بچیو! ذرا فون تو کرو۔ کیا صبح مہندی لے کر آئیں گے؟ رات دو بج رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے اماں! میں کرتی ہوں۔" تانیہ سب کچھ چھوڑ کر چلی گئی۔ واپسی پر اس کا سانس پھول رہا تھا۔

"اماں اماں! وہ لوگ کہہ رہے ہیں ہم مہندی لے کر نہیں آ رہے۔ ناصر کے دماغ میں بیٹھ گیا ہے۔ وہ عنقریب پاگل ہو جائے گا۔ اسی لئے تم لوگوں نے امریکہ علاج کی غرض سے یہ پلان بنایا ہے۔ ہماری طرف سے انکار ہے اماں!"

"کیا؟" سب دنگ رہ گئے۔ ناصر نے غازہ کی طرف دیکھا۔

"کسی دل جلے نے بددعا دی ہو گی۔" پورے لان میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ اماں تو باقاعدہ چیخنے لگیں۔

"اماں! ایسا کچھ نہیں ہے وہ لوگ بکواس کر رہے ہیں۔" ناصر کو غصہ آ گیا تھا لیکن اماں تو آج آپے سے باہر تھیں۔ غازہ نے کہا۔

"اماں پلیز ہوش میں آئیں ناصر بالکل ٹھیک ہیں۔" اماں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک سیدھے ہاتھ کا تھپڑ غازہ کے گال پر دیا وہ چکرا گئی۔ اچانک دوسرا اور پھر بیچ میں سب لوگ آ گئے۔

"ارے یہ کیا کر رہی ہیں؟"

"سارا قصور اسی کا ہے۔ اس نے میرے بیٹے کو پاگل بنا دیا۔ آج سارے لوگوں میں جگ ہنسائی کروائی ہے۔ سمجھتی کیا ہے اپنے آپ کو۔ میں نے اس کو لمحہ لمحہ محبت دی۔ یہ ریزہ ریزہ ہو گئی۔ میں نے اس کو اپنی گود میں سمیٹ لیا۔ اس کو کبھی کوئی دکھ اور تکلیف نہ ہونے دی۔ اس کو تانی سے بڑھ کر سمجھا۔ لیکن اس نے ہمیں کیا دیا۔ ہمارے گھر کی خوشیاں چھین لیں۔" ناصر نے بڑھ کر اماں کو پکڑ لیا۔

"مزید تماشا مت بنیں، چھوڑ دیے اماں بس کریں۔" غازہ پر نظر پڑی تو وہ سزا کے لئے تیار کھڑی تھی۔ حیران ہر کوئی غازہ کو دیکھ رہا تھا۔ کوئی کہہ رہا تھا۔

""بھئی، چلنا چاہیے کل عید ہے۔ رات تین بجنے بج گئے۔'' ثروت نے اور دوسری لڑکیوں نے غازہ کو گھیر لیا تھا۔

""ہائے غازہ تم اتنی ظالم ہو۔ ناصر بھائی کی طرف تو دیکھتیں۔'' ثانیہ نے غازہ سے روتے ہوئے کہا۔

""غازہ! اب تو ہاں کہہ دو۔'' ثانی نے پیار سے لپٹا لیا۔ لڑکیوں نے شور مچایا۔

""غازہ نے کھٹ ہاں کہہ دی ہے۔'' وہ کسی چاند کی طرح لڑکیوں میں چھپ رہی تھی۔ ہر کسی کی خواہش تھی کہ غازہ کو ایک نظر دیکھے آج تو لڑکوں کو بھی خوب مقابلہ بازی کا شوق تھا۔ وہ بھی کسی سے کم نہیں تھے۔ ناصر کو کھینچ کر مقابلہ پر لایا جا رہا تھا۔ غازہ اوپر بھاگ جانا چاہ رہی تھی لیکن ناصر کے ہاتھ کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ وہ ہاتھ نہ چھڑا سکی۔ ناصر کہہ رہا تھا۔

ہمیں ہے شوق کہ جی بھر کے تم کو دیکھیں گے
تمہیں ہے شرم تو آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لینا

مئی کی سخت گرم رات تھی۔ پھر بھی ٹھنڈی ٹھنڈی اور خوشبوؤں سے بھری رات مہک رہی تھی کل شادی تھی۔ گھر کے اندر پھول اور مہندی کا میلہ تھا۔ اس کے سفید ہاتھوں میں عائشہ مہندی لگا رہی تھی اور شہنی کی آواز آ رہی تھی۔

ناصر کا نام آیا کھٹ ہاں کر دی۔

وہ گجروں کی مہک کی سرشاری میں سارے زخم بھول گئی تھی۔ صرف ناصر کے نام کے مدھر مدھر گیتوں کے رنگ بکھر رہے تھے۔

صحن میں اُتری ہوئی خوشی ستارے بھرے آنچل سے پھوٹ پھوٹ کر باہر آ رہی تھی۔ ماتھے پہ بندیا، آنکھوں کا کاجل بکھرا ان خوشیوں کا مظہر تھا۔ رنگوں کی برسات ہاتھوں کی چوڑیوں کی جھنکار سے بہہ رہی تھی اور آنسو تھم کر مائرہ کے رخسار پر بہہ رہے تھے۔ اماں نے اس طرح اسے اپنے گلے لگایا کہ دل چاہا کہ تمام عمر کے لئے ان کی باہوں میں سمٹ کر سو جاؤں اور پھر کبھی آنکھ نہ کھولوں بڑی آپی چھوٹی آپا کے دل میں اتنی محبت کہاں چھپی تھی۔ یہ اظہر بھائی اور بھابھی کیوں دور کتراتے کھڑے ہیں۔ جونہی اس کی نظر اٹھی مائرہ کے قریب آ گئے۔

""مائرہ معاف کر دینا۔''

""ارے بھائی۔'' ہائے کیسا پیار اور کیسی تڑپ ہوتی ہے؟ بھائی کی قربت میں سما کر یوں لگ رہا ہے کہ درمیان میں کوئی شیشہ تھا جو گر کر ٹوٹ گیا۔ برسوں کا پیار واپس آ کر گلے لگ گیا ہے۔ ابا میاں کی کمی اظہر بھائی نے ہمیشہ پوری کی تھی۔ کچھ وقت انہیں ہم سے دور لے گیا تھا اور آج پھر وقت انہیں واپس لایا ہے۔ مائرہ تمہاری جدائی کے تصور سے سدرہ دروازے کی چوکھٹ پر کھڑی رو رہی ہے۔ اس کا دکھ بھی صحیح ہے کہ آج کے بعد وہ تنہا رہ جائے گی، ہر پل ہنسانے والی ہر وقت لڑ کر دکھ دینے والی بہن سب سے زیادہ رو رہی ہے۔ اے خدا اتنی ڈھیروں محبتوں کو تو نے ان نعمتوں کو کہاں چھپا دیا تھا۔ کہاں روٹھ کر چلی گئی تھیں یہ راحت رساں محبتیں یہ نرم گلاب جیسی چاہتیں جو آج مجھے تمام رشتوں سے بالاتر نظر آ رہی ہیں۔ یہ جو دلوں کے اندر چھپ کر رہ گئی تھیں۔ کہتے ہیں کہ الفاظ کی چوٹ دلوں کو نہیں جوڑ سکتی۔ یہاں تو آنسوؤں کی ایک ہی بوند نے برسوں سے خشک مائرہ کے دل کی زمین کو محبتوں اور چاہتوں سے سرسبز کر دیا ہے۔ اتنا پیار وقت جدائی کہ دل چاہے اماں کے آنچل میں آج کی رات چھپ جاؤں۔ دل چاہ رہا ہے کہ سدرہ کے ساتھ اسی لوٹتے ہوئے تخت پر لیٹ کر سو جاؤں تمام عمر اظہر بھائی کے انتظار میں

توے پر روٹی نہ ڈالوں۔ بڑی آپی اور چھوٹی آپا کے آگے پیچھے گھوموں، ان کے آنے پر ان کے جانے پر کوئی احتجاج نہ کرے لیکن اب کچھ نہیں۔ یہ نرم اور گداز لمحے جو دکھوں اور کانٹوں سے بھرے تھے۔ جن کی تکلیف بہت گہری تھی۔ آج ختم ہو گئے ہیں۔ روح پر نرم اور ٹھنڈی پچھلی محبتوں کا خمار چھا رہا ہے۔ ایک ایک لمحہ من کے اندر جاگ رہا ہے۔ راحت اور ناہید، زبیدہ خالہ کے پیچھے کھڑی مجھے یوں دیکھ رہی ہیں۔ جیسے میں مائرہ نہیں کوئی اور ہوں۔ زبیدہ خالہ میرے ان آنسوؤں کو کیا سمجھ رہی ہیں۔ انہوں نے گھبرا کر اپنی نظریں چرا لیں۔ ان کا بھی قصور کیا وہ روحیل ہی ایسا تھا۔ بے چاری زبیدہ خالہ، آج ان کے غرور کے اندر بھی وہ محبت چھلک رہی ہے جو کچھ عرصے پہلے ہمیں زبیدہ خالہ سے دور کر گئی تھی۔ اب روحیل مجھ سے کیا کہنا چاہتا تھا۔ میں کیوں نہ بول سکی۔ اسے کس نے خبر دی ہے۔ جب شب زیست میں نے رو کر کاٹ لی تو وہ صبح زیست پر کیا کہنا چاہتا تھا۔ مائرہ بیگم وقت کی گرفت اب کسی اور وقت میں جا رہی ہے۔ پھر چند لمحوں کے لئے وہ رکی اماں سے آہستہ سے کہا۔ ”اماں معاف کر دینا۔“ اماں نے چاروں طرف دیکھا اور جلدی سے گھبرا کر مائرہ کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ اس انداز سے رکھ دیا کہ مائرہ اب دوبارہ یہ الفاظ مت کہنا۔ نجانے کون سن لے، کون پڑھ لے۔ وقت نے لاج رکھ لی ہے۔ وقت نے بچھڑے ہوؤں کو پھر اکٹھے کر دیا ہے۔ یہی تو وقت ہوتے ہیں اپنوں کی محبتوں کے پیمانوں کے خوشی اور غم میں اور یہ خوشی جو اس کے گھر میں آئی تھی، وہ کھونا نہیں چاہتی تھیں۔ اماں نے کئی بوسے اس کے ماتھے پر ثبت کر دیئے۔ تب مائرہ آنسو پونچھتی ہوئی الگ ہو گئی۔ بھابھی نے اسے خود سے لپٹا لیا۔ تھوڑی ہی دیر میں کراچی ایئر پورٹ پر اس نے سب کو خدا حافظ کہا۔ ڈوبتے دل کے ساتھ اس نے مڑ کر سب کو دیکھا۔ محبتوں کے چراغ سب کی آنکھوں میں جل رہے تھے۔ سب اس کے اپنے تھے کوئی غیر نہیں۔ رنگوں بھرا آنچل تھوڑی دیر کے بعد سب کی نظروں سے غائب ہو گیا۔ آج سب کو وہ کتنی عزیز ہو گئی تھی۔ یہ احساس مائرہ کے آنچل سے اٹک کر ساتھ چلا گیا تھا۔ کس قدر اہم ہو گئی ہے اس کی ذات اپنوں سے دور ہو کر۔ محبتیں انسان کو موم کر دیتی ہیں۔ خوشبو اور چاہتوں، محبتوں کے جذبوں کے آگے بالکل بے بس ہو جاتا ہے۔ خوشبو بھرے جذبے لہلہانے لگتے ہیں۔ پتھر دل موم ہو جاتے ہیں۔ وہ محبت ہے جو ایک بارش کے قطرے سے جاگ اٹھے۔ صرف ایک آنسو آنکھ سے ٹپکا اور بچھڑی محبتوں کو یکجا کر گیا۔ نمکین آنسوؤں کا مٹیالا دھواں ابھی تک مائرہ کی سرخ آنکھوں میں چھایا ہوا تھا۔ میں نے اس سے پہلے

کبھی ہوائی سفر نہیں کیا لیکن ان بلندیوں پر ان فضاؤں میں میں نے آنکھ بند کر کے کئی بار سفر کیا ہے۔ روحیل کے ساتھ، ہاں ان ہی راستوں سے گزر کر، ان ہی جذبوں سے سرشار ہو کر یہی لمحے وجود کے اندر سرسراتے رہے ہیں۔ خاموشی سے زیست کی راہوں پر اور آج ان لمحوں سے تمام عمر کا بندھن توڑ کر میں تنہا سفر کر رہی ہوں۔ محسن کے لئے جواب میرا سب کچھ ہے اور اسی سب کے آگے میں نے اس شب زیست کے آگے کوئی صفحہ کوئی نامہ نہیں لکھا۔ روحیل صرف ایک پل کا خواب تھا اور محسن زندگی کی سچائی اور یہ سچائی انسان کو معتبر بنا دیتی ہے۔ بس مائرہ یہ زندگی کی حقیقت ہے کہ ندی نالے تو درمیان میں آتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن سمندر بہتا ہی رہتا ہے۔ صفحۂ دل کا انتساب اب روحیل نہیں، آنکھوں کا خواب اب روحیل نہیں۔ یہ آنسو روحیل کے لئے نہیں ہیں۔ یہ لمحے روحیل کے لئے نہیں ہیں۔ یہ سب کچھ، یہ سب کچھ کل متاع زندگی میری محسن کے لئے ہے۔ اس نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ چارلس ڈیگال ایئر پورٹ پر وہ تنہا اپنا سامان ٹرالی پر رکھے کسٹم کی لائن میں کھڑی تھی لیکن اس کی آنکھیں محسن کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ بالکل لاتعلق سی کھڑی سامان کب کلیئر ہوا اسے کچھ پتہ نہیں تھا۔ وہ تو بس محسن کو اس بھیڑ میں تلاش کر رہی تھی۔ جو نجانے کہاں رہ گیا تھا۔ جونہی سامان کلیئر ہوا کسی نے ایکسکیوزمی پلیز کہہ کر اس کا سامان آگے کر دیا۔ وہ ہراساں ہراساں جم غفیر میں کسی اپنے کو ڈھونڈتی ہوئی باہر آ گئی۔ گھبراہٹ اور پریشانی سے بار بار وہ اپنا آنچل سنبھال رہی تھی۔ یخ بستہ ہوائیں اس کے وجود کے اندر اتر رہی تھیں۔ محسن کی فکر اور اجنبی شہر وہ یوں تنہا لیکن جلد ہی مائرہ کی آنکھیں سامنے دیکھتے ہوئے مسکرا کر جھک گئیں۔ انتظار کے پل بھلا ان لمحوں میں کون گنے جب آنکھیں جھک جائیں۔ دل دھڑ کنا بھول جائے۔

”سوری مائرہ میں لیٹ ہو گیا۔“ مائرہ کے ہونٹ مسکرائے کاجل بھری آنکھوں نے شکوہ تو کیا لیکن وہ خاموش رہ گئی۔ کبھی کبھی محبتوں کے درمیان خاموشیاں مفہوم ادا کرتی ہیں۔ سارے گلے شکوے سارے عہد و پیماں ایک لمحے کی خاموشی کہہ رہی تھی لیکن وہ اس کے جذبات سے بے خبر بہت تیز جا رہا تھا اور تقریباً اسی رفتار سے مائرہ اس کے قدم سے قدم ملا کر چل رہی تھی۔ پتہ نہیں مائرہ کن خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ گاڑی بلیک ہو کر رک گئی۔ وہ اپنی دنیا میں واپس آ گئی تھی۔ محسن کی موجودگی کا احساس کر کے وہ چونک گئی۔ محسن نے اتر کر دروازہ کھولا۔ اور سامنے کی طرف اشارہ کیا۔ خوبصورت باغیچہ

جس کے سرے پر دریائے سین کا پانی رنگین پتھروں کی باڑھ سے ٹکرا رہا تھا۔ حدِ نظر تک دریائے سین کا پھیلا ہوا پانی اور اس پر سنہری دھوپ افشاں کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ رنگین خوابوں بھرا شہر اسے خوش آمدید کہہ رہا تھا۔

"یہ بوئے ڈی بولون کا علاقہ ہے۔ شہر کا سب سے خوبصورت اور حسین علاقہ اور یہ سامنے ہمارا کاٹیج۔" محسن نے اس کی حیرت زدہ آنکھوں میں جھانک کر دیکھا تھا۔ مائرہ کچھ جھینپی جھینپی اپنا پرس اٹھائے محسن کے پیچھے چل رہی تھی۔ پیرس میں آئے ہوئے دو چار دن ہی ہوئے تھے لیکن وطن سے دور۔ محسن صبح کے گئے رات کو گھر لوٹتے سارا دن مائرہ بالائی منزل پر باہر دریا کے حسین مناظر کو دیکھتی رہتی۔ دل چاہتا تھا ساری خوبصورتی کو دل میں اتار لے، سارے خوابوں کو دامن میں بھر لے لیکن اپنے گھر کے دریچوں سے بہتا ہوا پانی یاد آیا۔ رنگین شگوفے جب ہوا میں جھولتے تو اسے گھر میں لگے ہوئے پھول یاد آتے۔ یا وہ جامن کا درخت جو دو گھروں کے درمیان کھڑا تھا جس کی آدھی شاخیں خالہ زبیدہ کی طرف اور آدھی ان کی طرف جھک آتی تھیں۔ چھوٹے سے گھر کے باہر کھلا ہوا باغیچہ جس کے چاروں طرف مہندی کی باڑھ مہک رہی ہوتی تھی۔ اس کی بھینی بھینی مہک، اس کے پتوں کا رنگ کتنا گہرا تھا۔ اس نے اپنے دونوں پیر جھک کر دیکھے جن پر سرخ رنگ ایک ماہ گزر جانے کے باوجود نظر آ رہا تھا۔ مہندی کی خاص مہک ابھی تک وجود سے لپٹی تھی۔ رات کا دامن بھیگ رہا تھا۔ اس نے سامنے کھڑکی سے پردہ ہٹا دیا۔ سامنے پانی میں تیرتے ہوئے ہاؤس بوٹ نظر آ رہے تھے۔ اس کے اندرون کا سماں تھا۔ لوگ ڈانس کر رہے تھے۔ کچھ دور تک روشنیوں کا نظارا اور کچھ کھانے پینے میں مصروف تھے۔ محسن ابھی گھر نہیں آئے تھے۔ اس لئے وہ اماں کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔ کئی دن پہلے اماں کی طرف سے سدرہ نے خط لکھ کر بھیجا تھا۔ سب خیریت تھی۔ بس اماں نے اپنی پریشانی کا ذکر کیا تھا۔ اب مائرہ کے بعد سدرہ کا بوجھ انہیں زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔ ویسے وہ ٹھیک ٹھاک تھیں۔ یہ سدرہ نے اپنی طرف سے لکھا تھا۔ وہ جواب لکھتے لکھتے مسکرا پڑی۔

"تو بھی سدرہ بیگم، اب اس بوجھ کو کچھ کم کرنے کی سوچتے ہیں۔ تم فکر مت کرو۔ پورا پیرس تمہارے قدموں میں الٹ دوں گی۔ بس کچھ ہی دنوں بعد ذرا سیٹ ہو جاؤں تو پھر جلد ہی پاکستان کا چکر لگاتی ہوں پھر دیکھنا۔" کتنی بار وہ خط لکھتے لکھتے اماں اور سدرہ کو یاد کر کے روتی رہی۔ کتنی بار دریائے سین

کے روشنی کے نظارے تارے بن کر آنکھوں میں ناچے۔ کتنی بار رات کے بھیگے دامن میں اس کے آنسو ٹوٹ کر آنکھوں سے جھڑتے رہے۔ زندگی سے کیا ہوا سمجھوتہ دل کے اندر ابلتا رہا۔ وہ کسی احتجاج کا حق نہیں رکھتی تھی۔ محسن کی ایک دنیا اور تھی، جس پر اس کا کوئی حق نہ تھا۔ وہ کب آئیں اور کب نہیں اور کس حالت میں یہ اس کے سوچنے کی بات نہیں تھی کیونکہ محسن نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ چھوٹے طبقے سے تعلق رکھتی ہے اور وہ ایک ایڈوانس دنیا کے باسی ہیں۔ اگر وہ ان کے ساتھ چل نہیں سکتی تو احتجاج کا حق نہیں ہے۔ شاید اس جادو بھری ایڈوانس دنیا میں یہی کچھ ہوتا ہوگا۔ میں نے تو ساری دنیا سے ناتا توڑ کر اس خوبصورت گھر میں پناہ لے لی ہے۔ محسن صرف اس کا ہے، بس یہی سب سے بڑا تاج ہے۔ باقی بھٹکے ہوئے مسافر کو چند دن چند ماہ میں راہِ راست پر لانا آسان نہیں ہے۔ تنہا رہنے والے رئیس لوگ اسی مزاج کے ہوتے ہیں۔ نوابی رگ رگ میں دوڑ رہی ہے۔ سوسائٹی کی غلامی نے جو کمپلیکس دیا ہے اس کا نشہ ابھی تک کچھ لوگوں میں باقی ہے اور محسن ان ہی لوگوں میں سے ایک ہیں۔ اپنے ملک اور قوم کو برا کہنا، اپنی تہذیب کے ذہین طبقے کو چھوٹا طبقہ کہنا یہ ان کے اندر کا احساسِ کمتری ہے۔ شاید یہ بات بھول گئے ہیں کہ اسی طبقے نے اتنا شعور عطا کیا ہے کہ اب ملک میں تم ان سے بہتر رہ رہے ہو اور پھر بھی شکوہ ہے۔ ہر چیز میں نقص ہے۔ اپنے وطن کے انسانوں سے، اپنی سرزمین کے اس خطے سے جس نے تمہیں چلنا سکھایا جس نے تمہیں شعور دیا۔ خیر چھوڑو، یہی باتیں سن کر محسن مجھے دقیانوسی کہتے ہیں۔ خیر یہ ان کی سوچ کا انداز ہے۔ میں آہستہ آہستہ بدل دوں گی۔ محبت بڑی طاقتور ہوتی ہے۔ اف میں بھی کہاں سے کہاں بھٹک گئی اماں کا خط لکھتے لکھتے۔ اگر اماں کو یہ سب پتہ لگ جائے تو، خیر چھوڑو ان باتوں کو اماں کا خط آج تو پورا کر ہی دوں۔ پچھلے دو صفحے کے خط سے اماں کو تسلی نہیں ہوئی۔ کئی بار پڑھ کر سنا تھا۔ آخر میں انہوں نے سدرہ سے کہا۔ "اب میں خود پڑھوں گی آرام سے۔" لہٰذا سدرہ نے لکھا تھا۔

"میرا! اب کے جو خط بھیجو تو دس بارہ صفحوں کا ہو تاکہ اماں اپنی کمزور نظر کا بوجھ مجھ پر ہی رکھیں کیونکہ پچھلا خط دوبارہ سننے کے بعد ہاتھ سے اماں نے جھپٹ لیا کہ دو صفحے تو ہیں۔ عینک لگا کر پڑھ لوں گی۔ مزہ نہیں آیا ہے۔" ہنستے ہنستے مائرہ نے قلم بند کر کے میز پر رکھا اور کئی صفحوں کے پلندے کو ایک لفافے میں بند کر کے اسے ہونٹوں سے لگایا۔

"اے میرے پیارے خط دور پردیس میں روتی ہوئی مائرہ کا سلام سب کو پہنچانا۔ تو کتنا خوش نصیب ہے کہ تو ہمارے پیاروں کے ہاتھوں میں جائے گا۔ خدا حافظ۔" اس نے آخری بار اماں کے خط کو چوما جو قریب رکھا ہوا تھا اور پھر سائیڈ لیمپ بجھا کر اٹھ کر آ گئی۔ عجیب انداز ہے محسن کا، کبھی تو یوں نظر انداز کر دیتے ہیں اور کبھی محبت کے خزانے خالی ہو جاتے ہیں۔ یوں لگتا ہے وہ محبت کی نظر اندازی پر خود یکطرفہ اختیارات چاہتے ہیں میں اگر صحیح بات بھی کروں تو وہ غلط ہے۔ صرف وہ جو کہہ دیتے ہیں وہی سچ ہے۔ بہت تکلیف دہ ہوتی ہے۔ ایسی سچویشن خالص بزنس مائنڈڈ ہے۔ آج پتہ ہے محسن بہت خوش ہیں۔

"میرا...... میرا۔" وہ اسے آواز دے رہے تھے۔

"کافی دن ہو گئے، تمہیں پیرس آئے ہوئے تم نے تو ایک بار بھی شاپنگ نہیں کی۔ آج سارا دن ہم باہر گزاریں گے اور ڈھیروں شاپنگ کریں گے۔"

"سچ......؟"

"آف کورس۔"

"لیکن محسن، ضرورت کی تو ہر چیز موجود ہے پھر بھلا کیا ضرورت ہے خوامخواہ کی خریداری کی؟" میرا نے چائے کی پیالی باہر لان میں محسن کو تھماتے ہوئے کہا۔

"اوہ میرا...... تم کیسی بیک ورڈ اور لیزی گرل ہو۔ دنیا یہاں پر آنے کی دعائیں کرتی ہے اور تم ہو کہ میری غیر موجودگی میں بھی گھر کے اندر بند رہتی ہو۔"

"لیکن محسن جن چیزوں پر اعتراض کرتے ہو شاید تمہیں یاد نہیں کہ ان ہی چیزوں کی تمہیں تلاش تھی۔ میرا یہی انداز تمہیں پسند تھا۔"

"غلط...... میرا غلط۔ تمہارا سب سے پیارا اور خوبصورت انداز تو وہ تھا کہ تم ایک اچھی کک ہو۔"

"تو کیا میں اس معیار پر پوری نہیں اتری؟"

"ہوں...... ابھی امتحان باقی ہے۔ کسی دن دیکھوں گا۔"

"کیا مطلب ہے محسن، کیا ریسٹورنٹ میں باورچی بنوا کر ہی سند دیں گے۔" میرا نے ہنستے ہوئے کہا تو محسن نے بھی ہنس کر جواب دیا۔

"اگر ضرورت پڑی تو...... ہاں، مجھے یاد آیا کچھ عرصے کے لیے جیسمین چھٹی پر جا رہی ہے تو کچھ وقت کے لیے ہی چلی جایا کرو۔"

"میں......؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ارے بھئی، اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ تم تو ویسے بھی بور ہوتی ہو اور دیکھو میں تو بہت مصروف ہوتا ہوں، اتنا وقت میں اس ہوٹل کو نہیں دے سکتا۔"

پتہ نہیں کیوں مجھے آج...... محسن کی یہ بات اچھی نہیں لگی کیوں آج ذہن خدشات سے بھر گیا ہے۔ میں نے ڈھیروں شاپنگ کی ہے۔ محسن کہتے ہیں کہ میں جلد ہی پاکستان کا بھی چکر لگاؤں۔ مجھے خوش کرنے کے طریقے جانتے ہیں۔ ایک عورت کی کمزوریاں اس کا گھر اس کی محبتیں ہوتی ہیں۔ اماں اور سدرہ کے لیے ڈھیروں چیزیں خریدی ہیں لیکن پھر بھی تسلی نہیں ہوئی۔ محسن پیسے کے معاملے میں خاصے فراخدل ہیں۔ آج اتوار کا دن ہے۔ پہلی بار میں آج محسن کے ہمراہ اس ریسٹورنٹ میں آئی ہوں جہاں بے انتہا رش ہے، ہر شخص بہت مصروف ہے۔ جیسمین کی جگہ خالی ہے۔ مجھے نہیں معلوم جیسمین کون ہے اور کہاں کی ہے اور کب آئے گی؟ بس وہ ہمارے ریسٹورنٹ کی ایک اچھی کک ہے اور جس کی کمی پوری کرنے کے لیے میں یہاں آ گئی ہوں۔ جب وہ واپس آ جائے گی تو میں ہرگز ہرگز یہاں پر ایپرن باندھ کر بیروں کے ساتھ کام نہیں کروں گی کیونکہ مجھے اس طرح سے اچھا نہیں لگتا۔ اف خدایا...... میں تو پاگل ہو جاؤں گی۔ ذہنی طور پر میں بالکل تھک چکی ہوں۔ صبح چھ بجے میں گھر سے نکل جاتی ہوں۔ محسن ڈراپ کرتے ہیں۔ ایک ایک منٹ گھڑی کی سوئیوں کی طرح میں حرکت میں رہتی ہوں ورنہ محسن کا موڈ آف ہو جاتا ہے۔ رات میں ایک بجے گھر آتی ہوں۔ تھک کے چور ہو جاتی ہوں۔ اتنا کام ہوتا ہے اس ریسٹورنٹ میں کہ ایک پل کے لیے بھی نہیں بیٹھ سکتی۔ ہر چند کہ سارا کام مشینوں پر ہوتا ہے لیکن پھر بھی ان مشینوں کے ساتھ بے جان پرزوں کی طرح لگا رہنا پڑتا ہے۔ ہمارے بہترین کھانوں کی دھوم کوئی اہل پیرس سے پوچھے جہاں دنیا بھر کے سیاح آتے ہیں۔ اور تھکن کا حال کوئی مجھ سے پوچھے اور کبھی کبھی اب یوں بھی ہوتا ہے کہ محسن گھر آ رہے ہوتے ہیں تو میں تیار ہو کر جا رہی ہوتی ہوں۔ اب تو ہماری ملاقات یوں ہوتی ہے گویا ہم ایک دوسرے کے جیون ساتھی نہیں بلکہ روم میٹ ہیں۔ جو رات کے صرف چند گھنٹے ایک کمرے میں گزارتے ہیں اور باقی دن اور رات کا حصہ الگ الگ۔ اب تو میں

پیرس کی بھیڑ میں کھوتی جارہی ہوں۔اس کی خوبصورتی اس کی رونق سب میرے خوابوں کی طرح تھک کر سو گئی ہے۔شانزے لیزے کے کنارے لگے ہوئے ہرے بھرے درخت جو کبھی پاگل کردینے والے مناظر رکھتے تھے۔اب وہ وحشی خودرو جنگل لگتے ہیں۔ننھی ننھی ریشم جیسی پھوار سے برف کا دھواں بھاپ بن کر گر رہا تھا۔آہستہ آہستہ شاہ بلوط کے درخت سفید دھند میں ڈوب گئے تھے۔پیرس کی رونق دنیا بھر کے سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز بنی ہوئی ہے۔کرسمس قریب آ رہا ہے۔سین کے کناروں پر برفباری کے حسین مناظر لوگوں کو دعوت نظارہ دے رہے ہیں۔پورا شہر روشنیوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ہر طرف دھند یا دل خواب جیسا سماں۔ہر گھر کے اندر ایک خوبصورت کرسمس ٹری جس پر رنگین چھوٹے چھوٹے بلب اور سرخ رنگ کے تحفے لٹک رہے ہیں۔ہر گھر، ہر جگہ ایک خواب کی طرح نظر آ رہی ہے۔بارہ بجنے سے پہلے لوگوں نے روشنیاں گل کر دی ہیں۔اب ہلکی ہلکی روشنی اور درختوں کے برقی قمقمے جھلملا رہے ہیں۔شاہ بلوط کے درخت برف کی تہہ میں ڈوب چکے ہیں۔دریائے سین کے کنارے سیاحوں کی بھیڑ اور اس کے اوپر تیرتے ہوئے مکان اور کشتیاں جن کے اندر کرسمس کے درخت خوبصورت چراغوں کی طرح دور سے نظر آ رہے ہیں۔لوگ رقص میں محو ہیں۔سارا پیرس رنگین خوابوں کی چادر میں لپٹا ہوا ہے کہ تمام پیرس کے کلیساؤں کے گھڑیال زور زور سے بجنے لگے۔آج کرسمس کی رات کا پہلا پہر ہے لیکن آج میرا کے دل کے اندر اتنی دھند چھائی ہے کہ باہر اسے کچھ نظر نہ آیا سوائے اندھیروں کے جو تھکن سے چور چور کر رہے تھے۔اتنے آرڈر کرسمس پارٹیوں کے بک تھے کہ میرا نڈھال دکھائی دے رہی تھی اور محسن میاں خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔میرا کو تو کچھ یاد نہیں تھا۔نہ گھر، نہ محسن اور نہ ہی آج پیرس کی خوبصورت رات جس کے لیے لوگ دنیا بھر سے اکٹھے ہوتے تھے۔بس اسے ایک ہی چیز یاد تھی ہمارے آرڈر پورے کرنے ہیں۔اس نے کئی بار محسن سے کہا تھا۔

"پلیز محسن، اب یہ آرڈر بک کروانا بند کر دو۔میں اتنا کک نہیں کر سکوں گی۔"

"نہیں میرا ہر حالت میں تمام آرڈر جو خاص طور پر بہت اہم ہیں پورے کرنے ہیں۔اس سے پہلے جیسمین تو تمام آرڈر بغیر کچھ ہوئے ریسیو کرتی تھی اور یہ تو کروڑوں فرانک کی بات ہے۔کوئی آرڈر کینسل نہیں ہوگا۔سمجھیں آپ؟" محسن بار کی طرف مڑ کر چلے گئے۔

"واہ...... میرا واہ...... اپنے اور محسن کے درمیان کوئی حد تو قائم کرو۔یہ رشتوں کے بھرم کتنے نازک ہو گئے ہیں۔محسن کی ضرورت میں نہیں ہوں۔صرف پیسہ ہے اور میرا، تم پاکستانی سب سے اچھی بہترین کک، سستی اور بہت سستی صرف اور صرف کچھ نہیں تمام ملازمین جا چکے ہیں اور میرا تم کل صبح کی تیاریوں میں مصروف ہو صرف ایک ملازم کے ساتھ اور وہ گھر جہاں تم صرف رات کے چند گھنٹوں کے لئے جاتی ہو۔کس قدر خوش ہیں یہ لوگ آج کی رات اور خوشی میں ریسٹورنٹ کے خوبصورت لان میں بڑے سے رنگین کرسمس ٹری کے سامنے کئی جوڑے رقص کر رہے ہیں اور اس بھیڑ میں محسن نمایاں ہیں لیکن وہ اپنے ہوش میں کہاں ہیں۔انہیں تو یہ بھی یاد نہیں کہ میرا کون ہے اور آج کی رات میرا پر کس قدر بھاری ہے۔اب تو رات بھیگ بھیگ کر اور بھی برفیلی ہو گئی ہے کچن کے ساتھ ہی اٹیچ روم تھا۔وہ جسم و جان سے نڈھال سامنے پڑے صوفے پر بے سدھ ہو کر سو گئی۔نیند تو کانٹوں پر بھی آ جاتی ہے۔پچھلی رات کا اندھیرا اب تک آنکھوں میں بھرا تھا لیکن وہ ایپرن باندھے مسٹر لم کے ساتھ کچن میں کام کر رہی تھی۔بڑے بڑے دیگچے چیز بجلی کے چولہوں پر رکھے ہوئے تھے۔وہ یہی سوچے جا رہی تھی۔ہمارے اور محسن کے درمیان جو رشتہ اب نمایاں ہے اس کی حد کیا ہے؟ میں بیوی ہوں تو میری ذمہ داری کیا ہے اور اگر یہ صرف ایک بزنس ہے تو کوئی رشتہ واضح ہونا ہی چاہئے۔ورنہ یہ چھ ماہ کی تھکن مجھے ختم کر دے گی لیکن اب نہ کوئی احتجاج تھا اور نہ ہی کوئی سوال بس وہ اپنی زندگی کے لمحے یوں گزارے جا رہی تھی جیسے کوئی لمحہ آ کر خود اسے جگا دے گا۔پکار پکار کر کہہ اٹھے۔میرا آنکھیں کھولو۔محسن کی سنجیدگی ایک مذاق ثابت ہوگی لیکن ایسا کبھی نہ ہوا۔بلکہ آہستہ آہستہ تمام ذمہ داری خاموشی سے اس کے کاندھے پر اس طرح آ پڑی کہ اسے احساس تک نہیں ہوا۔آج پیرس کی صبح بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔سورج کی کرنیں ہرے ہرے سبزے کو موم کی طرح پگھلا رہی تھیں۔درختوں سے ٹپکتا ہوا پانی خوبصورت لگ رہا تھا۔جنگلی پھولوں کی بیلیں پھر سبز ہو رہی تھیں۔برف میں چھپے رنگ نکل رہے تھے۔بالکل اسی طرح سے ایک خیال ذہن میں دھند سے نکل کر آ گیا۔

"یہ جیسمین کون ہے؟ اور اس کے آنے سے محسن کے شب و روز میں تبدیلی کیوں آ گئی؟ اب محسن رات کو بھی گھر نہیں آتے جب میں تھکی ہوئی آتی ہوں۔بند کھڑکی سے باہر کی روشنیوں سے خوف آتا ہے۔تب بھی نہیں۔آنکھیں کھول کر دیکھوں تو ایک سیلاب زدہ بستی کے علاوہ کچھ اور نظر نہیں آتا۔لمحے اور

پل خوفزدہ رکھتے ہیں۔ میں کون ہوں اور کہاں سے آ گئی؟ یہ گھر کس کا ہے؟ وہ سنہرے خواب جو پلکوں کے سائے تلے بکھرے رہتے تھے، کیوں جل جل کر کوئلے ہو گئے ہیں۔ ان گلاب لمحوں کا حساب، ان راستوں کی مہک، میری چاہتوں کے خواب، میری منزل کیوں مجھے پور پور زخمی کرتی چلی جا رہی ہے؟ سکھیوں کی ہنسی، اپنوں کی محبت اور اپنے آپ کو آئینے میں دیکھ کر ہنس دینے والی بات، پھر کسی کی تمنا، چاہنے کے خواب کیوں دریائے سین کے گدلے پانی میں گر کر سوکھنے لگتے ہیں۔ آکاش پہ تارے بجھ گئے ہیں۔ چاند گہنا گیا ہے اور آنکھیں خشک ہوتی جا رہی ہیں۔ یک دم اس سوچ سے کہ جیسمین کون ہے، دل دھڑکا جا رہا تھا تیز تیز۔ کبھی کبھی کوئی سرا کوئی گرہ ہاتھ آ جائے تو ہاتھ میں پڑے ہوئے تنکے کی طرح اٹک جاتی ہے۔ تب دکھوں کے بند ٹوٹ جاتے ہیں اور میرا کے آنسوؤں سے دریائے سین کا پانی نمکین ہو جاتا ہے۔ دھرتی سسکتی ہے، ستارے ڈوب جاتے ہیں اور چاند دل میں ڈوب جاتا ہے۔ تب دل چاہتا ہے کہ آنچل کی گرمی سے آنکھوں کو سیراب کرتی رہوں۔ کوئی اپنا ہو تو دکھ رو لوں۔ کوئی اپنا کہے تو ہنس پڑوں۔ کوئی ہاتھ پکڑے تو میں مہک بن جاؤں۔ خوشبو بن کر ہواؤں میں اڑوں۔ کوئی تھامے تو میں رنگوں کی تتلی بن جاؤں۔ اڑتی اڑتی وہ دیس نکل جاؤں۔ افشاں بھری بستی میں کھو جاؤں لیکن نہیں، یہ بستی، یہ دریائی حسن سب اندر کہیں بجھ گیا ہے۔ میں خواب ہوں، میں آنسو ہوں جو آنکھ سے ٹپکا لیکن آنچل میں جذب ہو گیا۔ پھر صبح ہوئی، منزل کی طرف چل دیئے۔ محسن کی خاموشی اور بے اعتنائی خوفزدہ رکھتی ہے۔ کسی ہنستے ہوئے انسان کو خوفزدہ کرنا ہو تو بس بہت سیریس ہو جاؤ۔ پھر دیکھتے رہو، کٹھ پتلی کا تماشا۔ جتنا وہ جیسمین کے بارے میں سوچتی رہی۔ سوچوں کے بھنورا سے توڑتے رہے۔ وہ تھکن سے نڈھال پھر بھی بھنور میں ڈوبتی ابھرتی رہی۔ پھر اچانک نہ جانے کہاں سے احتجاج کی ہمت یکجا کر لائی۔

"ہیلو جیسی..... ہاؤ آر یو؟"

"فائن..... اور تم؟" اور تم کی بازگشت سنائی دی۔ اس اجنبی شہر اس اجنبی ماحول میں کوئی ہم زبان، وہ خود ہی قریب کے کاؤنٹر پر گھومتے ہوئے جاکناوڈ کے بار کو تھام کر کھڑی ہو گئی۔ جیسمین غیر ارادی طور پر میرا سے اردو میں مخاطب تھی اور میرا اس کے حلیے اور لباس پہ حیران تھی۔ الفاظ کی بازگشت اور تم کیسی ہو؟

"تو جیسمین تم اردو اسپیکنگ ہو؟"

"آف کورس۔" اس نے بغیر میرا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرا..... تم میرا ہو؟"

"ہاں..... میں مائرہ ہوں، سب میرا کہتے ہیں۔"

"اور میں یاسمین ہوں۔ لوگ یہاں جیسمین کہتے ہیں۔ ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔" جیسمین نے کمال بے نیازی سے بوتل کھولی اور گلاس لے کر دوسری طرف چل دی۔ میرا کا دل چاہا کہ وہ یاسمین کو روک لے اور پوچھے کہ تم کون ہو؟ کہ اب نہ خواب آتے، نہ آنکھوں میں کلیاں کھلتیں۔ بس دن یونہی گزرتے جا رہے تھے۔ میرا کچن میں انتہا سے زیادہ مصروف تھی کہ پھر اچانک اسے یاسمین کا خیال آ گیا۔ بس یونہی کسی سے وہ پوچھ بیٹھی۔ کیوں اس کی ملاقات اب یاسمین سے نہیں ہو رہی؟

"یو ڈونٹ نو ہو از شی؟" کیتھی نے تعجب سے پوچھا۔

"نو۔"

"شی از مسز محسن۔"

"مسز محسن..... نو..... نو..... آئی ایم مسز محسن۔" اس نے کیتھی کی طرف دیکھ کر کہا کیتھی بتا رہی تھی کہ نہیں تم سے پہلے یاسمین کچن میں کام کیا کرتی تھی لیکن اب باس کو اہم کام کے لئے جیسمین کی ضرورت تھی۔ اس لئے وہ بار سے انچ ہے اور باہر کے کام کرتی ہے۔"

"ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔" تو یاسمین جانتی ہے کہ میں کون ہوں؟ مجھ سے بہتر تو یاسمین ہے کہ وہ یہ تو جانتی ہے کہ میں کون ہوں۔ تجسس کو ایک ثبوت مل گیا تھا۔ وہ کیتھی کو جھٹلاتی رہی لیکن حقیقت کو کون آئینہ دکھلاتا۔ آنسو آنکھوں میں خشک ہو گئے۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے رات ایک بجے کچن سے باہر آئی۔ گھر کے تمام راستوں پر انگارے بھر گئے۔ ٹھنڈ سے زیادہ اس کے احساسات سرد ہو رہے تھے۔ گرتی ہوئی پھوار سے بے خبر وہ ریسٹورنٹ کے باہر ڈرائیور کے انتظار میں کھڑی تھی۔ ہارن کی آواز پہ میرا نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پہ یاسمین عرف جیسمین براجمان تھی۔ میرا نے کھوئی کھوئی نظروں سے یاسمین کو دیکھا۔ لیکن احتجاج کے سارے راستے بند تھے۔ پھر یاسمین سے شکایت کیا؟ یہ سونے کا پنجرہ ہے، جس میں بند رہنے کے خواب اس کے اپنے تھے، منزلوں کی تھکن یہ

مسافت یہ انتخاب اس کا اپنا تھا۔ تھکن سے پاؤں شل ہو رہے تھے۔ ہارن کی دوسری آواز پر اس نے نظر اٹھا کر بھی یاسمین کی طرف نہیں دیکھا۔ یاسمین خود گاڑی سے اتر کر اس کے پاس آ گئی۔

''ہیلو میرا!'' میرا ایک بت کی طرح اس کے ہاتھوں میں جھول گئی۔ لب خاموش، نہ صدا نہ احتجاج، اعصابی تھکن سے نڈھال ہو کر وہ گر ہی پڑتی اگر یاسمین اسے سہارا نہ دیتی۔

''میرا...... میرا...... بولو۔'' لیکن میرا خاموش تھی۔ یاسمین نے بمشکل اسے گاڑی میں ڈالا اور اسے اس کی خواب گاہ میں پہنچا کر چلی گئی۔ رات چپکے چپکے اس کے دکھوں پر سسکتی رہی۔ خاموش، تنہا، لمبی آنسوؤں بھری رات دریائے سین کے خوبصورت کناروں پر خوابوں کے ستارے گرتے رہے اور میرا اپنے بیڈ پر لیٹی رہی۔ ایک ابدی نیند سو جانے کی تمنا لیے کر سو کر نہ اٹھنے کی خواہش، تھکن کی مسافت اپنی صبحوں اور راتوں کا حساب مانگتے ہوئے سوچتے ہوئے نہ جانے کتنے گلاب لمحے سوکھتے رہے، مہکتے رہے۔ تمام دروازوں پر قفل ڈالے اپنی تمام تر بے بسی کے ساتھ وہ دن چڑھے تک بستر پر لیٹی رہی۔

اس کی تو زندگی خود اتنی مصروف تھی کہ اسے یہ بھی علم نہ تھا کہ کل رات محسن کہاں رہے اور دن کب سر پر آ گیا۔ کال بیل کی آواز پر میرا اٹھ بیٹھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے یاسمین کھڑی تھی۔

''ہیلو میرا! اب کیسی ہو؟''

''شکریہ۔'' اس نے اندر آنے کے لیے راستہ دیا تو یاسمین اندر چلی آئی۔ دونوں کے درمیان خاموشی تھی۔ تھوڑی دیر بعد یاسمین بولی۔

''میں نے تمہاری حالت کے بارے میں محسن کو انفارم کر دیا تھا۔ میرا، محسن نے جب تمہیں اپنی زندگی میں شامل کیا تھا تو مجھے اس حقیقت کا علم تھا لیکن مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ تم میری ذات سے لاعلم تھیں۔ باوجود کوشش کے میں تمہیں یہ تکلیف دہ خبر نہیں دینا چاہتی تھی کہ میں بھی مسز محسن ہوں لیکن تمہیں جو دکھ پہنچا ہے اس کی تلافی ناممکن ہے۔ میں ریسٹورنٹ کی اس بھاری ذمہ داری سے دستبردار ہونا چاہتی تھی۔ تم سے پہلے میں بھی اسی مقام پر تھی جہاں تم آج ہو۔ جب میں نے احتجاج کیا تو محسن نے مجھ سے اچھی کک ڈھونڈ لی۔ نہ محسن میرا تھا اور نہ محسن تمہارا ہے۔ سر چھپانے کے لیے ایک آسرا ہے بس۔ وہ آج کل ریسٹورنٹ میں آئی نئی لڑکی کارن کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ شاید تیسرا پنچھی جال میں

پھنسنے والا ہے۔'' میرا خاموش بیٹھی یاسمین کو تکتی رہی۔ ایک ایک لفظ کا زہر کانوں میں ٹپکتا رہا۔ اندر ہی اندر ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتی رہی۔ کب یاسمین اٹھ کر گئی اسے کچھ یاد نہیں۔ آج شب محسن نظر آئے لیکن اتنے سرد رویے کے ساتھ کہ باوجود کوشش کے کوئی احتجاج نہ کر سکی۔ زندگی کے اس نئے انداز کے بارے میں نہ پوچھ سکی۔ فیصلہ اسے خود کرنا تھا۔ کسی ایک موڑ پر اسے خود ہی رک جانا تھا۔ دو دن سے وہ کام پر بھی نہیں گئی تھی۔ ذہنی اور جسمانی طور پر وہ خود کو تھکا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ محسن نے پلٹ کر بھی نہیں پوچھا تھا کہ وہ کیسی ہے؟ کافی دیر سے بیٹھی وہ میگزین کے صفحے الٹ رہی تھی۔ 'میں یہ گھر چھوڑ دوں، واپس چلی جاؤں، محسن سے تمام رشتے توڑ دوں، اس ماحول میں گھٹ گھٹ کر صرف ایک ملازمہ کی طرح سے زندگی گزارنے سے تو بہتر ہے میں کسی اور جگہ ملازمت کر لوں۔ کافی دنوں سے اماں کا خط نہیں آیا۔ اس نے ایک ہفتے سے لیٹر بکس بھی نہیں کھولا۔ شاید سدرہ نے خط لکھا ہو۔ وہ بس یونہی سوچتی ہوئی باہر آ گئی۔ لیٹر بکس میں اماں کا خط دیکھ کر اٹھایا۔ وہ ایک بار پھر اپنی قسمت پر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ آنسو کچھ خشک ہوئے تو یونہی بے مقصد در شفاف پانی کی چادر کو تکتی رہی۔ وہ دریائے سین کے کنارے کنارے چلتی چلی گئی۔ ہلکا ہلکا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ ہوا میں جنگلی پھولوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ قدرتی انداز میں پھیلے ہوئے اس کنارے پر جہاں وہ کھڑی تھی، قدرت نے اپنی تمام خوبصورتی کا انمول خزانہ لٹا دیا تھا۔ شاہ بلوط اور بید کے درختوں پر سے پرندوں کی آوازیں دور سے آ رہی تھیں۔ وہ یونہی بے مقصد کھڑی رہی۔ گیلی مٹی اس کے قدموں تلے دبتی چلی گئی۔ کبھی کبھی نیولی کے پل سے کشتی گزرتی تو ساکت وجود میں حرکت ہوتی۔ کھڑے کھڑے تھک گئی تو گیلی مٹی پر بیٹھ کر بلا مقصد گھروندہ بناتی رہی۔ جب گھروندے کی دیواریں تیار ہو گئیں تو اس نے اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے اس گھروندے کو خود ہی توڑ دیا۔ پاس کھڑے ہوئے دو بچے جو بہت غور سے دیکھ رہے تھے، میرا سے اپنی زبان میں پوچھ رہے تھے۔

''آنٹی...... یہ بہت پیارا گھر تھا، آپ نے کیوں توڑ دیا؟''

''کچی مٹی کے گھر ٹوٹ ہی جایا کرتے ہیں۔'' بچے کچھ نہ سمجھتے ہوئے چل دیے۔ وہ وہیں گھنے درخت کے نیچے شفاف پانی کی چادر پر سدرہ کا خط تھامے بیٹھی رہی۔ کتنی بار پڑھنے کے باوجود خود میں تشنگی محسوس کر رہی تھی۔ یہ خط تو اس دریا کے پھیلے ہوئے کناروں کی طرح ہے جو پھیلتا ہی چلا جائے گا۔ ان

لفظوں کو اگر میں نے مقید نہ کیا تو سدرہ اس دریا کی طرح ہوگی جس کا کوئی سرا نہیں، جس کی کوئی قید نہیں۔ انسان بھی دریا ہے اگر اس کے چاروں طرف حصار نہ باندھا جائے تو وہ خودرو پودوں کی طرح اندر ہی اندر بکھر جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح شاہ بلوط اور بید کے گھنے درخت ہیں۔ ان جنگلی بیلوں کی طرح جو پانی میں جھکی پڑی ہیں۔ میرا گھر لوٹ جا، اپنے لئے نہیں دوسروں کے لئے، ایک ایک کر کے سفید پانی کی چادر پر اس کے گزرے ہوئے دن و رات گرتے رہے۔ وہ آنکھیں بند کرتی لیکن دریائے سین کے پانیوں میں ہر شکل کا دائرہ ابھرتا اور ٹھہر جاتا۔ ہاں، ہاں...... اس دائرے میں یہ شکل ہماری ہے۔ میں اسے پہچانتی ہوں۔ اظہر بھائی کی شادی اور ہمارا میٹرک کا رزلٹ دونوں ایک ساتھ، خوشی بن کر آئے تھے۔ اماں کتنی خوش تھیں اور ہم لوگوں کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ نہیں تھا لیکن یہ کیا ہوا بھابی کی جادو بھری محبت کچھ ایسی ثابت ہوئی کہ اس نے اماں کی منت اور ہم سب کی محبت کو چند دنوں میں ہی چھین لیا۔ بھابھی ہر وقت کمرے میں بند رہتیں۔ ہم لوگ اظہر بھائی سے باتیں کرنے کو ترس گئے وہ بھی کیا دن تھے۔ جب شام ڈھلتے ہی میں بڑے سے آنگن میں پانی کا چھڑکاؤ کر کے جھاڑو لگاتی۔ سدرہ گھڑونچی پر بڑی سی پانی کی مٹکی لا کر رکھ دیتی۔ صحن میں بان کی چارپائی پر سفید چادر اماں ڈالتی تھیں۔ سنہری سنہری دھوپ جامن کے چھدرے پتوں سے چھن چھن کر صحن کی اگلی دیوار پر گر رہی ہوتی۔ اظہر بھائی سیدھے ابا میاں کے بستر کے پاس پڑی ہوئی کین کی کرسی پر بیٹھ جاتے۔ گرم گرم چائے کی پیالی لئے وہ ابا میاں سے آفس کے بارے میں ڈسکس کرتے۔ اماں چوکی پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی ہوتیں۔ ابا میاں کی ریٹائرمنٹ کے بعد ہماری دونوں بہنیں سسرال کی ہو چکی تھیں۔ ان دونوں کی آمد ہم لوگوں کو نئی تکلیفوں میں مبتلا کر جاتی تھی۔ اظہر بھائی کی ملازمت نے اماں اور ابا کی پریشانیوں کو دھو ڈالا تھا۔ بس اماں کو تو ایک دھن سوار تھی۔ اظہر بھائی کی چاند سی دلہن آ جائے۔ چاند اترا، دلہن آئی مگر روشنی نہ رہی۔ وہ اظہر بھائی اب اس صحن میں بیٹھنے کے بجائے سیدھے کمرے میں چلے جاتے۔ ابا میاں خاموشی سے یہ دکھ جھیل تو گئے مگر پھر اسی خاموشی سے ایک رات ہم سے جدا ہو گئے۔ اماں ہر وقت خاموش رہتیں۔ میں اور سدرہ تنہا کمرے میں رہتے۔ اظہر بھائی اور بھابھی جلد ہی گھر چھوڑ گئے۔ بھابھی بڑے گھر کی تھیں اس لئے وہ اب مسلم لیگ کے کوارٹر میں رہتے ہوئے شرم محسوس کرتیں۔ صرف ہمارے گھر سے انہیں ڈگری یافتہ اظہر بھائی درکار تھے۔ ورنہ بقول ان کے ہم لوگ اس قابل نہ تھے۔

اماں نے جاتے وقت دعائیں ہی دیں کہ جہاں رہیں بس وہ خوش رہیں۔ ہمارے مستقل رونے پر بس اتنا کہا کہ یہ تو اچھا ہے کہ وہ اب خود مختار زندگی گزارے گا۔ اظہر بھائی جس طرح ہم لوگوں کو چھوڑ کر گئے۔ ہم خود کو تنہا محسوس کرتے۔ اب اماں ہر وقت اس فکر میں رہنے لگیں کسی نہ کسی طور پر مجھے اور سدرہ کو گھر سے رخصت کر دیں۔ ابھی میں نے انٹر ہی کیا تھا کہ خالہ زبیدہ نے روحیل کے نام کی انگوٹھی مجھے پہنا دی۔ روحیل، اماں سدرہ سب ہی کو پسند تھا۔ خالہ زبیدہ کو اماں اور ہم لوگوں سے خاص ہمدردی تھی کہ ہمارے اور ان کے دکھ ایک سے تھے۔ سہیل بھائی بھی اظہر بھائی کی طرح خالہ سے جدا ہو گئے تھے۔ خالہ اپنی دونوں بیٹیوں اور روحیل کے ساتھ سامنے والے کوارٹر میں کچھ عرصے پہلے آئی تھیں۔ ان کے برے دنوں میں اماں اور ابا میاں نے ان کو بہنوں کی طرح چاہا تھا۔ اسی لئے انہیں ہم لوگ بہت عزیز تھے۔ روحیل جو وقت کے ساتھ ساتھ جسم و جان میں شریانوں کی طرح پھیلتا چلا گیا۔ راحت، ناہید، سدرہ اور میں ساری ساری دوپہر جامن کے درخت کے نیچے کیرم بورڈ کھیلتے، کھانا بھی تقریباً اکٹھے ہی کھاتے۔ کھانا اس گھر میں تو پانی خالہ زبیدہ کے گھر میں پیتے۔ ہماری محبت پورے محلے میں مثال تھی۔ کبھی کبھی روحیل بھی شریک رہتا۔ اظہر بھائی کبھی کبھار ملنے آ جایا کرتے اور جانے کے بعد اماں کا دامن بھیگا رہتا۔ میں نے پرائمری اسکول میں نوکری کر لی تھی۔ زندگی بہت مطمئن اور پرسکون تھی۔ روحیل کی تو سدرہ دیوانی تھی، ہر وقت چھیڑ چھاڑ ہوتی رہتی تھی۔ راحت، ناہید اور سدرہ تینوں مل کر مجھے تنگ کرتیں روحیل کے نام سے، وہ دن کس قدر خوبصورت لگتے۔ بظاہر میں سب سے ناراض رہتی لیکن دل اس چھیڑ چھاڑ پر ہنستا رہتا۔ رنگوں بھرے لمحوں کی جھنکار رہتی۔ راتوں کو ہم دیر تک چھتوں پر باتیں کرتے۔ اماں ہم سب کو ڈانٹتی رہتیں۔ ڈانٹ بھی اچھی لگتی۔ ہنسی کا دورہ تو سدرہ کو پڑتا تھا۔ ہنستے ہنستے آنسو چھلک پڑتے۔ خالہ زبیدہ آوازیں دیتی رہتیں لیکن راحت اور ناہید کے لئے پریشان تھیں۔ روحیل نے گریجویشن کر لیا نوکری کے لئے دربدر خوار رہتا۔ شاید اسی لئے ان کے ذہن پر ہر وقت باہر کے ملک کی سوچ غالب رہتی۔ تلاش معاش نے مایوس کر دیا تھا۔ روحیل جلد از جلد ملک سے باہر جانا چاہتے تھے۔ خالہ زبیدہ سہیل بھائی کے بعد روحیل کو ہرگز کھونے کو تیار نہ تھیں لیکن ایک روز آخر روحیل اپنے مستقبل کے لئے سہیل بھائی کے پاس پیرس چلے گئے۔ وہاں ان کا اپنا بزنس تھا۔ سہیل بھائی نے تو خالہ زبیدہ کو کبھی نہیں پوچھا تھا لیکن روحیل، سہیل سے بہت مختلف تھے۔ ہر وقت سب کی فکر لگی رہتی۔

ایک سال میں خالہ زبیدہ کے گھر کا نقشہ بدل گیا۔ خالہ زبیدہ ایک دن کہہ رہی تھیں ان کوارٹروں میں کون ہماری بیٹیوں کو بیاہنے آئے گا۔ اماں تو یہ بات سن کر ہی ٹھنڈی پڑ گئیں لیکن خالہ جا چکی تھیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے خالہ اپنا گھر بیچ کر چلی گئیں۔ جاتے ہوئے راحت اور ناہید بہت خوش تھیں لیکن ہم لوگ برسوں کی رفاقت پر دل میں رو رہے تھے۔ اماں نے خالہ کو بھی دعا دے کر رخصت کر دیا۔ خالہ نے نئے گھر میں ہمیں بلایا تھا۔ کیا شاندار لگ رہا تھا روحیل بولا لیکن میں اور اماں اس گھر میں ان فٹ لگ رہے تھے۔

ہاؤس وارمنگ پارٹی میں ناہید اور راحت اپنے نئے پڑوسیوں سے تعارف کروا رہی تھیں لیکن میرا لباس مجھے شرمندہ کر رہا تھا۔ میں آج راحت اور ناہید کے درمیان بے جوڑ لگ رہی تھی۔ پیسے نے جہاں خوش کی تھی، وہاں رہن سہن میں کچھ تبدیلیاں بھی رونما ہو گئی تھیں۔ یہ سب سے کی بات تھی۔ کل جو ایک پلیٹ میں کھاتے تھے۔ وہ کانٹوں اور چمچوں کا استعمال کر رہے تھے۔ آہستہ آہستہ ہم سب ایک دوسرے سے دور ہو گئے۔ راحت اور ناہید بھول چکی تھیں میں نے ایک اسکول میں ملازمت کر ہی لی تھی۔ اس لئے وقت گزر ہی جاتا۔ لیکن اماں ان لوگوں کے جانے کے بعد بہت تنہا ہو گئی تھیں۔ میری ہر سانس روحیل سے وابستہ تھی۔ روحیل کی خبریں اکثر ہی مل جایا کرتی تھیں۔ پڑوس میں روحیل کے دوست رہتے تھے۔ روحیل کو گئے ہوئے پانچ سال ہو گئے تھے اور یہ پانچواں سال اپنے اندر سب سے زیادہ بدنصیبیاں لایا۔ زبیدہ خالہ اماں کی تمام امیدوں کو توڑ گئیں۔ ان کی بھی مجبوری راحت تھی۔ جن لوگوں نے راحت کو پسند کیا تھا، انہیں روحیل بھی پسند آ گیا تھا اور خالہ یہ بازی ہارنا نہیں چاہتی تھیں۔ بقول خالہ روحیل خود بھی یہ چاہتا تھا۔ اماں چپ چپ رہنے لگیں۔ یہ خبریں ہمیں زندہ درگور کر گئیں۔ ناطے جو محبتوں نے سمیٹے تھے، دور ہو گئے۔ ہمارے دکھ بانٹنے اکثر پڑوسی آتے۔ اماں کے پاس ایک ہی ناریک تھا۔ بہن کوئی اچھا سا لڑکا بتانا لیکن دو برس بیت گئے۔ ہم غریبوں کے کوارٹر میں کسی نے بھی آ کر نہیں جھانکا اور جو آتے بھی تو ہماری غربت اور ہمیں دیکھ کر واپس چلے جاتے۔ نہ انہیں حسن نظر آیا، نہ ذہانت دولت گھر میں تھی نہیں۔ اب تو سدرہ بھی بی ایس سی کر چکی تھی۔ ایک ایک کر کے ساری سہیلیاں رخصت ہو چکی تھیں۔ کوئی امریکہ تو کوئی انگلینڈ میں آباد تھی۔ رات اماں پڑوس میں کسی شادی سے واپس آئی تھیں۔ رشتہ کسی اخبار سے طے پایا تھا اور لڑکی رخصت ہو کر ہالینڈ جا رہی تھی۔ اداسی رگ و

پے میں بہنے لگی اور پھر روحیل، ناہید اور راحت بہت شدت سے یاد آئے۔ آنسوؤں سے تکیہ بھیگ گیا۔ سدرہ اٹھ اٹھ کر پانی پیتی رہی۔ اماں رات بھر جانماز پر بیٹھی رہیں اور میں اماں کے خوف سے کروٹ بھی نہ بدل سکی کہ کہیں دل کا بھید نہ کھل جائے۔ صبح ہوئی تو حسب معمول میں اٹھی لیکن دروازے پر کھڑی رہی ہاکر کے انتظار میں۔ دوسرے دن سے گھر میں اخبار آنے لگا۔ اماں خود کو اس نئی امید سے بہلا رہی تھیں۔ بے چاری ایک ایک اخبار کو سنبھال کر رکھنے لگیں کہ مہینے کے آخر میں بیچ دیں گی۔ ایک دن ایک اشتہار پر نظر ٹھہر گئی۔ ضرورت رشتہ کے کالم میں لکھا تھا۔

''صرف ایسی لڑکیاں جو بیرون ملک رہنا پسند کرتی ہوں۔ خود مختار لڑکیاں خود لکھیں۔''

ایک لمحہ کی دیر کئے بغیر میں نے اماں کی طرف سے خط لکھ کر پوسٹ کیا تھا۔ سدرہ میرے ساتھ اس راز میں شریک تھی۔ اماں بے خبر تھیں اور پتہ نہیں کیوں میں نے انہیں بے خبر ہی رکھا۔ کچھ دنوں بعد آنے والی ڈاک میں کئی خط شامل تھے۔ سارے خطوں کو ہم نے اور سدرہ نے رات میں چھپ چھپ کر پڑھا کہ کہیں اماں کو خبر نہ ہو جائے۔ ڈاکٹر، انجینئر اور فارن سیٹل لڑکوں کے کئی خط تھے۔ بس ایک خط پر نظر ٹھہر کر رہ گئی۔

''لڑکا پیرس میں مستقل رہائش پذیر ہے اور اپنا ذاتی کاروبار ہے۔ ذات پات کی کوئی قید نہیں۔ صرف لڑکی کا امور خانہ داری میں ماہر ہونا شرط ہے۔''

نجانے اس سے کتنے خواب روحیل کی شکل میں بن کر ٹوٹ گئے۔ تمام خطوں میں سے ایک خط چن ہی لیا۔ پتہ نہیں کیوں؟ محسن ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اب ان سے ملنے کا مرحلہ آ گیا تھا۔ اماں کو اطلاع دینی ہی پڑی۔ میرا خیال تھا اماں ہمیں تو جان سے مار ڈالیں گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ محسن ہمارے گھر آ کر اماں سے ملے ساری تفصیلات اماں کو بتا دیں۔ میں خود مختار تھی۔ اس لئے اپنے فیصلے کا اختیار بھی مجھے تھا۔ محسن سے میں مل چکی تھی۔ اماں نے اظہر بھائی کو بلا کر بتایا تو وہ بھی راضی تھے اور بھلا کیوں نہ ہوتے محسن میں بظاہر کوئی برائی بھی نہ تھی۔ انہیں جلد ہی چلا جانا تھا۔ اس لئے نکاح پہلے، رخصتی بعد میں طے پائی اور محسن ہر طرح کا اطمینان دلا کر واپس چلے گئے۔ میں ایک اچھا جیون ساتھی چن کر اور پیرس جا کر صرف اور صرف روحیل کو دکھانا چاہتی تھی کہ میں تم سے اچھی زندگی گزار رہی ہوں۔ اظہر بھائی اور بھابھی اب ہر روز آتے۔ وہ بھی اب کافی بدل چکے تھے۔ اماں مطمئن تھیں کہ اظہر بھائی کو اپنی

ذمہ داری کا احساس ہو گیا۔ بھابھی کا کہنا تھا کہ اماں تنہا نہیں رہ سکتیں۔ اس لئے وہ روز ادھر آ جاتی ہیں۔ محلے والے ہماری قسمت پر رشک کرتے ہیں۔ میں بھی اب دن رات وہاں جانے کے خواب دیکھا کرتی۔ ہر پل، ہر لمحے وہاں جانے کا خیال ساتھ رہتا۔ کاش اس وقت اس ایک پل کو رک کر اپنے انجام پر نظر ڈالتی تو شاید یوں تنہا اور سنسان جگہ پر بے یار و مددگار آنسو نہ بہا رہی ہوتی۔ ہر گزرا پل اس وقت اسے رلا رہا تھا، دکھی کر رہا تھا، اس نے بھی دل کھول کر ان آنسوؤں کو بہنے دیا۔

'میرا، ایک بار پھر فیصلہ کرنا ہے۔ جذباتی ہو کر نہیں بلکہ دماغ سے کام لے کر۔' اس نے روتے روتے خود سے کہا۔

''محسن نے اتنا بڑا جل دیا ہے تمہیں، اب اپنے اور محسن کے درمیان کوئی ایسا رشتہ تلاش کر لو جو تمہیں ان آنسوؤں سے نجات دلا جائے۔ جو اس شب کے بھیگتے ہوئے دامن کو تم پہ پھیلنے سے پہلے سمیٹ لے۔ زندگی کے ان انجانے راستوں پر چلتے چلتے تم تھک جاؤ گی، گر جاؤ گی، ٹوٹ جاؤ گی۔ کسی ایک موڑ پر رک جاؤ۔ یوں رات کے اندھیروں میں بھاگنے سے نجات کے رستے نہیں ملتے یوں کھو دینے سے راہ نہیں ملتی۔ یہ جنگلی بیلوں کی طرح ہے۔ کیوں تم دریا میں ڈوب رہی ہو۔ خودرو پودے بھی اپنی حفاظت کرتے ہیں۔ تم تو پھر بھی ایک انسان ہو۔ لوٹ جاؤ میرا اس گھر جہاں کی چھت اپنی تھی، خشک روٹی اور ایک پانی کا گلاس تمہارا اپنا تھا لیکن یہ ریشمی چادر جو محسن نے تمہارے تن پر ڈالی ہے اس سے وہ کھدر کی ردا اچھی تھی جس میں تم اپنے جسم کو چھپائے رکھتی تھیں۔ جو دل کے زخموں کو چھپائے رکھتی تھی لیکن یہاں پر ایک ایک ٹانکا ادھڑ کر باہر آ رہا ہے۔ محنت کر کے اتنی تھکن نہیں محسوس ہوتی جتنی آج یہ جان کر ٹوٹ رہی ہوں کہ وہ شخص میرا بھی نہیں ہے۔ ہر عورت ایک مکمل شوہر چاہتی ہے۔ تقسیم شدہ شوہر کی بیوی ان قدرتی پھیلے ہوئے کناروں کی طرح ہے، جن کا کوئی سرا نہیں، جن کی کوئی منزل نہیں جو زخموں کی تپش بڑھا دیتے ہیں۔ جو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتے ہیں۔'' وہ بہت کچھ سوچتی رہی اور پھر آخر کار گھر لوٹ آئی۔

رات بستر پر لیٹ کر بھی وہ بے چین رہی کہ مجھے تو گھر اور محسن کے علاوہ اپنی ذات بھی یاد نہیں رہی تھی لیکن دو برسوں میں آج کیوں اتنی کسک بڑھ گئی ہے کہ نڈھال لگ رہی ہوں۔ اے خدا مجھے صحیح فیصلہ کرنے کی توفیق عطا فرما دے۔ اے خدا! میں نے آج فیصلہ تجھ پر چھوڑ دیا۔ جو بہتر ہے کر دے۔ پیرس کی بھیگی رات کی طرح وہ سسک سسک کر رو رہی تھی، ٹھنڈک کا احساس بڑھ گیا تھا۔ محسن کے انتظار میں رات

بیت رہی تھی لیکن محسن آج شب بھی گھر میں نہیں آئے تھے۔ ہاتھ میں دبا ہوا خط بھیگ کر نرم پڑ گیا تھا۔ وہ تھکے ہوئے مسافر کی طرح بے دم سی بیڈ پر پڑی تھی۔ اسے پھر سدرہ اور اماں یاد آ گئیں۔ اس لئے ایک بار پھر دل کی تسلی کے لئے ان کا خط پڑھنے بیٹھ گئی۔ اماں کے خط کے ساتھ ہی ایک اور خط تھا۔ جس کو وہ آنسوؤں کی دھند میں نہیں پڑھ پائی تھی۔ آنکھوں کو میرا نے رگڑا اور پڑھنے لگی۔ اماں نے لکھا تھا کہ سدرہ کے منگیتر کو تم محسن سے کہہ کر وہاں بلوا لو۔ اظہر کے سسرال والوں نے بات طے کرتے وقت یہ شرط رکھی ہے۔ تم اس بات کا جواب کیوں نہیں بھیجتیں۔ وہ لوگ جواب کے منتظر ہیں۔ میرا تمہاری بہن کے مستقبل کا سوال ہے۔ یہ کام ہر قیمت پر کر دو۔ ورنہ وہ لوگ رشتہ توڑ دیں گے۔ میرا...... یہ کام ہر قیمت پر کر دو...... میرا...... سدرہ کے خوابوں کی قیمت میرا اپنا ہے۔ زیبا باجی جو ہار دکھا کر آتی تھی لیکن کہتی تھی کہ گر پڑی تھی۔ بے چاری ہر راہ کسی نہ کسی کا زینہ دھوتے ہوئے گر جاتی تھی حالانکہ سب جانتے تھے کہ اس کے شوہر نے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا ہے۔ پھر بھی وہ زخموں پر دوسروں سے چھپا نہیں دکھواتی تھی۔ گھر لوٹنے سے سب پر قیامت ٹوٹ جائے گی۔ سدرہ پھر تیری ہی طرح کسی اشبار کا چکر کاٹے گی۔ سب کی تمنائیں جو وقت رخصت آنچل میں بھر لائی تھی، آنسوؤں میں ڈوب جائیں گی۔ اظہر بھائی اور بھابھی بھی لوٹ جائیں گی۔ میرا سدرہ کی محبت کی قیمت کیا یہ آنسو ہیں؟ اماں کو جیتے جی مت مارو۔ میرا تم تو ویسے بھی مر چکی ہو۔ اب جن لوگوں کی قسمت تم سے وابستہ ہو چکی ہے۔ ان کا خیال کرو۔

''دکھ دینے کا حق تمہارے پاس نہیں ہے میرا۔ آنسو کمزور کر دیں گے تمہیں۔ مت رو، مت رو میرا۔'' اس نے بچوں کی طرح خود کو سمجھایا کہ اس کے پاس خود کو حوصلہ دینے کے لئے کوئی بھی نہ تھا۔ ایک خدا کی ذات جس سے وہ رو رو کر اپنے لئے بہتری کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔ وہ ٹیرس پر ٹہل ٹہل کر کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتی تھی۔ من میں اگنی دہک دہک کر سرد پڑ گئی اور پھر آخر کار وہ ایک نتیجے پر پہنچ گئی۔ وہ محسن کے انتظار میں تھی اور سب کچھ کہہ دینا چاہتی تھی۔ نیلگوں آسمانی رنگ اندھیرے سے نکل رہا تھا۔ کلیسا کے آہنی دروازے پر آرچ بشپ کھڑا تھا۔ لوگ دریا کے کنارے اپنی آپادھاپی میں مگن تھے۔ اسی سمے گارڈ نے گیٹ کھولا تو محسن گھر آ رہے تھے۔ وہ خاموشی سے ٹیرس سے بیڈروم میں واپس آ گئی۔

''کیا ہوا ہے جو تم نے یہ حالت بنا رکھی ہے۔ یہ سب ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یاسمین کہہ رہی تھی کہ تم بیمار ہو تو بھی آرام کر لو ایک ہفتے تک۔'' میرا نے زود یدہ نظروں سے محسن کو دیکھا اور اس کے

سامنے ایک کاغذ رکھ دیا۔

''یہ کیا ہے؟'' محسن نے کاغذ پر نظر دوڑاتے ہوئے پوچھا۔ جس پر لکھا تھا۔

''ایک ماہ کی چھٹی، چھ ماہ کی ایڈوانس تنخواہ سدرہ کے منگیتر کے لئے ورک پرمٹ اور ایمپلائمنٹ ویزا چاہئے۔ ورنہ میں اس ہوٹل میں کام نہ کرسکوں گی۔ میں نے کسی دوسرے ہوٹل میں ملازمت کا بندوبست کرلیا ہے دسر!'' میرا کو بے بس کردینے والا محسن آج اس کے سامنے خاموش رہ گیا تھا۔ آج اسے پرچانا بہت مشکل لگ رہا تھا۔ آج میرا کی بات کو رد کرنا بڑا مشکل تھا۔. اس نے حیرت سے میرا کو دیکھا جو کسی پتھر کی طرح اپنے فیصلے پر قائم تھی جس کی آنکھوں میں عزم اور ارادہ صاف جھلک رہا تھا۔ محسن نے کافی دیر بعد سوچ کر کہا۔

''ٹھیک ہے وائیمپلائمنٹ ویزے کا بندوبست ہوجائے گا لیکن انہیں چھ ماہ فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ میں کام کرنا پڑے گا۔'' میرا دکھتا ہوا دل لئے اماں کو خط لکھ رہی تھی آنسو پھسل پھسل کر گال سے بہہ رہے تھے لیکن اس نے اپنی محبتوں کا قرض اتار دیا تھا۔ کوئی غم، کوئی دکھ نہیں تھا۔ سب دکھ مٹا کر وہ ریسٹورنٹ کی طرف بہت تیزی سے خود ڈرائیو کرکے جارہی تھی۔ شانزے کی خوبصورتی رم جھم کرتی پھوار میں اور حسین لگ رہی تھی۔ شاہ بلوط کے پتے اس کے عزم اور ارادے کو داد وتحسین دے رہے تھے۔ آخری موڑ کاٹ کر اس نے گاڑی کو روکا اور آج اسی دریا کے کنارے اس نے مائرہ حبیب کو دفنا دیا اور اب وہاں صرف میرا تھی۔ جس نے وقت کی گرفت اب اپنے ہاتھ میں لے لی تھی کہ جو زندگی واپس لوٹ کر اب وہ گزارتی یہ اس سے کہیں بہتر تھی کہ واپسی کی صورت میں اب صرف جگ ہنسائی اور رسوائیاں اس کا مقدر ہوتیں۔ اماں اور سدرہ کی خوشیاں اس کے پیروں سے لپٹ گئی تھیں۔ کیا ہوا میرا، کچھ نہیں ہوا۔ کوئی طوفان آیا نہ ہی کوئی بجلی گری ہے صرف محسن نام کا ایک جھوٹ کا لبادہ اوڑھ کر زندہ رہنا ہوگا اس بھیڑ میں، ورنہ کہاں جاؤ گی؟ اس حسین سمندر میں محسن کا نام ہی ایک سہارا ہوگا۔ اگر بے سہارا ہو کر گھر لوٹ جاؤ تو معاشرے کی دیواریں گھٹ جائیں گی اور پست ہو کر ختم ہوجاؤ گی۔ ساتھ ہی اماں اور سدرہ بھی۔

''نہیں نہیں، میرا نہیں..... تمام دکھ تم خود تنہا دل میں اتار لو۔ محسن ہوسکتا ہے اور بھی کئی حصوں میں بٹ جائے لیکن تم بھی ایک حصہ ہو میرا محسن کی زندگی کا۔'' اس نے ایک نئے عزم کے ساتھ گاڑی کا رخ ہوٹل کی طرف موڑ دیا۔

بادلوں سے بھری ہوئی رات کا نشیلا اندھیرا چاروں طرف پھیل گیا تھا۔ چاند بادلوں کی اوٹ سے جھانک رہا تھا۔ کبھی کبھی شرما کر درختوں کے پیچھے سے ابھرتا اور آسمان کے بڑے سے دشت کو پار کرنے کی کوششیں کرنے لگتا۔ کمرے میں ٹیوب روز کی خوشبو ٹھیک آٹھ بجے پھیل گئی تھی۔ ملی جلی مہندی کی مہک میں وہ کچھ اور بھی اپنے وجود میں سمٹ گئی۔

''اللہ پلیز ہاتھ تھوڑا سیدھا کیجئے۔'' سومی نے ہری ہری مہندی سے اس کے ہاتھوں کو رنگتے ہوئے کہا تو وہ شرما گئی۔

''تھوڑا گہرا کرو، صاف پڑھا نہیں جارہا۔''

''تم عینک لگوالو۔'' نعیم بھائی نے فوراً ہی ہما کو جواب دیا۔

''کچھ ہوا یہ بولیں گے ضرور۔ بھائی تم تھوڑی دیر کے لئے یہاں سے نہیں جاسکتے؟''

''ایک پل کے لئے بھی نہیں جاسکتا۔''

''آپ بھی مہندی لگوا لیجئے۔'' سومی نے نقش ونگار بناتے بناتے سر اٹھا کر کہا تو سب ہی ہنس پڑے۔

''سومی کی بچی ذرا جلدی ہاتھ چلا، میں بھی لگواؤں گی۔''

''نہیں نہیں آج میں صرف اپنی ہونے والی بھابھی کے لئے ہوں۔''

''لگتا ہے کوئی زبردست رشوت ملی ہے۔''

''ہاں ملی ہے۔'' اس نے ندا کی مخروطی انگلی سے اس کی انگوٹھی کو مہندی سے بچاتے ہوئے کہا۔

''بس بھی کرو۔'' ندا نے آہستہ سے کہا۔

''جی نہیں۔'' اس کے دونوں ہاتھ مہندی سے سجے ہوئے تھے اور انگلی میں خاور کی دی ہوئی ڈائمنڈ کی رنگ دمک رہی تھی۔ سارے کمرے میں ہری مہندی کی خوشبو اور معطر لبوں کے قہقہے بکھر رہے تھے۔ ہوا کے

جھونکوں سے جالی کا پردہ دریچے سے ہٹ گیا۔ چاند پھر درختوں کے پیچھے چھپ کر جھانک رہا تھا۔ اسے لگا چاند اس کے ساتھ ساتھ اس بڑے سے آسمان کے وشت کو پار کر رہا ہے اور وہ مسافتیں طے کرتے کرتے تھکی جا رہی ہے۔ ساعتوں کے سفر میں کسی کے ساتھ جا رہی ہے۔ چاند کے ہنڈولے میں اڑتی ہوئی اس خواب کی بستی میں اتر رہی ہے۔ جو کچھ دیر پہلے اس کی آنکھوں میں لہرائی تھی۔ گئے موسم کی وہ بھیگی بھیگی سی گلابی شام تھی جب سورج تھوڑی سی جھلک دکھا کر دن کی مسافت طے کر رہا تھا۔ پرندے اڑتے ہوئے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ سرخ حویلی جو لال اینٹوں سے بنی ہوئی تھی۔ اس کے بند دریچوں تک ہار سنگھار کی لمبی بیل اپنے سفید اور زرد بوجھ کو لئے جھک آئی تھی۔ کیاریوں میں بے شمار موگرے کی ننھی ننھی کلیاں اپنے لب کھولے آمد بہار کا انتظار کر رہی تھیں۔ طویل روش طے کرتے وقت ہی اسے اس کوٹھی میں نئے ہنگامے کا احساس ہوا۔ ندا نے حویلی کے بالائی حصے پر نظر ڈالی جہاں ہما کھڑی زور زور سے کسی بچے کو آواز دے رہی تھی۔ آج زہرہ پھوپھی آ رہی تھیں۔ ندا نے سامنے بیٹھی ہوئی دادی جان کو دیکھا جو بہت مصروف تھیں۔ ہما نے اس کے اندر داخل ہوتے ہی اطلاع دی۔

"ندا آپا! آج پھوپھی جان آ رہی ہیں۔"

"معلوم ہے۔" اس نے بے اعتنائی سے کہا۔

"اور ساتھ خاور بھائی بھی ہوں گے۔ سوچ لینا۔" نعیم بھائی بیچ میں بول پڑے اور پھر اس کی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھا ندا مسکرا دی۔

"تو میں کیا کروں؟" دادی جان نے اسے آواز دی تو وہ جلدی سے نعیم بھائی سے پیچھا چھڑا کر بھاگی۔

"جی دادی جان!"

"ارے دیکھ۔ تجھی تو کوئی ڈھنگ کا جوڑا پہن لے۔" دادی جان کو ہمیشہ اس پر رحم آتا کہ کالج سے آ کر گھر کے کاموں میں لگی رہتی ہے اور اس کے بعد ان کی خدمت۔ دادی جان اپنی خوشی کو چھپانے کے لئے بار بار اپنی بھیگی آنکھوں کو دوپٹے سے صاف کرتیں۔ سیما بہت مصروف نظر آ رہی تھی۔ عارف اور آصف ایئر پورٹ گئے ہوئے تھے۔ حویلی میں کافی رونق اتر آئی تھی۔ بہن کی آمد کی خبر سن کر زرینہ دو دن سے آئی ہوئی تھیں۔ یہ زہرہ سے صرف ایک سال بڑی تھیں اور اس کے بعد توصیف اور یوسف تھے۔ یوسف خان سامنے والی حویلی کے بالائی حصہ میں رہتے تھے جبکہ توصیف نچلے حصے میں مقیم تھے۔ ہارن کی آواز

پر دادی جان کا دل زور سے دھڑکا۔ کتنے سالوں کے بعد زہرہ ماں کے پاس آ رہی تھیں۔ ورنہ وہ اس سے پہلے تو ہر سال ہی آ جایا کرتی تھیں۔ اکثر وہ سال میں دو چکر بھی لگا لیتی تھیں۔ لیکن کچھ حالات ہی ملک کے ایسے ناسازگار ہو گئے کہ وہ نہ آ سکیں۔ زہرہ کے شوہر مشرقی پاکستان میں رہتے تھے، وہ اکثر ماں اور بہن بھائیوں سے ملنے آ جایا کرتے تھے لیکن بدنصیبی کہ دونوں حصوں میں تعصبی شعلے بھڑک اٹھے اور جب شعلے بھڑک کے بند ہوئے تو وہاں صرف راکھ کا ڈھیر تھا۔ وجود تو جل گیا تھا۔ دونوں حصے ایک دوسرے سے الگ ہو گئے تھے۔ جانی اور مالی نقصان میں زہرہ کا گھر بھی متاثر ہوا۔ زہرہ کے شوہر اسی طوفان کا شکار ہو گئے۔ مال و دولت سب ختم ہو گیا تھا۔ مل پر دوسروں کا قبضہ تھا۔ پتہ نہیں کس طرح سے زہرہ نے اپنے بچوں خاور، تانیہ اور سمیرا کو محفوظ رکھا۔ زہرہ اس سانحہ سے بری طرح متاثر ہوئی تھی۔ اماں جان نے تو رو رو کر اپنا برا حال کر لیا تھا۔ پھر یوسف اور توصیف نے بھاگ دوڑ کر کے پتہ چلایا کہ زہرہ اور بچے دوسری جگہ شفٹ ہو گئے ہیں اور خیریت سے ہیں۔ تب جا کر اماں کو کچھ تسلی ہوئی تھی اور آج وہ پہلی بار اپنے بچوں کو لے کر اپنے وطن واپس آ رہی تھی۔ اماں جان کی بار بار آنکھیں بھر آتیں۔ ان کا بس چلتا تو پل میں زہرہ کو سمیٹ کر لے آتیں لیکن مجبوری انسان کو بے بس کر دیتی ہے۔ ندا اور دوسری لڑکیاں ہارن سن کر گیٹ کی طرف بھاگیں تو دادی جان کو یقین ہو گیا کہ زہرہ آ گئی ہے اور اس یقین کے ساتھ ہی ان کی آنکھیں ایک بار پھر جل تھل ہو گئیں اور زہرہ کی صورت تو دیکھ کر وہ اندر سے بالکل ٹوٹ پھوٹ گئیں۔ زہرہ ماں کے گلے سے یوں لگی کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اماں اس کے سونے ہاتھ دیکھ دیکھ کر روتی رہیں۔ بھانجیوں نے بہت مشکل سے چپ کرایا۔ گھر کے لوگ جو اتنے بڑے سانحے کو بھول گئے تھے وہ پھر ایک بار تازہ ہو گیا کہ زہرہ بیوہ ہو گئی ہے۔ بھائی بہت سوگوار تھے اور بھابیاں بھی۔ زہرہ کو تسلی دے رہی تھیں۔ زہرہ پہلی جیسی زہرہ ہی نہ لگ رہی تھی۔ جو بات بات پر ہنستی، بھاری بھر کم جسم اور سیاہ بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹے خاور اور تانیہ سمیرا کے پیچھے بھاگتی پھرتی تھی۔ اس کے لمبے بال بار بار کھل کر کمر پر آ جاتے اور وہ دونوں ہاتھوں سے سمیٹنے لگتی۔

"اماں بچوں نے بہت تنگ کیا ہے۔" زہرہ بچوں کی شکایت اماں سے کرتی تو بھائی یوسف خان اس کو ڈانٹ دیتے۔

"زہری! انہیں کچھ مت کہنا یہ ہمارے مہمان ہیں۔" سیما ممانی بھی بچوں سے لپٹی رہتیں۔ تب ہی چھوٹی

سی ندا آ کر اس کے پیروں سے لپٹ جاتی اور وہ فرطِ مسرت سے اسے اٹھا کر بار بار اچھالنے لگتی۔ اماں جان زہرہ کو ڈانٹنے لگتیں۔

''ارے رہنے دے گر جائے گی۔''

''نہیں اماں! مجھے یہ غزالی آنکھوں والی ہرنی بڑی پیاری لگتی ہے۔'' اس کا نام بھی اس نے رکھا تھا ندا یوسف، اور تھی بھی ندا بہت پیاری بھورے بھورے بال اور گہری گہری آنکھیں نازک سی، تب ہی اماں جان نے کہا تھا۔

''لے جا اسے اپنے ساتھ، اتنی پیاری لگتی ہے تو۔''

''سچ اماں...... یوسف سے بات کروں۔ ویسے بھی زبیدہ بھابھی نے یہ بچی مجھے دی تھی اور دیکھو اماں! یہ مجھے ممی کہتی ہے۔''

''ہوں، وہ تمہارے بچوں سے سنتی ہے ناں اس لئے۔'' تب ہی وہ پیار سے ندا کو اچھال دیتی۔

''کیوں بنے گی میری بیٹی؟ چلے گی میرے ساتھ؟'' اور کھوئی کھوئی آنکھوں والی ندا اثبات میں سر ہلا دیتی۔ خاور اور تانیہ دونوں اس بھوری سی گڑیا کو غور سے دیکھتے جو ماں کے ہاتھوں میں کھلونا لگتی تھی۔ خاور اور تانیہ دونوں ہی ندا سے کافی بڑے تھے۔ صرف سیمرا ندا سے چھوٹی تھی اور پھر وہ چلی جاتی اور جب واپس آتی تو برسوں کا سمٹا ہوا پیار ندا کے لئے امڈ آتا۔ سب جانتے تھے کہ زہرہ ندا کو بہت عزیز رکھتی ہے۔ یہ بات سیما کو بہت کھٹکتی تھی لیکن اس میں اتنی جرأت نہیں تھی۔ لاکھوں میں کھیلنے والی ندا کو کچھ کہہ سکے، لاکھ ندا اس کی سوتیلی بیٹی سہی لیکن وہ اپنے جذبات ظاہر نہیں کر سکتی تھی۔ زہرہ سیما کے سامنے ندا کو جب بھی پیار کرتی تو اسے سخت ناگوار گزرتا۔ سیما نے آخر ایک دن ہنس کر کہہ ہی دیا۔

''ندا اور ہما دونوں ہی تمہاری بھتیجیاں ہیں لیکن ندا سے تمہارا بے اختیار پیار مجھے یہ احساس دلاتا ہے کہ میں غیر خاندان سے آئی ہوں۔''

''ارے نہیں بھئی! یہ تم نے کیسے سوچ لیا؟'' سیما کے لبوں پر معنی خیز سی ہنسی بکھر گئی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر چلی گئی۔ زہرہ نے جاتی ہوئی سیما کو دیکھا جو بہت تیزی سے ہُما کا ہاتھ تھامے بیڈ روم کی طرف جا رہی تھی۔ اس نے گھبرا کر ندا کو دیکھا جو اس کے پاس اس کا ہاتھ تھامنے کے لئے کھڑی تھی۔ تب ہی اسے زبیدہ یاد آ گئی۔ یوسف خان کی پہلی بیوی، پتہ نہیں کب اور کیسے یوسف خان کی زندگی میں زبیدہ کی

جگہ سیما نے لے لی اور اس انکشاف پر زبیدہ بالکل ساکت ہو گئی۔ نہ اس نے اپنا حق مانگا نہ کسی سے کچھ شکایت کی۔ بس اس نے چلتے وقت زہرہ سے روتے ہوئے اتنا کہا تھا۔

''زہرہ آپا! یوسف اور اس سے زیادہ میری کیا بے عزتی کر سکتا ہے کہ اس نے میری موجودگی میں سیما سے شادی کر لی میں جا رہی ہوں۔'' اور پھر اس نے ایک نظر اپنے گزرے ہوئے دنوں پر ڈالی اور چلی گئی۔ پھر زبیدہ نے پلٹ کر نہ دیکھا اور نہ یوسف نے خبر لی کہ وہ کہاں ہے۔ سیما نے یوسف کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا اسے ہر اس بات کا پتہ تھا۔ جو یوسف اور زبیدہ کے درمیان اختلاف کا باعث تھی۔ یوسف خان گھر دیر سے آتے تو سیما اس کو اہمیت نہ دیتی۔ یوسف خان ریس کورس جاتے تو وہ خود ان سے ہار جیت کے بارے میں بات کرتی۔ اسے تمام ان باتوں سے گھبراہٹ ہوتی تھا۔ جو یوسف کی کمزوریاں تھیں۔ سیما کی گرفت یوسف پر مضبوط ہو چکی تھی۔ یوسف خان بہت خوش تھے انہیں زندگی کا وہ شریک حیات مل گیا جو ان کے ساتھ قدم ملا کر چلتا تھا۔ بعض اوقات یوسف خان جلدی گھر آ جاتے تو وہ پریشان ہو کر پوچھتی۔

''خیریت تو ہے آج آپ جلدی گھر آ گئے؟'' جب کہ زبیدہ دیر سے گھر آنے پر سارا دن روٹھی رہتی۔ اماں سے شکایت کرتی زہرہ آپا کو بتاتی کہ آج یوسف رات کو گھر نہیں آئے لیکن اب اگر اماں کہتیں تو سیما آزردہ ہو کر کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیتی وقت پر سیما کی گرفت ہما کی پیدائش کے بعد اور مضبوط ہو گئی۔ اب اسے یقین تھا کہ زبیدہ کبھی واپس نہیں آئے گی۔ اس کے دھڑکتے دل کو کچھ یقین ہو گیا تھا۔ اماں جان، توصیف اور دونوں بہنیں سیما سے کھنچی رہتیں۔ پھر ایک دن زبیدہ اپنی بانہوں میں ندا کو سمیٹے داخل ہوئی۔ سامنے زہرہ آپا نظر آ گئیں جو کہ بچوں کی چھٹیوں میں مشرقی پاکستان سے آئی ہوئی تھیں۔

''زہرہ آپا آپ اسے رکھ لیں۔ یہ آپ ہی کا خون ہے۔'' یہ کہتے ہوئے زبیدہ کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے، اس نے جھک کر تین سالہ ندا کو زہرہ کی گود میں ڈال دیا۔ زہرہ کچھ نہ سمجھ سکیں۔ انہوں نے گھبرا کر دیکھا اور پھر ندا کو اپنی بانہوں کے حصار میں بھر لیا۔ تب ہی اماں جی نے کہا۔

''دیکھو زبیدہ! جو ہونا تھا ہو چکا۔ یہ گھر تمہارا ہے، اگر تم چاہو تو یہاں رہ سکتی ہو۔ یوسف پر آج بھی یہ حق تمہیں حاصل ہے۔''

''نہیں تائی جان، اب یہ حق میری بچی کو دلا دیجئے گا۔ میں جا رہی ہوں نہ قسمت نے میرا حق دیا اور نہ

وقت نے مجھے زندگی دی۔" اس نے جھک کر ندا کو پیار کیا اور اشارے سے زہرہ کی طرف انگلی اٹھا کر ندا کو بتایا۔

"دیکھو یہ ہیں تمہاری ممی۔" اور پھر وہ اپنی محرومیوں کو سمیٹے چلی گئی۔ تب سب ہی لوگ، سوچ رہے تھے کہ اب سیما کیا کرے گی؟ یوسف آئیں گے تو کیا ہوگا؟ اماں جان طرح طرح کے وسوسوں میں گھری ہوئی تھیں۔

"اماں جان! آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں؟ میں یوسف سے بات کروں گی، وہ سمجھتا کیا ہے اس طرح آنکھ بند کر لینے سے کیا مسائل حل ہو جائیں گے؟" اور جب یوسف خان گھر آئے تو تمام باتیں سن کر ندا کو دیکھنے چلے گئے اور ندا کو دیکھ کر ان کا دل چاہا کہ اس من موہنی گڑیا کو اپنے وجود میں سمیٹ لیں، لیکن وہ سیما سے کچھ خوفزدہ تھے کہ وہ کہیں کوئی ہنگامہ نہ کر دے لیکن سیما بہت ہوشیار تھی۔ وہ ہمیشہ وقت دیکھ کر گفتگو کرنے والی عورت تھی۔ اس نے پیار سے ندا کو گود میں لے لیا۔ اس اعلیٰ ظرفی پر سب ہی اس کے مداح ہو گئے۔ اماں جان بھی چپ ہو گئیں۔ زہرہ آپا کے بہتے ہوئے آنسو زبیدہ کے لئے کوئی فریاد نہ کر سکے اور پھر سیما نے ندا کو ہما پر فوقیت دی یہ بات یوسف خان نے بھی محسوس کی لیکن وہ کر بھی کیا سکتے تھے اور پھر ایک دن جب ندا پانچ سال کی تھی تو زبیدہ جس نے کبھی کوئی حق نہ مانگا تھا۔ زندگی کی بھیک بھی نہ مانگی اور خاموشی سے دنیا سے منہ موڑ لیا۔ یہ خبر سن کر اماں جان پھوٹ پھوٹ کر رو دیں اور یوسف بھی سارا دن ندا کو گود میں لئے لئے پھرتے رہے اور ندا سب کو حیرت سے تکتی کہ آج سب لوگوں کو کیا ہو گیا؟ سوائے آنسوؤں اور اسے پیار کرنے کے سوا کوئی کام نہیں۔ گھر کا کوئی فرد زبیدہ کا آخری دیدار نہ کر سکا۔ خاندانی رنجشیں دیوار بن گئی تھیں اور ان لوگوں کو اس کے مرنے کی اطلاع بھی نہ دی۔ تب سیما کو ندا پر بار بار پیار آیا اور وہ بھی کئی دن تک سوگوار رہی۔ یوسف خان کو اس نے سب سے بڑھ کر تسلی دی اور اس طرح اس نے یہ غم کچھ دنوں میں غلط کر دیا اور یوسف خان اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ ندا کو پیار کرتے اور وہ بھی اپنے پاپا کی اس تبدیلی پر حیران ضرور تھی لیکن ناسمجھ تھی اس کی سمجھ میں یہ بات کیسے آتی کہ پیار اس کی ماں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا تھوڑا سا ازالہ ہے جو جانے کے بعد اس کے حصے میں آ جاتا ہے۔ پھر ہما کے بعد آصف اور عارف کو پا کر سیما اپنی زندگی سے مطمئن ہو چکی تھی اور یوسف خان بھی اب اپنے ضمیر سے خوفزدہ نہیں تھے۔ ندا کو اب احساس ہو چکا تھا کہ اس کی ماں مر گئی

ہے۔ وہ زیادہ وقت دادی جان کے ساتھ رہتی اور دادی جان بھی اسے ایک پل جدا نہ کرتیں اور جب زہرہ پھوپھی مغربی پاکستان آتیں تو ندا کو کسی کی کوئی پرواہ نہ ہوتی۔ وہ سارا سارا دن خاور اور ثانیہ کے ساتھ کھیلتی رہتی۔ ہما پر رعب جماتی آصف اور عارف کو تنگ کرتی لیکن اسے کوئی کچھ کہنے والا نہیں تھا۔ وہ ہر بات پر زہرہ کے پیچھے چھپ جاتی۔ سیما اکثر کہتی۔ "زہرہ آپا کو دیکھ کر تو ندا کے چار پیر ہو جاتے ہیں۔" اور وہ اپنا سر ہلا کر بڑے مزے سے کہتی۔

"مما میرے تو صرف دو پیر ہیں۔" اس پر خاور اور نعیم اپنی ہنسی نہ روک سکتے۔ زہرہ بے اختیار ہو کر اسے پیار کر لیتیں اور سیما اپنی بڑی نند کا خیال کر کے کچھ نہ کہتی۔ ویسے بھی زہرہ کا سب پر رعب تھا۔ وہ سب کے دکھ درد میں شامل تھیں۔

"ہزار بار کہا ہے کہ کالی چوڑیاں مت پہنا کر۔ دیکھا نا چوٹ لگ گئی۔" دادی جان نے روتی ہوئی ندا کو اور دو چار ہاتھ مارے، وہ روتی ہوئی پھوپھی سے لپٹ گئی۔ اس کی سفید کلائیوں سے خون کے قطرے بہہ رہے تھے۔

"بیٹا! دادی جان کو وہم ہے کہ کالی چیز کے استعمال سے کوئی مصیبت آ جاتی ہے۔"

"اس سے بڑی مصیبت کیا کوئی اور بھی ہے؟" خاور نے شرارت سے روتی ہوئی ندا کو چھیڑا تو وہ اور بھی رونے لگی۔

"ندا تمہیں چوٹ لگ گئی؟" ہما نے پوچھا تو وہ اور زور سے رونے لگی۔ ہما نے کہا۔ "آپی تم کالے کپڑے اور چوڑیاں مت پہنا کرو۔"

"کیوں تم بھی تو پہنتی ہو؟"

"میری تو مما بھی پہنتی ہیں۔"

"میری بھی تو مما ہیں۔"

"نہیں تمہاری مما تو اللہ میاں کے پاس چلی گئیں۔" اس نے تصدیق کے لئے زہرہ کی طرف دیکھا تو زہرہ نے اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

"نہیں، میں تمہاری مما ہوں۔"

"سچ!"

''بالکل سچ۔'' بچے کوئی بھی شرارت کرتے نام ندا کا لیتے اور وہ معصومیت سے جھوٹا اقرار کرتی اور بعد میں کہتی۔

''دیکھا مجھے کوئی کچھ نہیں کہتا۔'' اور سب ہی اسے بڑی حسرت سے دیکھتے اور وہ اور بھی سب کو تنگ کرتی تایا توصیف کے صحن میں جا کر سب کے ساتھ مل کر وہ سارے کچے پکے فالسے توڑ لاتی۔ لا کر سب مل کر کھاتے اور پوچھ گچھ ہوتی تو سب اس کا نام لیتے اور وہ بڑی معصومیت سے تایا کے سامنے اقرار کر لیتی۔ وہ پیار سے ایک دو دھپ اس کے ریشمی بالوں پر لگاتے اور فالسے خود توڑ توڑ کر اسے دیتے، دوسرے بہن بھائی اسے للچائی نظروں سے دیکھتے۔ تب کہیں سے خاور اور نعیم بھائی آ جاتے اور وہ ڈانٹتے۔ وہ ہمیشہ خاور اور نعیم بھائی کو دیکھ کر رک جاتی، اسے وہ بالکل اچھے نہیں لگتے تھے اس کی شکایتیں دادی جان سے کرتے تھے اور پھر دادی جان سب کو سختی سے دھوپ میں پھرنے سے منع کر دیتی تھیں۔ وہ چپکے سے دادی جان کی نظر بچا کر دبے پاؤں نکل جاتی خاور اور نعیم بھائی آ کر اطلاع دے دیتے۔

''دادی جان آپ ندا کو سمجھا لیں وہ صحن میں کھیل رہی ہے، اس نے ہم لوگوں کا کرکٹ کھیلنا حرام کر دیا ہے۔''

''ہاں ممی! آپ اس مصیبت کو اندر بلا لیجئے، اگر چوٹ لگ گئی ناں تو پھر ہمیں کچھ مت کہیے گا۔'' خاور ماں سے شکایت کرتا، زہرہ ہنستے ہوئے بولیں۔

''اب یہ مصیبت تو بیٹا جی تمہیں ہی بھگتنی پڑے گی۔''

''جی نہیں میں فالتو نہیں ہوں۔'' خاور چڑ کر کہتا نعیم بھائی بہت مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے اور خاور پیر پٹختا ہوا باہر چلا جاتا تو دادی جان مسکرا دیتیں۔

''زہرہ اس طرح بچوں سے بات مت کیا کر۔'' دادی جان اپنی بیٹی کو سمجھاتیں لیکن زہرہ اپنی ہر بات بچوں کے سامنے کر دیتی تھیں اور پھر ایک دن ندا نے روتے ہوئے زہرہ کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا۔

''پھوپھی جان! خاور بھائی کہتے ہیں تم سے شادی نہیں کروں گا۔ تم بہت شریر لڑکی ہو۔'' زہرہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ دادی جان نے اپنی مسکراہٹ کو چھپا کر کہا۔

''زہرہ اسی لئے کہتی ہوں کہ بچوں سے مذاق مت کیا کرو۔'' زہرہ نے ماں کی بات کا جواب دیئے بغیر اپنی ہنسی کو مشکل سے روکتے ہوئے ندا کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر کہا۔

''جاؤ ان سے کہو۔ پھوپھی جان تمہیں اس دن بہت زیادہ ماریں گی۔'' اور وہ بہت تیزی سے خاور کو یہ اطلاع دینے بھاگی۔ کتنی بار سرخ اینٹوں کی بنی ہوئی حویلی میں زہرہ بہار کا جھونکا بن کر آتیں، کبھی ہنسا کر اور کبھی رلا کر چلی جاتیں۔ ہر بار وہ اپنی محبتوں کے خزانے ندا پر لٹاتیں اور وہ کھوئی کھوئی سی آنکھوں والی شریر لڑکی زہرہ کے انتظار میں گن گن کر دن گزارتی۔ دادی جان کے ساتھ ساتھ رہتی، اسے اب ہر ایک سے ڈر لگنے لگا تھا۔ پاپا سے بہت کم بات کرتی۔ سیما کی محبتوں کے اندر سمٹے ہوئے زہرہ پھپھو پیچھے اب وہ اس شعور کو پہنچ گئی تھی کہ خاور کے نام سے شرما جاتی اور جب نعیم بھائی جان بوجھ کر اس سے پوچھتے کہ خاور کا کوئی خط آیا تو وہ نظریں نیچی کر کے جواب دیتی۔

''نہیں۔'' اور پھر ہر گیا سال اس کی آنکھوں میں رنگ بھر جاتا۔ جب وہ خاور کی تیز نظروں سے بچتی پھرتی اور خاور ہر کام کے لئے اس کو ڈھونڈ نکالتا۔ وہ بات بات پر ''جی ہاں'' کہے جاتی۔ دھنک کے تمام رنگ، اس کی ذات میں سمٹنے لگتے۔ ندا کو ایسا لگتا جیسے وہ ہواؤں میں اڑ رہی ہے۔ تیز بہت تیز تتلی کی طرح شوخ رنگوں کی تلاش میں۔ بہتے ہوئے پانیوں کے خواب میں جو اس کو اپنی لہروں میں بہا رہی تھیں۔ زندگی رواں دواں تھی۔ ندا کے سارے کزن اس کو بڑی حسرت سے تکتے انہیں اس کی قسمت پر رشک آتا۔ ہما کو سہیلیوں سے اپنے کزن خاور اور ندا کی بات کر کے خوشی ہوتی۔ کبھی کبھی اسے رشک بھی آتا وہ اپنی دوستوں سے کہتی۔

''ندا آپی ہی ان کے قابل تھیں۔ پتہ ہے رخسانہ! ہمارے کزن خاور بھائی اس قدر ہینڈسم ہیں کہ بس دیکھتے رہ جاؤ۔'' سیما بظاہر کچھ نہ کہتی لیکن ہمیشہ اسے خاور کا اڑتا ہوا پیار اور زہرہ آپا کی محبت ایک آنکھ نہ بھاتی۔

''یہ خوشی کے لمحے بہت جلد بیت جاتے ہیں۔ نعیم بھائی ایسا لگتا ہے کہ بس دو چار ہفتے ہی رہ کر جا رہا ہوں۔''

''تو میرے بھائی کس نے کہا ہے کہ تم جاؤ ویسے بھی وہاں تم اداس ہو گے۔ میں تو کہتا ہوں کہ تم دادی جان سے بات کر کے اپنا چیک کیش کروا لو۔'' ندا موقع دیکھ کر جلدی سے کہیں دوسری طرف چل دیتی۔

''آ گیا یاد کوئی بہت ضروری کام؟'' نعیم ندا کو دیکھ کر کہتا۔

''اوہ نعیم بھائی آپ تو بس۔''

''بس نہیں اب کروا ہی ڈالو۔''

''پہلے تو آپ کی ہوگی۔ میرا نمبر تو آپ کے بعد آتا ہے۔''

''چلو تو ایسا کرتے ہیں اپنے نمبر آگے پیچھے کر لیتے ہیں۔'' تب ہی دادا جان کی آہٹ پر سب خاموش ہو جاتے اور پھر یہ موسم بہار کے دن پل میں بیت جاتے۔ خاور تانیہ اور سمیرا سب سے رخصت ہو کر اداس ہو جاتے۔ ندا کی آنکھیں بار بار بھیگ جاتیں۔ اب کھل کر سب کے سامنے رونے سے کترانے لگی تھی۔ زہرہ اسے گلے لگا کر بار بار پیار کرتیں اور جب نیلی نیلی آنکھیں روتے روتے لال ہو جاتیں تو خاور کے اندر کوئی چیز ٹوٹ جاتی اور وہ بے چینی سے اپنی پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے بار بار نظر بچا کر ندا کو دیکھے جاتا جو پتہ نہیں کس بات پر آنسو بہا رہی تھی۔ زہرہ پھوپھی کی بے انتہا محبت، اپنی محرومی یا خاور کی جدائی کے تصور سے اپنے آنچل سے آنسوؤں کو چھپا رہی تھی۔ خاور کے ہونٹوں پر ایک اداس مسکراہٹ بکھر جاتی اور وہ خدا حافظ کہہ کر چلا جاتا۔ ندا صرف اسے جاتے ہوئے دیکھتی تب وہ کسی بہانے سے مسکرا کر پلٹ کر پیچھے دیکھتا تو ندا روتے روتے بھی شرما جاتی اور پھر سرخ اینٹوں سے بنی حویلی میں ایک سال کے لئے خاموشی چھا جاتی لیکن آج کئی سالوں کے بعد اس حویلی میں پھر موسم بہار آیا تھا۔ ہر شخص مصروف تھا۔ زہرہ اماں کے گلے لگی رو ئے چلی جا رہی تھی اور آصف اور عارف خاور سے باتوں میں مصروف تھے۔ سمیرا مسکرا مسکرا کر ندا کی ایک ایک ادا پر قربان ہو رہی تھی وہ اپنے شعور میں پہلی بار ندا سے مل رہی تھی پہلے تو اتنی چھوٹی تھی کہ بچپن کچھ یاد نہ تھا۔ بس ایک مدھم سا عکس ذہن میں تھا اس حویلی میں آنے کے اور اس کے بعد کے قصے تو اس نے اپنی ماں سے بہت سن رکھے تھے اور وہ اداس آنکھوں والی گڑیا کی کہانی جسے زہرہ نے اپنے بچوں سے زیادہ چاہا جو خاور کی منگیتر تھی اور جو اس حویلی میں خاور بھائی کی منتظر تھی۔

''تانیہ تم تو پہچانی ہی نہیں جا رہی ہو۔''

''کیوں بہت زیادہ خراب ہو گئی ہوں۔''

''ارے نہیں بہت اسمارٹ لگ رہی ہو۔''

''اور پتہ ہے آپ اس قدر یاد آتی تھیں ندا آپی کہ بس دل چاہتا تھا کہ پر لگ جائیں اور میں اڑ کر پہنچ جاؤں۔''

''ہاں اس لئے تو چار خطوں کے جواب میں ایک خط لکھتی تھیں۔'' ندا نے تانیہ سے شکایت کی۔

''ارے بھئی کچھ تھوڑی سی لفٹ مجھے بھی دے، دو اتفاق سے میں بھی آپ کی کزن ہوں۔''

''ارے ہما تم بلی گاڈ اتنی بڑی ہو گئیں۔'' تانیہ نے ندا کا ہاتھ چھوڑ کر ہما کو کر ڈالا۔ ندا اپنے چہرے پر خاور کی تیز نظروں کو محسوس کر رہی تھی۔ تانیہ اور سمیرا کو لے کر بالائی منزل پر چلی گئی اور پتہ نہیں کہاں کہاں کے قصے، پورے خاندان کی باتیں، اپنے بچپن کی باتیں کرتی رہیں۔ ہما اور سمیرا دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتی تھیں۔ ندا نے مسکرا کر تانیہ کو یاد دلایا۔

''اور تمہیں یاد ہے کہ خاور بھائی نعیم بھائی ہم لوگوں سے کتنا تنگ رہتے تھے۔''

''تو ہم کون سے شریف تھے۔'' ہما نے کہا۔

''ندا آپی تو صیف ماموں نظر نہیں آرہے تھے۔''

''وہ کچھ دنوں کے لئے باہر گئے ہوئے ہیں۔ ویسے انہیں تم لوگوں کی آمد کی اطلاع دی ہے۔ جلد ہی آجائیں گے۔''

''اس قدر دور یا دلی سے ہنسنے پر ٹیکس لگتا ہے۔'' خاور نے مڑ کر دیکھا تو نعیم بھائی اسے ٹوپی اتار کر سیلوٹ کر رہے تھے۔ خاور کو پہچاننے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوئی۔ نعیم اور خاور ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔ پچھلی رفاقتوں میں نعیم بھائی کا چہرہ نمایاں تھا۔ اکثر خاور کو نعیم یاد آتے رہتے وہ جب کراچی جاتا تھا تو نعیم بھائی کے ساتھ گزرے ہوئے دن بھی کیا دن ہوتے تھے۔ ایک ہنگامہ زندگی کے تمام لمحے اتنے حسین ہو جاتے کہ بس دل چاہتا کہ دل میں اور آنکھوں میں بسا ئے رکھیں۔ ندا نے دونوں کو مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

''جی ٹیکس اس لئے یہ محترم لگا رہے ہیں کہ کچھ ہی دن ہوئے انکم ٹیکس ڈپارٹمنٹ میں سروس کر لی ہے۔''

''اوہ آئی سی۔'' خاور نے مسکرا کر دوبارہ ہاتھ ملایا۔

''کہو تو نانی جان سے کہہ کر جلدی ہی ٹیکس لگا دوں۔'' ندا نے مصنوعی غصے سے نعیم بھائی کو آنکھیں دکھائیں۔

''نعیم بھائی ٹیکس چیک کی صورت میں چلے گا یا کیش؟'' خاور نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

نعیم بھائی نے بہت رعب سے ندا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"زیادہ اکڑ مت دکھانا ورنہ چیک کیش کروا دوں گا۔" ندا نعیم بھائی کے ان جملوں کو اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اس لئے وہ خاور کے سامنے گھبرا گئی اور یہ کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

"پہلے اپنا تو چیک کیش کروا لیجئے دوسروں کی فکر مت کریں۔"

"اے لڑکی کیا کہا؟" اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتے ندا کمرے سے جا چکی تھی اور کمرے میں نعیم اور خاور کے قہقہوں کی آواز گونج رہی تھی۔ گھڑی نے آٹھ بجائے تو ندا نے چونک کر دیکھا۔ "ارے تائی کھانے کا ٹائم ہو گیا ہے باتیں تو رات کو کریں گے۔"

"ہاں چلو مما کی بھی آواز آ رہی ہے۔" ہما نے اپنے بالوں میں بڑے اسٹائل سے پن لگاتے ہوئے کہا۔

کھانے کی میز پر سب ہی لوگ موجود تھے اور باتوں کا سلسلہ تھا کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ سیما نے پلیٹ میں چاول نکالتے ہوئے بہت ہی دزدیدہ نظروں سے ندا کی طرف دیکھا اور پھر کسی سوچ میں گم ہو گئی۔ نعیم بھائی آخر بول ہی پڑے اور بہت ہی اداکاری سے جیسے کہ بے چارے کچھ جانتے ہی نہیں۔

"میں بہت دیر سے محسوس کر رہا ہوں کہ خاور اور ندا ایک دوسرے سے شاید متعارف نہیں؟" ندا نے چونک کر دیکھا۔ خاور بہت آرام سے آہستہ آہستہ کھا رہا تھا۔ نعیم بھائی کی بات کا کسی نے بھی نوٹس نہیں لیا البتہ سیما کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور زہرہ نعیم کی شرارت کو بھانپ گئی۔ تب ہی ہما نے لقمہ دیا۔

"کیوں کیا آپ اس حویلی میں سی آئی ڈی افسر لگے ہوئے ہیں؟"

"فی الحال تو نہیں لیکن اگر حالات یہی رہے تو کچھ سوچنا پڑے گا۔"

"آپ سوچنے کو تو رہنے ہی دیں آخر ہم لوگ کس دن کام آئیں گے؟" عارف نے یونہی بات کہہ دی لیکن ندا نے اپنے سے پانچ سال چھوٹے بھائی کو دیکھا۔ جس کے لفظوں میں سیما کا رنگ تھا۔ یوسف خان اپنے بھانجے سے گفتگو کرتے رہے اور زہرہ سے ہمدردی۔ تائی اور سوبی اپنے ماموں جان کی شفقت سے بہت متاثر تھیں۔ خاور بھی یوسف ماموں کے بڑھتے ہوئے کاروبار سے مرعوب تھا۔ دادی جان تفصیل سے اپنی بیماری کا حال سنا رہی تھیں۔ ساتھ ہی ندا کی خدمت گزاری کا حال۔ نعیم بھائی مسلسل خاور کو اپنے پیروں سے چوکا دیتے اور وہ یوسف خان کی باتیں سنتے سنتے اشارہ کرتا کہ ابھی چلتا ہوں۔ سب ہی اس شرارت کو جان گئے تھے۔ سوائے بڑوں کے اور پھر تمام رات یہ لوگ باتیں کرتے

رہے۔ آج صبح ہی سے مطلع ابر آلود تھا۔ آسمان پر کالے بادل لہرا رہے تھے اور دوپہر کی آمد سے پہلے ہی موسلادھار بارش شروع ہو گئی۔ روش پر ہارسنگھار کے زرد زرد پھول صبح سے بکھرے بارش کے پانی سے تر و تازہ ہو گئے۔ ہواؤں نے پورے گیراج میں گلابی بوگن ویلیا کے پھولوں کو بکھیر دیا۔ پیلے پیلے امرندا کے پھول بارش کی زد میں آ کر پھیل گئے۔ سرخ حویلی کے اندر داخل ہونے والا راستہ پھول اور پتوں سے بھر گیا تھا۔ ملگجے سائے بلند ہوئے اور بارش تھوڑی دیر کے لئے رک چکی تھی۔ نعیم کی کار تیزی سے پورچ میں داخل ہوئی۔ ساتھ خاور جو پانی میں شرابور تھا اور کوٹ کے کالر اوپر تک اٹھائے ماتھے پر آئے ہوئے پانی کو وہ مسلسل صاف کر رہے تھے۔ یہ لوگ بارش میں لانگ ڈرائیو کر کے آئے ہوئے تھے۔

"بدتمیزی کی بھی حد ہوتی ہے۔ آخر یہ جوتے باہر بھی اتارے جا سکتے تھے۔" سیما نے پانی اور کیچڑ سے بھیگے جوتوں کی طرف دیکھا اور بڑبڑاتی ہوئی اندر چلی گئی۔ سب لوگ سیما کی اس تبدیلی کو محسوس کر رہے تھے۔ خاص طور پر ندا کا خاور سے بات کرنا اسے بالکل پسند نہ تھا۔ میز پر رکھی ہوئی چائے ٹھنڈی ہو گئی۔ خاور صرف سوچتے ہی رہ گئے۔ آخر ممانی ایسا کیوں کرتی ہیں؟ ندا شرمندگی سے نظریں نیچی کئے دادی جان کے پاس چلی گئی۔

"جب سے یہ مصیبت یہاں پر وارد ہوئی ہے میرا تو چین بالکل ختم ہو گیا ہے۔ رہا سہا سکون بھی غارت ہو گیا پہلے ہی کون۔ ۔ یہ ڈھنگ سے رہ رہے ہیں جواب ایک اور مصیبت سر پر سوار ہو گئی۔" بغیر سوال کا جواب لئے سیما یوسف سے گوش گزار کر رہی تھی اور بیوی کے سوالوں کو نظر انداز کئے وہ آنے والے کل کی طرف دیکھ رہے تھے جہاں انہیں دولت کے انبار نظر آ رہے تھے۔

"مما آخر آپ ایسا کیوں کرتی ہیں، خاور ہمارے کزن ہیں؟" غصہ میں بل کھاتی سیما کو دیکھتے ہوئے ہما نے کہا۔

"بس حمایت مت کرنا تم عمر بھر نہ ٹھہرا تو صیف بھائی کے بچوں کا اور ہمیشہ ندا ہی آنکھوں میں کھبری رہی اور جب وقت پڑا ہے تو یوسف سب سے پیارا بھائی ہو گیا اور ہاں مجھے یہ بالکل پسند نہیں ہے کہ تم ان لوگوں کے ساتھ اس دھاچوکڑی میں شامل ہو۔" زہرہ پھوپھی اور خاور کو آئے ہوئے تقریباً ایک مہینہ ہو گیا تھا ہر وقت ایک ہنگامہ رہتا لیکن ندا بہت کم ان لوگوں کے درمیان ہوتی اول تو وہ خاور کی گہری نظروں اور نعیم بھائی کی چھیڑ چھاڑ کا سامنا نہیں کر سکتی تھی۔ دوسرے سیما بالکل پسند نہیں کرتی تھی وہ خاور سے زیادہ بات

کرے بعض اوقات تو وہ زہرہ پھوپھی کے پاس بھی نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ فوراً ہی کوئی ضروری کام یاد آجاتا اور وہ بھی' جی مما ابھی کرتی ہوں'' یہ کہہ کر اٹھ جاتی۔ شب و روز چپکے چپکے بیتتے جا رہے تھے۔ ندا سب کچھ بھول کر اپنے ایم اے کے آخری سال کی تیاری میں لگی ہوئی تھی۔ خاور نے اپنا بزنس شروع کر دیا تھا اور وہ اکثر ٹور پر جاتا تھا۔ سیما اپنے خوابوں کی دنیا میں گم تھی اسے ہر وقت اپنے اسٹینڈرڈ کو مین ٹین کرنے کی فکر رہتی تھی۔ مما نے کئی بار اسے یاد بھی دلایا کہ امتحان سر پہ ہیں پھر بھی وہ بہت مطمئن نظر آتی نعیم بھائی کی پوسٹنگ کوئٹہ ہوگئی تھی اور اس طرح سے گھر میں کچھ خاموشی چھائی تھی۔ سیما کو آج کل یہ پرانے طرز کی حویلی زہر لگ رہی تھی۔ مما بھی اس کی ہم خیال تھی۔

''پاپا جب میری کوئی دوست گھر آنے کے لئے کہتی ہے تو ٹال جاتی ہوں۔ مسز زبیر کو دیکھیں کیا خوبصورت کوٹھی بنوائی ہے آخر آپ کے ہی پارٹنر ہیں۔ پھر پاپا آپ کچھ تو سوچیں۔''

''بس تم دعا کرو، جیسے ہی کوئی پارٹی آئی سب سے پہلے تمہیں ایک شاندار کوٹھی بنوا کر دوں گا۔''

''ارے رہنے دیں یہ خواب آپ مجھے عرصے سے دکھا رہے ہیں میں تو کہتی ہوں اپنا گھر تو ہونا ہی چاہئے۔ بچے اب بڑے ہوگئے ہیں۔ کل ہی عارف کہہ رہا تھا کہ دوستوں کو کیسے بلاؤں یہاں تو اب بیٹھنے کی جگہ نہیں رہ گئی۔''

''اوہ سیما آخر یہ بھی کوئی دقت ہے۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' یوسف نے اپنی ٹائی کی ناٹ باندھتے ہوئے کہا اور بہت تیزی سے چلے گئے اور پھر یہ مسئلہ دادی جان تک پہنچ گیا کہ سیما کو اب یہ حویلی پسند نہیں ہے۔ زہرہ بہت اداس تھی کہ شاید یہ مسئلہ اس کی وجہ سے پیدا ہوگیا لیکن سیما نے بہت خوبصورتی سے انہیں سمجھایا۔

''ارے نہیں آپا یہ بات نہیں بچے بڑے ہوگئے ہیں۔ یہاں آس پاس عجیب و غریب لوگ آباد ہیں۔ یہ کوئی رہنے کی جگہ ہے۔ پورچ میں نعیم کی کار کھڑی ہو جاتی ہے تو یوسف باہر کھڑی کرتے ہیں اور اب عارف نے اپنی کار لے لی ہے تو اس کا بھی روز مسئلہ ہوتا ہے۔ اب دیکھو ناں ندا بڑی ہوگئی ہے۔ آخر اس کو بھی تو بیاہنا ہے۔ لوگ ظاہری چمک دیکھتے ہیں اور ویسے بھی آپ کو تکلیف ہوتی ہے۔''

''نہیں سیما مجھے تو کوئی تکلیف نہیں اگر تمہیں محسوس ہو تو کہو، بیٹا اب تو خاور بھی اس قابل ہوگیا ہے۔'' زہرہ نے سیما سے بہت آہستہ سے کہا۔ ماحول میں خاصی کشیدگی تھی۔ ہر شخص خاموش تھا۔ ندا ابھی ابھی

پاپا اور مما کے فیصلہ کو سن کر آئی تھی کہ وہ لوگ جلد ہی اس حویلی سے دوسری جگہ شفٹ ہو جائیں گے۔ دادی جان نے خاصی مخالفت کی لیکن سب بیکار، پھوپھی زہرہ نے یوسف کو لاکھ دلائل دیئے سب فضول، توصیف بھائی نے تجویز پیش کی کہ اگر زیادہ ہی ببہ ہے تو اس کو از سر نو تعمیر کر ڈالو لیکن مسئلہ رہائش کا نہیں تھا اب یہ معاملہ اسٹیٹس کے اردگرد چکر کاٹ رہا تھا۔ اور اس ضرورت کو اب یوسف خان نے بھی محسوس کیا کہ بچے صحیح کہتے ہیں۔ وقت کا تقاضا یہی ہے سوسائٹی میں موو کرنے کے لئے یہ ضروری ہے۔ آج ندا کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی سب ہی لوگ سو گئے تھے۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر ٹیرس میں آگئی سامنے لان میں لگے درختوں کی شاخوں سے جھانکتا ہوا چاند اسے بالکل اپنی طرح تنہا اور اداس لگ رہا تھا۔ وہ بہت دیر سے کھڑی جانے کیا خلاؤں میں دیکھتی رہی۔ آہٹ پر اس نے مڑ کر دیکھا خاور اس کی طرف آرہا تھا۔

''ارے ندا تم اور اس وقت؟''

''ہاں نیند نہیں آ رہی تھی سوچا تھوڑی دیر یہاں ٹہل لوں۔''

''عجیب اتفاق ہے آج مجھے بھی نیند نہیں آ رہی۔'' ندا خاموش ہوگئی۔

''کیوں کیا بات ہے بات نہیں کرنا چاہتیں؟''

''جی ابھی نہیں۔''

''ندا!''

''جی!''

''کیا تمہیں صرف یہی آتا ہے؟ جی ہاں اور جی نہیں اس کے آگے بھی تو کہا اور سنا جا سکتا ہے۔'' خاور اس کے بہت قریب آگیا۔ ندا نے مارے گھبراہٹ کے اس کی طرف سے چہرہ دوسری طرف کر لیا اور وہ اس کے بے پناہ حسن کو یکٹک دیکھتا رہ گیا۔ خاور نے اس کی گھبراہٹ کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''ندا بعض باتیں بتائی نہیں جاتیں صرف محسوس کی جاتی ہیں لیکن آج میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ ممی کو میں نے روکا ہے کہ وہ کوئی بات ماموں جان سے نہ کریں میں تھوڑا صرف تھوڑا سا وقت چاہتا ہوں اور پھر بس تانی کی شادی کے بعد میں مزید انتظار نہیں کر سکتا۔'' ندا حیرانی سے انہیں دیکھ رہی تھی اور اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

''میں تمہیں زیادہ دن ممانی جان کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔'' محبت میں ڈوبی ہوئی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ اس لمحے خاور بھی بہت اداس ہو گیا اور وہ بے چینی سے ٹہلنے لگا۔

''لیکن خاور میں نئے گھر میں جاؤں گی۔ تم پاپا سے بات کیوں نہیں کرتے؟''

''ندا قبل از وقت بات اپنا بھرم کھو دیتی ہے کیا تم یہی چاہتی ہو؟''

''لیکن میں کچھ نہیں جانتی۔'' اس کے آنسوؤں سے چہرہ بھیگ گیا۔ خاور کا دل چاہا کہ اس کے تمام دکھ وہ اپنی ذات میں سمیٹ لے۔ اس کے دکھوں کی کرچیاں اس کے ساتھ ہونے والی ناانصافیاں سب اپنے دامن میں بھر لے اور وہ ممانی کی زیادتیوں سے آزاد ہو جائے لیکن یہ سب اتنا آسان نہیں تھا۔

''ندا پلیز اس طرح مت روؤ۔'' خاور نے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا تو اور بھی زیادہ بھیگی برسات کی طرح جل تھل ہو گئی۔ خاور ساکت کھڑا رہ گیا اور وہ اپنے آنسوؤں کو پیتی چلی گئی۔ اپنی چاہتوں پر کچھ دیر رو کر جو اس کے بس سے باہر ہو گئی تھیں۔ پھر وہ تمام دن خاور سے شرمندگی محسوس کرتی رہی پتہ نہیں خاور کیا سوچیں گے؟'' خاور سارا دن اداس رہے اور اس کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتے تھے کئی بار ارادہ کیا کہ ممی سے بات کریں لیکن ہر بار کچھ سوچ کر چپ ہو گئے۔ نعیم بھائی ایسے میں نہیں تھے کہ وہ کچھ ان کی مدد کرتے اور وہ اس کو دیکھتے رہے جو نظریں نیچی کیے ہوئے سیما کے کہنے پر سامان پیک کر رہی تھی۔ دادی جان نے گھر میں ایک ہنگامہ کر رکھا تھا۔ رو رو کر ان کا برا حال تھا یوسف ماں کی منت کر رہے تھے کہ وہ بھی ساتھ چلیں لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ تب ندا دادی جان سے لپٹ گئی۔

''دادی جان میں نہیں جاؤں گی۔'' زہرہ نے اسے بہت سمجھایا لیکن وہ روتی رہی۔ دادی جان بھی اس وقت بے بس ہو گئیں جب یوسف نے بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ کر پیار سے کہا۔

''بس بس چلو کوئی تم پر پابندی تھوڑی ہو گی جب دل چاہے آ جانا یہ بھی گھر اپنا ہے اور پھر اماں تو آتی رہیں گی۔'' پھپھی نے بھی کہا لیکن اس وقت سیما کی ساری محبت ندا کے لئے سمٹ آئی تھی۔ بھائی بھی بضد تھے کہ آپی ساتھ چلیں گی تب ہی اس نے زہرہ پھوپھی کو دیکھا جو اسے پیار سے دیکھ رہی تھیں اور وہ سمیرا اور ثانیہ کو پیار کرتی ہوئی سب کے ساتھ باہر آ گئی۔ بھیگی بھیگی آنکھوں سے اپنے سامنے کھڑے ہوئے خاور کو دیکھا جس نے اس سے نظریں چرا کر دوسری طرف کر لی تھیں اور وہ چلتی ہوئی ان کے قریب سے

گزری تو خاور سر جھکائے کھڑے تھے ندا نے جان بوجھ کر اپنی رفتار آہستہ کر دی تھی سب لوگ گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ اس نے آہستہ سے خاور کے پاس سے گزرتے ہوئے کہا۔

''تم اتنے بزدل تھے کہ مجھے روک نہ سکے۔'' اور خاور تڑپ کر رہ گئے اور پھر اس نے چلتے وقت مڑ کر دیکھا خاور کس قدر اداس لگ رہے تھے۔ اس نے اپنا ہاتھ نکال کر خدا حافظ کہا اور خاور ضبط کر کے مسکرا دیئے۔

سیما کی مراد آج بر آ گئی تھی کئی برسوں پرانی خواہش آج تکمیل کو پہنچ چکی تھی۔ یوسف خان کو راتوں رات ایک ایسا الہ دین کا چراغ مل گیا تھا جس نے ان کی قسمت کو پلٹ دیا تھا اور اس میں ان کی ماڈرن بیوی شامل تھی جس نے ہر وقت ان کا ساتھ دیا تھا ورنہ اگر سیما کی جگہ زبیدہ ہوتی تو وہ اسی جگہ ہوتے جہاں پچیس سال پہلے تھے۔ نئے مکان کی گہما گہمی میں سب نے دلچسپی لی۔ سیما نے بالکل نئے طرز پر کوٹھی ڈیکوریٹ کروائی۔ ہما نے اپنے آپ کو نئے ماحول میں ایڈجسٹ کرنے کے لئے نئے لوگوں سے میل جول شروع کر دیا۔ مسز سیما یوسف اپنے بناؤ سنگھار کا خیال رکھتیں تاکہ لوگ انہیں اپنے سے کم نہ سمجھیں بات بات پر ندا کو ہدایت جاری کرتیں کہ وہ ٹھیک ٹھاک رہا کرے ہما نے اپنی ساری سہیلیوں کو اکٹھا کیا ہوا تھا۔

''جی جی تمہاری آپی ہیں تو سوئٹ کبھی تم اپنے ہینڈسم کزن سے ملواؤ۔''

''ارے ملوا دوں گی آج کل وہ جاپان کی سیر کر رہے ہیں۔''

''ویری لکی آپی۔'' ہما کی دوست نے ندا کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

''اچھا اچھا زیادہ مسکہ نہ لگاؤ۔'' ہما نے ٹوکا۔ ندا نے سب کے لئے چائے بنائی تو ہما نے کہا۔

''ہماری آپی بہت خدمت گزار ہیں جناب ایسے ایسے کھانا پکاتی ہیں کہ بس۔''

''اور تم ان کے برعکس ہو تمہیں کوئی کام بھی نہیں آتا۔''

''جی نہیں ضرورت بھی کیا ہے۔ یہ تو آپی کی ہابی ہے ورنہ گھر میں باورچی اور کئی نوکر موجود ہیں۔''

''چلو یار ذرا اوپر چل کر سی سائیڈ کا نظارہ کریں۔'' ہما کی دوست زوبیہ نے دوسری سہیلی سے کہا۔ سب اٹھ کر اوپر چلی گئیں۔ ندا نے بکھرے ہوئے برتن سمیٹے اور ملازم کو آواز دی۔ خود بھی وہ اوپر چلی گئی۔ اسے ڈوبتے ہوئے سورج کا نظارہ پسند تھا۔ سن سیٹ کی تو وہ دیوانی تھی اگر اسے کوئی چیز وہاں کی پسند آئی تو وہ یہی تھی سورج سطح زمین سے لب ساحل ہوا اور پورے سمندر پر اندھیرا اچھل جائے اور پھر حد نظر اندھیرا

چھا جائے۔ ہر روز ہی ایک نیا ہنگامہ ہوتا۔ سیما اب خود ڈرائیونگ سیکھ چکی تھیں اور ان کے بالوں کا اسٹائل بھی تبدیل ہو چکا تھا۔ ناکس ایزی سے رنگے ہوئے بال اصل رنگ کے لگتے تھے۔ وہ اپنی عمر سے دس سال چھوٹی نظر آنے لگیں۔ اکثر لوگ پوچھتے تھے۔ بقول ان کے "ہما ان کی بہن لگتی ہے۔" وہ اکثر اسی لئے ندا کی پوزیشن ہمیشہ واضح کر دیتی کہ وہ یوسف خان کی پہلی بیوی سے ہے، اور ندا کو لوگ بہت ہمدردی کی نظر سے دیکھنے لگے۔

"مما آپ اس طرح سے سب کے سامنے آپی کو کہتی ہیں لوگ مائنڈ کرتے ہوں گے۔ ویسے آپی نروس ہو جاتی ہیں۔ پتہ ہے لوگ فوراً ہمدردی کرنے لگتے ہیں۔ ان سے سوال کرتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے تم مجھ سے زیادہ تعلیم یافتہ مت بنو میں بہتر جانتی ہوں میں نے ہمیشہ آنے والے وقت پر نظر رکھی ہے۔ ورنہ وہیں پڑی رہتی۔" جواب تو ماں کا معقول تھا اس ہائی سوسائٹی تک لانے کی ذمہ دار مما تھیں اس کا کئی بار یوسف خان نے بھی اعتراف کیا۔ ندا دیر تک پاپا کے انتظار میں جاگتی رہتی لیکن اب کچھ زیادہ ہی مصروفیات بڑھ گئی تھیں۔ جس دن گھر میں ہوتے تو لوگوں کا ملنا جلنا جاری رہتا اور پھر رمی کھیلتے جس کی وجہ سے وہ صورت تک نہ دیکھ سکتی تھی۔ سیما زیادہ تر ساتھ ہی ہوتیں۔ پاپا بھی اب اسے پہلے جیسے نہ لگتے بات بات پر غیروں کے تذکرے اپنے لوگوں کے ذکر سے الرجک لگتے تھے پہلے تو ملنے ہر دوسرے دن جاتے اب ہفتہ گزر جاتا تو ندا یاد دلاتی کہ "پاپا دادی جان کا فون آیا تھا۔ پھوپھی جان پوچھ رہی تھیں۔"

"گھر میں آئے ابھی دو منٹ نہیں ہوئے کہ ساری تفصیلات سنا ڈالیں۔ چلو ساتھ یہ بھی بتا دو کہ انہوں نے کھانا کیا کھایا تھا اور زیب تن کیا کر رکھا تھا؟" سیما غصے میں کہتیں ندا خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی جاتی اور یوسف بغیر کچھ کہے ہوئے تھک کر بیٹھ جاتے۔ یہ گھر ان کو بہت راس آیا تھا۔ سیما ہمیشہ کہتی اللہ نے برکت دی ہے، یوسف خان کے مزاج سے واقف تھیں انہیں ہمیشہ دوسروں کی طرف متوجہ کر دیتیں۔

"مسز حسین کیا شاندار طریقے سے رہتی ہیں۔"

"ارے تو ہم کون سے کم ہیں؟"

"ہاں بھئی جس حال میں ہیں خوش ہیں دوسروں کی نقل کیا؟" اور اس بات پر یوسف خان مسکرا دیتے۔

"مسز حسین نے اپنے گھر میں جاپانی طرز کا فرنیچر سیٹ کروایا ہے۔ میں بھی سوچ رہی ہوں کہ اگلے ماہ کچھ تھوڑی سی تبدیلی کر دوں۔ تبدیلی ہمیشہ خوشگوار ہوتی ہے۔"

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے لیکن۔"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔"

"اچھا بابا کروالو میں چیک لکھ دوں۔"

"پاپا مجھے کل مسز حسین کے گھر پارٹی میں جانا ہے۔ میں اپنا ڈریس بوتیک سے تیار کراؤں گی۔ میرے جیسا لباس اور کوئی پہن ہی نہیں سکتا۔" ہما نے لاڈ سے باپ کے گلے میں بانہیں ڈال دیں تو وہ کچی مٹی کی طرح بیٹھ گئے۔ سیما نے صبح سے ہی تیاری شروع کر دی تھی۔ ہما بھی کسی بیوٹی پارلر میں اپنے نیچرل کور کو مصنوعی خول میں تبدیل کروانے چلی گئی۔ ندا سب سے بے نیاز اپنے لگائے ہوئے پودوں کی دیکھ بھال میں لگی ہوئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر پہلے مسز حسین نے خاص طور پر رنگ کر کے پوچھا کہ کون کون آ رہا ہے؟

"میرا خیال ہے کہ ندا کا موڈ کچھ خراب ہے اچھا میں کوشش کرتی ہوں۔" ہما نے کہا۔

"ندا مسز حسین نے تمہیں خاص طور سے کہا ہے چلی چلو۔"

"ہما مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا۔"

"بس یہی تو ہے پوچھو تو انکار نہ پوچھو تو سوتیلی۔"

"ارے نہیں میں تو بھول کر بھی یہ نہیں سوچتی۔"

"تمہارے سوچنے سے کیا ہوتا ہے؟ آخر اور لوگ بھی تو ہیں۔ اب دیکھو نا مسز حسین کو اگر تم نہ گئیں تو چاہے کچھ کہیں نہیں سوچیں گی تو ضرور نا۔" ندا نے سیما کے خوبصورت بالوں کو دیکھا جو پیارے لگ رہے تھے۔ سیما نے بھی تو بار بار انہیں برش کر کے سیٹ کیا تھا۔

"اب دیکھ کیا رہی ہو۔ جاؤ اور تیار ہو جاؤ۔" اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ڈریسنگ روم میں چلی گئی جہاں سارا میک اپ کا سامان ہما پھیلا کر چلی گئی تھی۔ بیوٹی پارلر لگ رہا تھا اس کا کمرہ۔

پارٹی میں کھوئی کھوئی ندا سب ہی کی نظر کا مرکز بنی رہی۔ ہما نے ندا کی طرف دیکھا کہ یہ ضرور کوئی بات تب ہی سب لوگ آپی کی طرف متوجہ ہیں اور پھر قریب آتے ہوئے اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"آپی آپ تو بالکل سادہ لباس میں ہیں لوگ کیا سوچیں گے؟ مائی گاڈ مجھے بالکل دھیان نہ رہا ورنہ میں

آپ کے لیے بھی ایک ڈریس خرید لاتی۔"

"ارے نہیں پگلی یہ بہت اچھے کپڑے ہیں۔ میں نے ابھی صرف دو بار پہنے ہیں۔"

"پلیز آپی آپ اپنی ضرورت پاپا سے کہا کریں۔ مما کی بات مائنڈ مت کریں۔ وہ اولڈ ہیں۔" ہما کو ایسا لگا جیسے ندا سنڈریلا بن کر اس محفل میں آ گئی ہے مما اور خود اس سے بھی چھپ کر۔ اسے حقیقت میں آج دکھ ہو رہا تھا اور دوسری طرف اس نے اپنی توہین محسوس کی کہ لوگ کیا سوچیں گے کہ دونوں میں کتنا فرق ہے لیکن ندا سب سے بے نیاز باتوں میں مصروف تھی۔

"ان سے ملئے یہ ہیں ہمارے ڈیڈی کے پارٹنر یوسف خان کی صاحبزادی مس ندا یوسف اور یہ ہمارے کزن وقار محسن۔" مسز یوسف خود ہی جلدی سے آگے آ گئی تھیں اور انہوں نے بات کا موضوع بدل دیا۔

ہما نے غور سے وقار کو دیکھا جو خاصا اسمارٹ لگ رہا تھا۔ ندا نے بھی اس چیز کو محسوس کیا کہ ہما وقار میں زیادہ دلچسپی لے رہی ہے اور احسن ہر بار بات کو ندا کی طرف لے آتا ہے۔

"آپ بہت سادہ لوح ہیں۔"

"خدا نہ کرے۔"

"میرا مطلب ہے آپ بہت زیادہ۔" احسن کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"سادگی پسند۔"

"جی ہاں ذرا میری اردو کمزور ہے۔"

"تو کسی استاد کا سہارا لیجئے۔ چند دنوں ہی میں ٹھیک ہو جائے گی۔"

"اوکے۔" احسن نے مسکرا کر کہا تو ندا جل ہی گئی اسے یہ احسن ایک آنکھ نہ بھایا تھا جو بات بات پر اردو اور انگلش کی کھچڑی پکاتا پھر بھی پاپا آگے پیچھے پھرتے مما ہر کام میں آگے آگے رہتی تھیں۔ مسز حسین اپنے اکلوتے فرزند کو دیکھ کر پھولے نہ سماتیں اور مما ہر وقت پاپا سے اس کی تعریف کرتی رہتیں۔ ہما بھی اس سے کچھ چڑی رہتی لیکن پھر بھی وہ اس سے بات کر لیتی تھی لیکن ندا تو اس کو سرے سے ہی منہ نہ لگاتی اور یہی بات احسن کو اندر ہی اندر کھا رہی تھی۔ اس کی عادت تھی مشکل چیز کو حاصل کرتا اور حاصل کر کے پھینک دیتا۔ اسی نے اپنا ایک بہت پرانا قصہ تفصیل سے سنایا تھا کہ جب وہ میٹرک میں تھا تو اسے ڈیڈی کی گن پسند آ گئی اور جب وہ اسے حاصل نہ کر سکا تو کئی دن گھر سے غائب رہا۔ ڈیڈی نے آخر مجبور ہو کر اسے

دے دی تو اس نے ایک دو بار استعمال کے بعد سمندر میں پھینک دی تھی اور جب ڈیڈی نے پوچھا کہ ایسا اس نے کیوں کیا تو اس نے کہا۔

"ڈیڈی انتظار نے اس کے چارم کو کھو دیا تھا۔" اس پر اس کے ڈیڈی اور مما کو بہت پیار آیا اور اجازت دی جس طرف چاہو کھلے منہ گن لے کر نکل جاؤ اور مما نے تو اس کے حوالے کار کی چابی کر دی تھی۔ اب بہت آسانی سے حاصل کی ہوئی اس چیز کو اس نے سنبھال کر رکھا ہے۔ سارے لوگ اس کی اس عجیب بات پر حیران رہ گئے۔

"مجھے تو کوئی مینٹل کیس لگتا ہے۔"

"کیا تم میری ڈاکٹر بنو گی؟" اور ندا نے جھک کر کہا۔

"مائی فٹ۔" احسن اس بات پر بہت ہنسا۔ ہما نے گھر آ کر غصہ اتارنے کا بہانہ بنایا۔ اس پر ندا کے نئے لباس کے نہ ہونے کا رنج بھی تھا۔ اس نے مما سے شکایت کی کہ وہ اس طرح سے ندا کو کیوں احساس دلاتی ہیں کہ سب پیچھے میں ہوں۔

"مما آخر آپ، یہ نہیں سمجھتیں کہ لوگ آپ ہی کو برا کہیں گے۔"

"مجھے پرواہ نہیں۔۔ تم تو ناسمجھ ہو اور جب سمجھ آنے لگی تو پھر آگے پیچھے پھرو گی۔ بالکل اپنے باپ کی طرح۔"

"لیس مما!" ہما خاموش ہو گئی۔ ندا نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"چلو اب تم سو جاؤ۔ یہ باتیں تمہارے پوچھنے کی نہیں۔"

"لیکن آپی اتنی خاموشی سے اپنے حق سے کیوں دستبردار ہوتی چلی جا رہی ہیں؟ پاپا آپ کے بھی تو ہیں۔ آسائشیں آپ کو بھی تو حاصل ہونی چاہئیں۔"

"ارے پگلی مجھے تیرا پیار جو حاصل ہے۔ یہ کتنی خوش نصیبی ہے کہ تم مجھے اپنی بہن سمجھتی ہو۔ اگر تمہارا سلوک مما جیسا ہوتا تو پھر کچھ سوچتی۔ تمہاری باتیں سارے دکھ دھو دیتی ہیں۔ مما کا کیا ہے وہ تو کبھی کبھی تمہیں بھی ڈانٹتی ہیں۔ عارف کو ہر وقت جھڑکتی ہیں۔ صرف آصف کو کچھ نہیں کہتیں۔ چلو اچھا تم سو جاؤ۔"

"نہیں آپی نیند نہیں آ رہی۔ آپ کو وقار کیسا لگا؟"

"خیریت؟"

"بس یونہی مما تھوڑی انٹرسٹڈ ہیں۔"

"ہے تو اسمارٹ لیکن تھوڑا مغرور لگتا ہے۔"

"سویٹ آپا یہی تو ایک کشش ہے اس میں۔"

"سچ!" ہما نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ندا کو اس بے وقوف لڑکی پہ بے اختیار پیار آ گیا۔

"ویسے آپی اپنے خاور بھائی کا تو جواب نہیں کس قدر اسمارٹ اور ہینڈسم لگتے ہیں۔ کسی دن پارٹی میں انہیں بھی انوائٹ کروں گی۔"

"نہیں ایسا مت کرنا مما خاور کو بالکل پسند نہیں کرتیں۔"

"نہ کریں میرے بھی تو وہ کزن ہیں۔ میں تو بلاؤں گی اور دیکھئے گا آپ کی وجہ سے کیسے کچے دھاگے میں بندھے چلے آتے ہیں۔"

"تم بالکل پگلی ہو جو دل میں سما جائے وہی کرتی ہو۔"

"آف کورس خود مختار ہوں۔ میں اپنے فیصلے خود ہی کرتی ہوں۔ آپ کی طرح نہیں کہ بس پاپا اور مما کے فیصلوں کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ فرض کرو آپی کہ پاپا خاور بھائی سے آپ کی شادی کا فیصلہ بدل دیں تو کیا کریں گی؟"

"خدا نہ کرے ہما ایسی باتیں مت کرو میرا ذہن ویسے ہی نئے ماحول میں الجھا رہتا ہے اور تم وسوسے ڈال رہی ہو۔"

"جی ہاں میں شیطان ہوں ناں۔" وہ مصنوعی غصے سے بولی۔

"ویسے آپ ذرا سنبھل کر رہیے گا کہ احسن صاحب بہت چکر لگا رہے ہیں۔"

"میں اچھی طرح جانتی ہوں۔" اس نے سوچتے ہوئے کہا اس کے خیالات کو ہما نے زبان دے دی تھی کتنی دیر تک وہ یونہی آنسو بہاتی رہی پھر نیند آ گئی۔ پوری حویلی میں آج پھر بہار آ گئی تھی۔ ہر طرف جگنوں کا سماں تھا۔ تانیہ کی مایوں کی رسم تھی۔ وہ پیلے پیلے کپڑوں میں سہیلیوں کے درمیان بیٹھی تھی۔ ندا اور ہما دو دن سے آئی ہوئی تھیں۔ سمیرا ہما سہیلیوں کے ساتھ مل کر جوڑے ٹانک رہی تھیں۔ زہرہ پھوپھی نے کمرے میں ندا کپڑوں پر استری کر رہی تھی۔ پھر زہرہ نے اسے دوسرے کام کے لئے بلا لیا۔ تب ہی خاور جیولری کے بکس لئے اندر داخل ہوا۔

"ممی یہ زیور تیار ہو کر آ گئے ہیں آپ دیکھ لیں۔" زہرہ خاور کے ہاتھ سے ڈبے لے کر دیکھنے لگیں۔

"ندا انہیں لاکر میں بند کر دو۔" زہرہ ڈبے ندا کی طرف بڑھاتی ہوئی بولیں۔

"پھوپھی جان یہ تو کھل نہیں رہا۔" ندا نے لاکر کھولنے کی پوری جدوجہد کی۔

"اچھا ٹھہرو میں آتی ہوں۔" زہرہ کی نظر اس لاکر میں رکھی ہوئی چوڑیوں پر پڑی تو ان کے ہاتھ بے ساختگی سے اٹھ گئے اور انہوں نے چوڑیاں اٹھا لیں۔

"ارے ممی یہ تو آپ کی چوڑیاں ہیں جو پاپا فرانس سے لائے تھے۔"

"ہاں!"

"تو انہیں پہنتی کیوں نہیں ہیں؟"

"ارے یہ تو تیری دلہن کے لئے رکھی ہیں میں نے تو ابھی ایک بار بھی اپنی کلائیوں میں نہیں ڈالا۔" ندا جو پھوپھی کے ہاتھ سے لے کر دیکھ رہی تھی کچھ جھینپ سی گئی۔

"تو مما دیر کس بات کی؟" اس نے تیزی سے جاتی ہوئی ندا کا دوپٹہ پکڑ لیا۔

"پھوپھی جان۔" وہ گھبرا کر زہرہ کے پیچھے چھپ گئی۔

"خاور تم ہر وقت اسے تنگ کرتے ہو۔ کبھی تو سنجیدہ رہا کرو۔" خاور کے ہاتھ میں سونے کی جڑاؤ چوڑیاں تھیں۔

"ممی پلیز۔" اس نے پھر ندا کا ہاتھ پکڑنا چاہا لیکن وہ ہاتھ چھڑا کر بھاگ گئی۔ پھر ہنگامے بڑھے گیت گائے گئے۔ کبھی یہی پارٹی نیچے توصیف ماموں کے یہاں موجود ہوتی تو کبھی اوپر زہرہ کے یہاں دلہن والوں کے گیت گائے جاتے۔ ایک ہنگامہ تھا رنگوں کی دنیا سمٹ آئی تھی۔ ساری رات گیتوں میں گزر جاتی اور دن میں سب منہ لپیٹے پڑے رہتے۔ دادی جان سمجھا سمجھا کر تھک گئی تھیں لیکن مجال ہے جو ایک کے بھی کان میں آواز جائے۔ پھر سب کو ہنساتے ہنساتے تانی سب کو رلا کر چلنے کی تیاری کرنے لگی۔ حویلی رنگین روشنیوں میں ڈوبی ہوئی تھی اونچے اونچے درخت روشنیوں کا جھومر پہنے ڈول رہے تھے۔ ہر شخص خوب سے خوب دکھائی دے رہا تھا۔ سرخ کمخواب کا شرارہ پہنی ہوئی تانی دلہن بنی آہستہ آہستہ زینہ طے کر رہی تھی ندا نے اسے اپنی بانہوں کا سہارا دیا ہوا تھا۔ سارے کزن اکٹھے تھے پھر کسی بزرگ خاتون نے تانی کو سہارا دے کر گاڑی میں بٹھا دیا۔ آخری زینے پہ خاور آتے ہوئے رک گئے۔ ندا اکیلی کھڑی تھی

خاور نے مسکرا کر بنی سنوری ندا پر ایک نظر ڈالی اس سے پہلے خاور نے اس روپ میں ندا کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ ہمیشہ وہ بہت سادہ لباس میں رہتی۔

"ندا" خاور کی آواز تنہائی کو چیرتی ہوئی سماعت سے ٹکرائی۔ ندا نے نظریں نیچی رکھیں۔

"میں کچھ عرصہ کے لئے جاپان بزنس کے لئے جا رہا ہوں۔"

"جی۔"

"میرے جانے کے بعد کچھ دنوں کے لئے ممی کے پاس آ جاؤ تو بہتر ہوگا۔ میری غیر موجودگی میں ماموں جان کو بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا کیونکہ ممی بالکل تنہا ہوں گی۔ تانی اور نعیم بھائی ایک ہفتے کے اندر اندر کوئٹہ چلے جائیں گے اور پھر سومی کے بھی امتحانات ہونے والے ہیں۔" انہوں نے اپنی بات مکمل کر کے اس کی طرف دیکھا۔

"کیوں، کیا ناراض ہو جو میری کسی بات کا تم نے جواب نہیں دیا؟" ندا نے مسکرا کر سر کو ہلایا تو خاور بھی مسکرا دیئے۔

"ندا ڈیئر کچھ تو بولو میں کل چلا جاؤں گا۔"

"خاور جلدی آنا۔"

"ہاں میں کوشش کروں گا۔"

"خاور پتہ نہیں کیوں مجھے مما سے اب خوف آتا ہے کہیں وہ مجھے......"

"ارے نہیں مائی سویٹ ہارٹ تم صرف میری ہو تمہیں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ خاور تمہارا ہے اور...... ڈیئر ہمیشہ تمہارا رہے گا۔ بس تھوڑے ہی دنوں کی بات ہے۔ ممی کا خیال رکھنا اور ہاں مجھے بھول مت جانا۔" خاور خدا جانے اسے کیا کچھ کہہ رہا تھا۔

"ارے ندا آپی آپ کو پھوپھی جان تلاش کر رہی ہیں۔ اچھا تو آپ بھی ہیں جناب۔" سومی نے بھیا کو دیکھ کر کہا۔ خاور نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ مارا۔

"اب آنٹی کی یہ کالا ہر ایک کو بتاتی پھرے گی۔"

"کیا مجھے بھی تو بتاؤ۔" ہما نے سومی کو ہنستے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"بتاؤں بھیا۔" تانی کی رخصتی کا وقت ہو گیا سب لوگ اس طرف جا رہے تھے اور پھر تانیہ مسز نعیم بن کر

چلی گئی۔ پھر ابھی ڈون وقار نے ہما کو پرپوز کیا تو وہ خوشی سے پاگل ہو گئی۔ مما کو بھی اعتراض نہیں تھا۔ بس صرف مسئلہ تھا یوسف خان کو منانے کا وہ اس رشتے پر راضی نہیں تھے پھر پتہ نہیں کہ کیا ہوا مما گھبرائی ہوئی ہر ایک کو ٹیلی فون کرتی رہتیں اور یوسف خان حسین صاحب کے آگے پیچھے پھرتے۔ کتنے دنوں کے بعد یہ بھید کھلا کہ یوسف خان مقروض تھے اور حسین صاحب نے ان کی مدد کی تب سے پتہ نہیں کیا ہوا کہ ندا حسن کو کچھ تھوڑی سی لفٹ دینے لگی۔

"آپی یہ صاحب کچھ زیادہ فری ہو رہے ہیں۔"

"ارے نہیں گھر آئے مہمان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہئے۔"

"وہ ٹھیک ہے آپی کہیں آپ" اس نے وزدیدہ نظروں سے ندا کو دیکھا جس میں کچھ شرارت بھی شامل تھی۔ ہما کا مفہوم جان کر اس نے کہا۔

"خاموش ایسے نہیں بولتے اور پھر تم جانتی ہو کہ میں۔" ندا نے جان کر جملہ ادھورا رہنے دیا۔

"آپی میں تو مذاق کر رہی تھی۔ اللہ کرے میری خوشیاں بھی آپ کو مل جائیں۔" ہما نے خلوص سے دعا دی۔ مما کے انتخاب پر ندا بھی خوش تھی اور ہما تو اتراتی پھرتی پہلے اپنے کزن خاور کے قصے اب آج کل ایک ہی ٹاپک تھا وقار۔ سیما کافی دنوں سے ندا سے کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن کچھ نہ کہہ سکی۔ یوسف خان بھی آتی جاتی ندا کو غور سے دیکھتے لیکن کہہ نہ پاتے۔ ندا کے دل نے انجانے دکھوں کو پناہ دے دی اور وہ اندیشوں میں گھری کبھی کاموں کا اور کبھی کتابوں کا سہارا لے لیتی۔ خاور کو گئے چار ماہ گزر گئے تھے وہ ایک ایک دن گن رہی تھی کبھی کبھی وہ ہما کے ساتھ مل کر حویلی بھی چلی جاتی لیکن گھر کے لوگوں کی وہ ضرورت بن گئی تھی اس لئے وہ رہ نہ سکتی تھی خاور سے کیا ہوا وعدہ بھی نہ نبھا سکی بس تھوڑی سی دیر کے لئے جاتی اور پھر واپس ڈرائیور اور گاڑی اس کے سائے کے ساتھ ہی رہتے وقت مقررہ پر ہارن کی آواز پر چلی جاتی دادی جان روکتی رہ جاتیں لیکن وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ ڈھیر سارے دن گزر گئے خاور نے کئی ہفتوں سے خط نہیں لکھا تھا وہ روز ڈاک کا انتظار کرتی، ہما ہر روز اسے چھیڑتی۔

"اے آپی جاپان جا کر بھائی جان بھول گئے۔"

"ہو ہی نہیں سکتا۔"

"اوہو بڑا یقین ہے۔"

"بالکل۔" وہ آنکھیں بند کر کے ایک جذب کے عالم میں بولتی مما کئی دن سے اس سے نظریں چرائے پھر رہی تھیں، پاپا بھی بہت سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔ ندا کے دل میں انجانا خوف دستک دے رہا تھا اور خاور کے تصور میں کھوئی ہر آہٹ پر اس کا انتظار کرتی ہوئی ندا اس کو یاد کرتی رہتی جو کہہ گیا تھا کہ وہ ہمیشہ اس کا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ ہما کے جہیز کی تیاری شروع ہو چکی تھی۔

"آپی آپ بھی کچھ مشورہ دیں۔ سارے کپڑے سلواؤں یا کچھ یونہی رکھ دوں؟" ہما ناحق ہی بوکھلائی ہوئی تھی۔

"کچھ رکھ لو فیشن بدلتا رہتا ہے۔" ندا مشورہ دیتی اور ہما آنکھیں بند کر کے وہی کچھ کرتی جو ندا کہتی۔ ہما کی شادی میں صرف ایک ہفتہ رہ گیا تھا جو چیز ہما کے لئے آتی وہی اس کے لئے بھی آتی جسے دیکھ دیکھ کر وہ حیران ہوتی اور کبھی شرما جاتی۔ 'مما کو میرا خیال ہے۔ پاپا بھی میری پسند معلوم کرتے ہیں آخر ایسا کیوں ہے؟' وہ سوچتی۔

"پتہ ہے آپی میرے جانے کے بعد آپ کی شادی بھی فوراً ہوگی۔" ہما کہتی تو وہ شرما کے رہ جاتی۔

"جب ہی تو مما اور پاپا ایک ساتھ شاپنگ کروا رہے ہیں تاکہ آئندہ کی زحمت سے بچ جائیں۔" ہما اس کو مزید اطلاع دیتی ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہتی۔

"اللہ آپی آج آپ یہ ڈریس پہن لیں۔"

"کیوں وقار کے ممی اور ڈیڈی آ رہے ہیں؟"

"ہوں.....!"

"ارے یہ۔"

"ہاں دیکھیں تو سہی۔"

"نہیں میں کالے کپڑے آج نہیں پہنوں گی۔"

"کیوں بھلا؟"

"بدشگونی ہوتی ہے۔"

"سب بکواس اور جو میں پہنتی ہوں وہ۔"

"پتہ نہیں۔"

"جی محترمہ اور میرا خیال ہے جب میں کالے کپڑے پہنتی ہوں تو زیادہ اچھا دن گزارتی ہوں۔"

"چلو اچھا پھر کسی دن ٹرائی کیجئے گا۔ یہ سوٹ آپ پر بہت بھلا لگے گا۔" ہما نے پھر کہا۔

"آپی اس بار عید پر آپ کالے اور فیروزی کے کنٹراسٹ کے ساتھ ڈریس بنوایئے گا۔"

"آخر تم سیاہ رنگ کے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑ گئی ہو؟" ندا زچ ہو کر بولی تو ہما نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔ پاپا آج کل بہت مہربان ہو گئے تھے تھوڑی سی مما نے بھی سختی کم کر دی تھی۔ ندا کے بجائے آج کل سارا غصہ ہما پر اترتا جو سارا دن ندا کو لئے لئے پھرتی تھی۔ تھوڑی سی شاپنگ باقی تھی اس لئے دونوں کو پھر جانا تھا۔ ندا جب تیار ہو کر باہر آئی تو ہما اس کو دیکھتی رہ گئی۔

"ارے آپی تھوڑا سا رنگ مجھے دے دو۔ ایمان سے بہت جچ رہی ہو۔ اگر خاور بھائی ہوتے تو آج گر جاتے۔" ندا کے کھلتے ہوئے رنگ پر سیاہ سوٹ واقعی بہت بھلا لگ رہا تھا۔

"اچھا اچھا ذرا جلدی چلو۔" گو کہ اس نے خوش دلی سے کہا تھا لیکن اندر ہی اندر ندا کا دل کانپ رہا تھا کہ کہیں کچھ ہو نہ جائے۔ واپسی پہ ہما نے سامان سنبھال کر رکھا تھا۔

"بی بی جی آپ کا ٹیلی فون تھا۔"

"کس کا؟"

"سوی بی بی کا۔" ندا نے کچھ پریشانی سے نمبر ڈائل کئے۔

"خدا کرے سب خیریت ہو۔" اس کے ہاتھ واضح طور پر کانپ رہے تھے۔

"سوی میں بول رہی ہوں۔"

"ارے زبردست خوشخبری ہے بھیا عید سے ایک روز پہلے آ رہے ہیں۔" سوی نے کہا۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ تب ہی اس کے ہاتھ سے ہما نے ریسیور لے لیا۔

"دیکھا آپی آج آپ نے سیاہ سوٹ پہنا تھا اس لئے لکی ہو۔ اب میں پاپا سے کہوں گی کہ بس ایک ساتھ۔"

"اللہ ہما پاگل تو نہیں ہو گئی۔" لیکن وہ ہما ہی کیا جو رعب میں آ جاتی۔ اس نے یہ خبر سب سے پہلے پاپا کو سنا ڈالی۔ یوسف خان یہ خبر سنتے ہی کچھ پریشان سے ہو گئے۔ ہما ان کی پریشانی محسوس کئے بغیر نہ رہ سکی۔ اور ندا سے یہ خوشی سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔ دادی جان کی تو ہم پرستی ہوا ہو چکی تھی اور وہ بہت ہلکی ہو کر باتوں کے ساتھ ساتھ اترا رہی تھی۔ ہما کا مرجھایا ہوا چہرہ دیکھ کر وہ مسکرائی۔

"ارے پگلی تو نے شام ؛ چلتے ہی خاور کا نام مما کے سامنے لے لیا اگر لینا ہی تھا تو کم از کم صبح لیتی تا کہ ہم دونوں گھر سے غائب ہوتے اور مما اپنا غصہ نوکروں پر اتار لیتیں۔" مگر ہما کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

"تم تو سیریس لگتی ہو۔" ندا نے اس کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

"آپ یہ کپڑے اتار دیں۔"

"کیوں؟" ندا حیران ہوئی۔

"بس کہیں آپ کو میری نظر نہ لگ جائے۔"

"ہرگز نہیں اور پھر تم خود تو کہتی ہو کہ یہ میرا لکی کلر ہے تو پھر۔" اس نے سیاہ دوپٹے پر ہونٹ رکھ دیئے۔

"اور ہاں جان دیکھو تم مما کو سیریس مت لیا کرو وہ دل کی بری نہیں ہیں۔ بس کبھی کبھی انسان محبتوں اور نفرتوں کے درمیان تمیز کرنا بھول جاتا ہے۔" ندا نے ہما کو سمجھایا۔

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔"

"ہما زندگی تو سفید کاغذ کی مانند ہے جو چاہے تحریر کر لو میں نے دل میں مما کو تمہارے جتنا ہی چاہا ہے۔ چاہتیں لفظوں کی ہیرا پھیری سے ظاہر نہیں کی جا سکتیں۔"

"آپی اتنی چاہت میرے لئے بھی ہے آپ کے دل میں؟"

"تجھے تو میں خود سے زیادہ چاہتی ہوں مگر تمہیں آج کیا ہو گیا ہے ہما۔ اتنی آف تو تم کبھی نہیں نظر آئیں۔"

"بس مما کی زیادتیاں کچھ زیادہ ہیں۔ آپی اگر میں کہوں کہ اپنی خوشیاں دے دو تم۔"

"میں آنکھیں بند کر کے تمہارے ہاتھ میں دے دوں گی۔" ہما نے کچھ کہا نہیں چپ چاپ کمرے سے نکل گئی۔ ہما نے مما کے بیڈ روم میں رکھے ہوئے کارڈ کو کانپتے ہاتھوں سے اٹھایا تو وہ چیخ پڑی۔

"نہیں نہیں مما نہیں یہ ظلم ہے پاپا! اتنے چیپ اور گھٹیا انسان کو میری آپی مت دیجئے۔ اگر آپ کو ایسا ہی کرنا ہے تو میں تیار ہوں پلیز پاپا یہ ارادہ بدل دیں۔" ہما زار و قطار رو رہی تھی۔

"پاپا پلیز قرض چکانا ہے تو مجھے بیچ دیں پاپا میں خوشی سے تیار ہوں۔ میں وقار سے نہیں احسن سے شادی کر لوں گی لیکن آپی کو خاور بھائی سے مت چھینئے۔ پاپا اچھے پاپا! وہ مر جائیں گی۔ مما یہ زیادتی مجھ پر کریں میں نے ساری عمر پیار ہی پیار لیا ہے ندا آپی نے تو خود بھی کبھی کچھ نہیں مانگا اب یہ صلہ مت دیں۔" وہ

آنسوؤں سے روتی جا رہی تھی۔ ندا ساکت کھڑی اس کے سسکتے وجود کو دیکھے چلی جا رہی تھی۔ پاپا میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ندا سے آنکھ ملاتے۔ مما بھی خاموش تھیں۔ عارف اور آصف بھی اس کے رونے کی آواز سن کر کمرے میں آ گئے تھے لیکن ہما تھی کہ روئے جا رہی تھی۔

"فیصلہ ایک ہی دفعہ کیا جاتا ہے۔ تم جاؤ جا کر آرام کرو۔ فضول وقت نہ میرے پاس ہے اور نہ تمہارے پاپا کے پاس۔" مما کے کورے جواب پر وہ بے بسی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ ندا تو بس ہما کو ہی دیکھے جا رہی تھی۔ جس کی چاہت اس کے دل میں اتر رہی تھی۔ دھیمی دھیمی پھوار اس کے سارے وجود کو بھگو رہی تھی۔ ہما ابھی تک تکیے میں اپنا سر چھپائے روئے جا رہی تھی۔

"پگلی جو چیز ہمارے بس میں نہیں ہوتی وہ نوشتہ تقدیر بن جاتی ہے اور تو چلی نوشتہ تقدیر سے لڑنے۔ محبتوں کو تو سمیٹ میرے حصہ کی کرچیاں میں سمیٹ لوں گی یہ میرا نصیب ہے۔ اور پھر احسن اتنا برا بھی تو نہیں تم اب وقار کو بیچ میں مت لانا۔" ندا اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اسے پیار سے سمجھا رہی تھی۔

"نہیں آپی انکار کر دیں یہ ظلم ہے میں آپ کی جگہ ہوتی تو گھر چھوڑ دیتی۔ تم بھی دادی جان کے پاس فوراً چلی جاؤ خدا کے لئے آپی یہ ظلم خود پہ مت کرو۔" ہما نے اپنے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے کہا۔

"آپی پلیز کسی صورت سے پاپا کو روکو۔ ایک بار تم احتجاج تو کر کے دیکھو۔" لیکن وہ بالکل ساکت ہو کر رہ گئی تھی۔ سارے جذبات سرد ہو گئے تھے۔ وہ پاپا کے سامنے کئی بار ہمت کر کے گئی ہر بار بات کرنے سے پہلے ہی اس کے آنسو چھلک جاتے اور وہ انہیں چھپا کر بھاگ آتی۔ ٹیبل روز کی بھینی بھینی خوشبو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی اس کا وجود آہستہ آہستہ اس اداس خوشبو میں ڈوبے جا رہا تھا۔ ہما روتے روتے سو چکی تھی لیکن ندا کی آنکھوں میں کانٹے سے بھر گئے تھے۔ بس ایسا لگتا تھا کہ وہ یونہی تمام عمر بیٹھی رہ جائے گی۔ سیما خود جاگ رہی تھیں آج خدا جانے کیوں ان کا دل معصوم ندا کی خاموش آہوں سے زخمی ہوا جا رہا تھا۔ یہ احساس گا ہے گا ہے انہیں مارے دے رہا تھا کہ انجانے میں وہ ندا کے ساتھ بہت ظلم کئے دے رہی ہیں وہ اٹھ کر ندا کے کمرے میں چلی آئیں۔ ندا ان کو اپنے قریب دیکھ کر سہم گئی ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اپنی تمام اذیتوں کو بھول کر ندا کو یوں لگا جیسے مما تو ان سے زیادہ دکھی ہیں۔ ندا بے اختیار ان کی طرف بڑھی اور گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ پھر مما نے سہولت سے اسے اپنی مجبوری سمجھائی کہ قرض سے بچنے کی بس یہی ایک صورت ہے پھر احسن نے تم کو پسند کر لیا ہے میں مجبور ہو گئی تھی اور

تمہارے پاپا بھی، مگر وہ مستقل چپ تھی۔

خاور آج رات کی فلائٹ سے کراچی آرہا تھا۔ کل بقر عید تھی لیکن زہرہ پھوپھی ندا کی شادی کا کارڈ لئے پریشان کھڑی تھیں۔ دادی جان سارا الزام سیما کو دے رہی تھیں۔ سومی الگ روئے چلی جارہی تھی۔

"می بھیا کو کتنا دکھ ہوگا؟" اس کو اب بھی اپنے بھیا کی فکر زیادہ تھی۔ توصیف ماموں بار بار یوسف کو رنگ کر رہے تھے کہ سیما نے بالآخر ان کو آخری جواب دے ڈالا۔

"یہ میرا اپنا ذاتی معاملہ ہے اس میں آپ دخل نہ دیں۔"

"لیکن میں یوسف سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"یوسف اس وقت کسی سے نہیں مل سکتے کہہ جو دیا۔" سیما نے ریسیور رکھ دیا۔

توصیف ماموں سخت برہم تھے ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

"اسے یہ جرأت ہوئی کیسے؟" وہ بار بار کہے جارہے تھے۔

"وہ صرف نام کا باپ تھا پرورش تو داماں نے کی میں نے کی اور وہ آگیا اس کی قسمت کا فیصلہ کرنے والا دیکھ لوں گا۔" یہ الفاظ ماموں اور زہرہ کی ڈھارس بندھا رہے تھے۔ نعیم بھائی بھی کوئٹہ سے آئے ہوئے تھے۔ اس خبر پہ سب ہی بوکھلا گئے اس نے سنجیدگی سے باپ سے بات کی۔

"ابا جان آپ کسی صورت چچا جان سے ملئے۔" لیکن سب فضول یوسف نے اتنی بے رخی سے بات کی کہ توصیف خان گھر کے باہر ہی سے واپس آگئے۔ نعیم بھائی نے ندا سے ملنے کی کوششیں کیں وہ بھی بیکار۔ جب خاور کو یہ خبر ملی تو ان کی تو جیسے دنیا ہی اجڑ گئی۔ زہرہ سے خاور کی یہ حالت دیکھی نہیں جارہی تھی۔ وہ تمام رات جاگتا رہا۔ ہر طرف سے ندا کی آواز اس کا پیچھا کر رہی تھی۔

"تم اتنے بزدل تھے کہ مجھے روک نہ سکے۔" "شاید میں ہی اس قابل نہ تھا یا پھر تم میری قسمت میں نہ تھیں۔" وہ آپ ہی آپ بڑبڑائے۔ نعیم بھائی تمام وقت خاور کے ساتھ رہے گھر میں ایک اداسی سی چھا گئی تھی۔ دادی جان جائے نماز بچھائے مسلسل نفل ادا کر رہی تھیں۔ خاور نے ندا کے لئے لائے ہوئے عید گفٹ کو کھول کر دیکھا۔

"نعیم بھائی یہ آپ میری طرف سے کسی صورت ندا کو پہنچا دیں۔ یہ میں اس کے لئے لایا تھا۔" خاور نے جگمگاتی ہوئی رنگ نکال کر رکھ دی۔

"پلیز خاور اس قدر اداس اور ناامید مت ہو۔"

"کتنی آسانی سے آپ نے یہ جملے ادا کر دیئے۔" اس نے کرب سے آنکھیں موند لیں۔ گھر کے لان میں کرسیاں لگ چکی تھیں۔ آخری شام کی اداس کرنیں ان پر سے گزر رہی تھیں۔ یوسف خان آج بھی گھر سے غائب تھے۔ سیما تمام انتظام کرتی پھر رہی تھیں۔ لیکن گھر کے اندر کس قدر اداسی چھائی ہوئی تھی، ہما اپنا منہ چھپائے لیٹی تھی اور ندا اپنے کمرے کی کھڑکی کھولے اڑتے بادلوں کی آنکھ مچولی دیکھ رہی تھی۔ تمام زرق برق کپڑے اس کا منہ چڑا رہے تھے۔

"تم دونوں تیار ہو جاؤ مہمان آنے والے ہیں۔" سیما نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"مما میں تیار نہیں ہو سکتی آپ ان لوگوں کو منع کر دیں۔ مجھ سے آپی کی حالت نہیں دیکھی جاتی۔" ہما نے روتے روتے ندا کی طرف دیکھا جو اب بھی گم صم کھڑی تھی۔

"ہما بکواس مت کرو۔ وقار کی والدہ اور بہنیں آج تمہاری عیدی لے کر آرہی ہیں تم تیار ہو جاؤ اور اس کو بھی کہو کہ یہ بھی تیار ہو جائے احسن کے گھر والے بھی آرہے ہیں۔" سیما نے ندا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ خود کہہ دیں۔"

"اچھا تم نیچے جاؤ اور کچھ کام رہ گئے ہیں وہ کرلو۔"

"مما میں کچھ نہیں کر سکتی میرا ذہن کام نہیں کر رہا۔" عارف نے آکر بتایا کہ ہما کی کچھ سہیلیاں آئی ہیں تو اس کو نیچے جانا ہی پڑا۔

"ندا دیکھو ضد سے اور خاموش رہنے سے کچھ حاصل نہیں جو ہونا تھا وہ اب ہو چکا ہے۔ اب تم رو کر اس کو تسلیم کرو یا ہنس کر۔" سیما جانے کے لئے مڑیں تو کچھ خیال آگیا۔

"ہاں تم بھی تیار ہو کر آجاؤ۔" جواب میں خاموشی تھی۔ سیما نے غصے سے ندا کو دیکھا اور بہت تیزی سے چلی گئیں۔ مہمان آچکے تھے ہما اپنے سسرال والوں کے درمیان بیٹھی تھی۔ اس کی ہونے والی نند اس کے ہاتھوں میں مہندی لگا رہی تھی۔

"ارے ابھی تو پورے سات دن پڑے ہیں اور آپ تو ابھی سے۔" وقار کی بہن نے روتی ہوئی سیما کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"آنٹی مایوں کس دن ہوگا؟" ہما کی سہیلیوں میں سے کسی نے پوچھا۔

"پرسوں" مختصر سا جواب ملا۔

"اری تو تمہارے چہرے پر تو ابھی سے ابٹن نظر آرہا ہے۔" پھر کسی نے اسے چھیڑا تو اس کا بھیگا ہوا چہرہ اور زرد پڑ گیا۔ اس کے ہاتھوں میں کتنی دیر تک سہیلیاں نقش ونگار بناتی رہیں لیکن وہ اپنی نظروں میں ندا کو بسائے روتی رہی۔ آہٹ پر ندا نے سر اٹھا کر دیکھا تو سیما اسے غصے سے گھور رہی تھیں۔

"تم نے آج پھر یہ کالا لباس پہن لیا تم سمجھتی ہو کہ آج خوشی کے دن کوئی بدشگونی ہو جائے گی۔ نہیں کبھی نہیں انسان اپنے عمل سے سب کچھ کرتا ہے، مجھے دیکھو میں نے جو چاہا مجھے وہی ملا۔" سیما نے پلٹ کر پھر دیکھا لیکن ندا خاموش تھی۔

"تم آخر کچھ بولتی کیوں نہیں ہو؟ کیا تم اسی طرح خاموش رہ کر سب کچھ سہہ جاؤ گی ناممکن ناممکن۔" وہ خاموشی سے تنگ آ گئی تھی ان کا دل چاہ رہا تھا وہ کچھ بولے اچھا یا برا تا کہ ان کے اپنے بوجھ اور خلش میں کمی ہو۔ وہ احتجاج کرے لیکن وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی ان کا آخری وار سہہ جانے کے لئے خاموش تھی۔ سیما نے جھنجھلا کر پھر اسے مخاطب کیا۔

"جو کچھ نہیں کہتے وہ اپنا حق جانتے ہی نہیں ہیں تم کچھ کہہ سکتی ہو تم مجھ سے التجا کر سکتی ہو لیکن مجھے معلوم ہے تم ایسا نہیں کرو گی۔ میں سوتیلی ہوں۔ لوگ اپنوں سے احتجاج کرتے ہیں روتے ہیں اور اپنا حق مانگتے ہیں لیکن تم تم ایسا نہیں کر سکتی ہو۔" سیما شاید خود بھی ایسا نہیں چاہتی تھی۔

"مما پلیز یہ مت کہیں۔" اس کی خشک آنکھیں جل تھل ہو گئیں۔ سیما کو بہت شدید چکر آیا اور وہ مسہری پر گر پڑیں۔

"مما مما آپ کو کیا ہوا مما کچھ تو بولیں۔" وہ گھبرا کر ہما کو بتانے بھاگی۔ ندا نے انہیں سہارا دے کر اٹھایا ہما نے جلدی سے تھوڑا پانی پلایا تو ان کی طبیعت کچھ سنبھلی۔

"کیا ہوا تھا مما؟" ندا پریشانی سے بولی۔

"کچھ نہیں۔ بس تمہارے آنسو میرے جسم کے اس حصے کو بھگو گئے ہیں جو برسوں سے خشک تھا۔" انہوں نے ندا کو اپنے قریب کر لیا تو وہ اور بھی شدت سے رو پڑی۔

"مما میں آپ کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کہہ سکتی آپ کا جو جی چاہے کریں۔"

"ارے پگلی تیری خاموشی نے مجھے جیتے جی جہنم میں ڈال دیا ہے۔ تیرے پاپا بھی اسی وجہ سے رات سو

نہیں سکے کہ تم نے ایک لفظ بھی نہ کہا اور یہ زہر پینے کے لئے خاموشی سے اپنی محبت کا گلا گھونٹ دیا۔ یوسف کو اپنی بیٹی اور اپنے خون پہ ناز ہے اور میں تمہاری سوتیلی ماں ہو کر بھی۔" وہ انھیں

"میں پہلے ایک عورت ہوں بعد میں کچھ رشتوں کے القاب لگ گئے ہیں انہیں جس نام سے چاہو پکارو۔" ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو ہما نے ریسیور اٹھایا۔

"مما مسز حسین بات کر رہی ہیں۔" ندا کا چہرہ پھر سپاٹ ہو گیا۔ ہما کا سانس رک گیا۔

"ہیلو مسز یوسف خان۔"

"جی اس وقت آپ لوگ تشریف مت لائیں میں کل خود آ کر بات کروں گی۔" پھر سیما نے دوسرا نمبر ڈائل کیا۔

"زہرہ آپی جی میں آپ کو عید پہ سرپرائز دینا چاہتی ہوں۔"

"ارے سیما اب کیا رہ گیا ہے جو تم دینا اور لینا چاہ رہی ہو؟"

"نہیں آپا میں لینا چاہ رہی ہوں تمہارے خاور کو اپنی ندا کے لئے۔ اس نے خاموش رہ کر اپنی محبت جیت لی اور میں ہار گئی ہوں سچ سچ آپا میں ہار گئی۔ عورت بڑی کمزور ہوتی ہے۔ بس تھوڑی سی دیر کے لئے نفرتوں اور محبتوں کی بھول بھلیوں میں کھو گئی تھی۔" فون رکھ کر انہوں نے ندا کو پیار کیا۔

"تجھے خدا نے میری کوکھ سے کیوں نہ پیدا کیا؟" سیما نے محبت سے کہا تو ہما بھی ان کے پہلو میں آ گئی۔

"کل میں یہ کوٹھی چھوڑ دوں گی۔ میری ضرورت اس گھر میں بھی پوری ہو رہی تھی۔ ضروری تو نہیں کہ میں مسز حسین سے کیا ہوا وعدہ پورا کروں۔" ندا اس خوشی پر پاگلوں کی طرح ہما سے لپٹ کر رو رہی تھی اور ہما اس کے آنسو اپنے آنچل میں جذب کئے جا رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ سب ہما کے سسرال والوں کو رخصت کر کے دادی اماں کے گھر آ گئے۔

"پلیز آپی آپ اتنے آنسو تو نہ گرائیں کہ مہندی گیلی ہو جائے۔"

"رنگ اور پکا ہو جائے گا۔" مومی نے ہنس کر کہا۔ اس کی مخروطی انگلی میں ہیرے کی نازک سی انگوٹھی تانیہ نے پہناتے ہوئے کہا۔

"یہ بھیا آپ کے لئے عید کا تحفہ لائے ہیں۔"

"شکر ہے کہ وہ جاپانی بکرا نہیں لائے ورنہ امریکن قصاب ڈھونڈنا پڑتا۔" نعیم بھائی کمرے میں آتے ہوئے بولے۔

''لیکن خیر وہ خود کیا کسی سے کم ہیں۔'' نعیم کی بات پر سب ہی ہنس پڑے۔

''شکر ہے آج تو آپی بھی ہنسیں۔''

''آپ اب فکر نہ کریں یہ یونہی ہنستی رہیں گی۔'' نعیم بھائی نے ہما سے کہا۔

''خدا کرے۔'' دادی جان کو فوراً ہی کچھ یاد آ گیا انہوں نے تسبیح کے دانے گھماتے گھماتے کہا۔

''آج تو یہ کالے کپڑے اتار ڈال بدشگونی ہوتی ہے۔''

''نہیں دادی جان آج تو سب سے لکی ڈے ہے اور یہ مائی لکی ڈریس۔'' اس نے ہما کی طرف دیکھ کر کہا اور ہما بھی مسکرا دی۔

''جلدی آنا اس طرف۔'' نعیم بھائی نے ٹیرس کی طرف آتے ہوئے کہا تو سب بھاگے چلے آئے۔

''ارے ندا تم بھی تو آؤ۔ دیکھو چاند کتنا بڑا ہے بلکہ یہ پورا ہو گیا۔''

''ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔''

''اچھا تو تم خود دیکھ لو۔'' اس نے اپنے دانتوں سے دوپٹے کو ٹھیک کیا اور ہاتھوں کو بچاتے ہوئے سامنے دیکھا۔

''وہاں نہیں ادھر۔'' نعیم بھائی نے نیچے کی طرف اشارہ کیا اس کی نظر سامنے خاور پر پڑی تو وہ اوپر ہی کی طرف دیکھ رہے تھے اور ساتھ ہی سومی کھڑی مسکرا رہی تھی۔

''اس ڈراما پیپ سین کے پروڈیوسر تھے نعیم توصیف تمہارے فرسٹ کزن۔'' یہ کہتے ہوئے جلدی سے چلے گئے۔ وہ کچھ دیر تو چاند کو کالے بادلوں سے آنکھ مچولی کرتے دیکھتی رہی اور پھر جب جانے کے لیے مڑی تو خاور نے مسکرا کر اس کا راستہ روک لیا اور اس کے مہندی بھرے ہاتھوں کو تھام کر بولے۔

''عید کا تحفہ پسند آیا؟''

''میری مہندی۔'' اس نے اپنے ہاتھوں کو ان کی گرفت سے آزاد کرانا چاہا۔

''مہندی کا بہت خیال ہے اور میں کچھ بھی نہیں۔'' تب ہی ندا نے مسکرا کر اپنے دونوں ہاتھ سامنے کر دیئے جس پر سومی نے مہندی سے لکھا تھا۔

''مہندی کے سب رنگ تیرے سجنا'' ابھی خاور اس ذہانت اور آرٹ کے شاہکار سے جی بھر کے لطف بھی نہ لینے پائے تھے کہ ندا جھپاک سے اندر چلی گئی اور پھر وہ خود بھی خوشبو کے تعاقب میں اس کے پیچھے پیچھے چلے آئے۔